

نیا آدم
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے
مخدوم

اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

ہفتہ وار

نیا آدم

حیدرآباد

(مخدوم نمبر)

مرتبہ: کے۔ ایل چندرا
احسن علی مرزا
امجد باقی

جلد ۹
ماہ جنوری
سنہ ۱۹۷۰ء
قیمت دو روپے

سر ورق: سعید بن محمد
کتابت: محمد مظہر

خط و کتابت کا پتہ:۔ ہفتہ وار "نیا آدم" معرفت کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا حیدرآباد سٹی کونسل حمایت نگر۔ حیدرآباد ۲۹

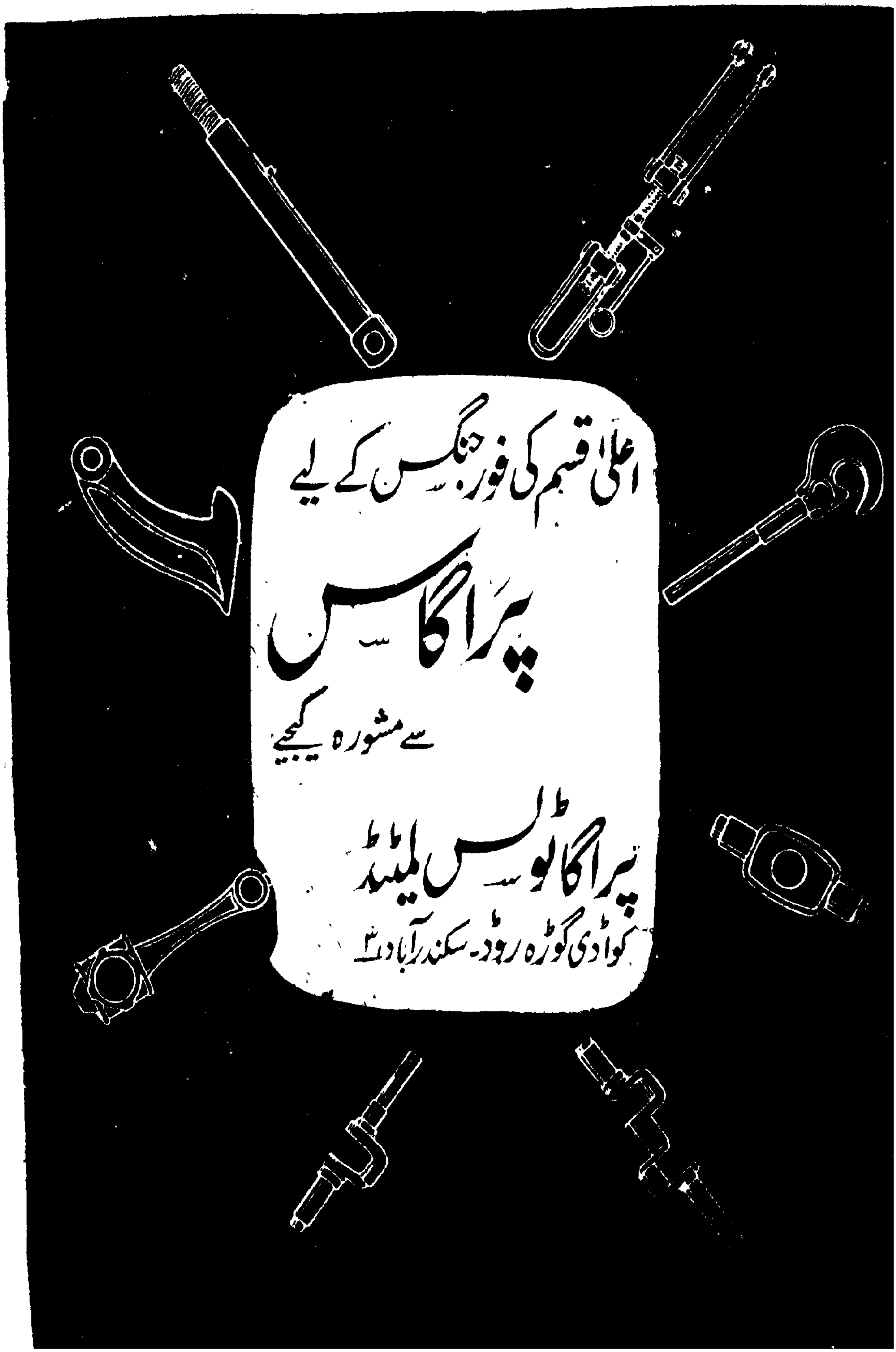
ایڈیٹر: امجد باقی۔ پرنٹر پبلشر، سراج صوفی۔ ۸۰/۲-۲۲ حمایت نگر حیدرآباد۔
مطبوعہ:۔ صحیفہ مشین پریس چادر گھاٹ۔ دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد
تصاویر آفسٹ۔ کمل پرنٹرز مشیر آباد

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (آندھرا پردیش کونسل) کی تعزیتی قرارداد

کامریڈ مخدوم ریاست کے صف اول کے کمیونسٹ قائد اور محنت کش طبقات کے عظیم رہنما تھے۔ نظام کی مطلق العنان حکومت کے خلاف جدوجہد اور محنت کش طبقات کی تنظیم کے ذریعہ انھوں نے عوام کے دلوں میں اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔ مخدوم بے پناہ خوبیوں کے مالک اور اردو کے انقلابی سیاسی شاعر تھے۔ کمیونسٹ پارٹی اپنے ایک جری کارکن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل رہنے کا عہد کرتی ہے جس کے لیے مخدوم نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور اسی جدوجہد کے دوران وفات پائی

افسردہ ستاروں کا ہجوم

صفِ ماتم



اعلیٰ قسم کی فورجنگس کے لیے
پراگاس
سے مشورہ کیجیے
پراگاٹولس لمیٹڈ
کواڈی گوڑہ روڈ۔ سکندرآباد ۳

ہمارا محبوب مخدوم ۔ اسی راجیشور راؤ جنرل سکریٹری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا

ہمارا محبوب مخدوم ہمیں چھوڑ کر چلا گیا لیکن اس کی خوشگوار یادیں ہمارے ذہن میں اب ہیں۔ اس نے ہم سبھوں پر اپنا گہرا اثر چھوڑا تھا۔ یہ اثر ہمیشہ باقی رہے گا۔ مخدوم ایک کمیونسٹ انقلابی تھا۔ وہ محنت طبقات کا ایک باعمل لیڈر تھا، وہ ایک مشہور شاعر اور دانشور تھا۔ اس کی شخصیت بہت سی اچھی باتوں کے خوشگ کی نمائندگی کرتی تھی۔ کسی فرد میں اتنی ساری خصوصیات بالعموم پائی نہیں جاتیں۔ مجھے مخدوم کو خراج عقید کرنے کے لیے موزوں اور شایانِ شان الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

۱۹۴۰ء میں جب میں حیدرآباد میں روپوش رہ کر کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم میں مشغول تھا میں نے پہلی بار مخدوم کا نام اس وقت تک وہ کامریڈ سجاد ظہیر اور ان ہی کی سطح کے بعض کل ہند قائدین کے توسط سے کمیونسٹ تحریک وابستہ ہو چکا تھا۔ کامریڈ راج بہادر گوڑ اور کامریڈ ایسوسی ایشن کے دیگر دوستوں کے ساتھ وہ ان دنوں کم کے پرچار میں لگا ہوا تھا۔

۱۹۴۲ء میں مجھے پہلی مرتبہ مخدوم سے ملاقات کا موقع ملا۔ اور میں نے اس کی انقلابی نظمیں بھی سنیں۔ ا اور خاص طور پر "حویلی" نے مجھے بے حد متاثر کیا جس میں اس نے گرتے ڈھلتے جاگیردارانہ سماج پر گہرا طنز کیا ہے۔

مخدوم پہلی ہی ملاقات میں میرے لیے قابلِ احترام شخصیت بن گیا۔ اس وقت سے مخدوم کی وفات میں اپنے ایک رفیق کی حیثیت سے اس سے محبت کرتا رہا۔ اپنے ایک بزرگ ہونے کے ناتے میں نے اس کی عزت کی۔ اس سے اپنی دیرینہ دوستی کے دوران کوئی ایسا موقع نہیں آیا جب کہ ہم دونوں میں لڑائی ہو۔ حالا مسائل پر اس سے مجھے شدید اختلاف رائے بھی ہوا ہے۔

ایک کمیونسٹ اور ایک مخلص انسان کی حیثیت سے اس نے جس قسم کی زندگی گزاری اس سے دوسرے بہت کچھ ہیں۔ وہ ایک انقلابی مفکر اور ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عوام کا ایک لیڈر بھی تھا۔ اس نے محنت کشوں کی لڑائیوں کی رہنمائی کی اور ان کی کتنی ہی ٹریڈ یونینیں بنائیں۔ اصولوں پر مفاہمت اس نے کسی وقت بھی قبول نہیں کی۔ مسائل کو حل کرنے کے طریقۂ کار کے تعلق سے اس کا نقطۂ نظر کافی لچکدار تھا۔ اس نے بے حد شائستہ لیکن سادہ زندگی گز وہ چاہتا تو کافی املاک و جائیداد پیدا کر لیتا لیکن یہ بات اسے پسند نہ آئی۔ وہ تصنع اور بناوٹ سے نفرت کرتا تھا لیکن کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی پیش نظر رکھتا کہ دوسروں کے جذبات مجروح نہ ہوں۔ اس کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہ آئیے کہ ہم سب انسانی بھلائیوں کے اس سرچشمہ کی خوشگوار یاد کو خراج عقیدت پیش کریں۔

مخدوم — ایک انقلابی شاعر اور ایک عظیم ٹریڈ یونین لیڈر

آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کی عاملہ نے کامریڈ مخدوم کے انتقال پر ۲۶ اگست کو ٹریڈ یونین لیڈر کی حیثیت سے ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں حسب ذیل بیان جاری کیا

" انقلابی شاعر، عظیم محب وطن نظام کی مطلق العنانی کے خلاف عوام کی جدوجہد کے جلیل القدر رہنما اور آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے سرکردہ لیڈر کامریڈ مخدوم محی الدین اب ہم میں نہیں رہے ہیں۔ وہ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے نائب صدر اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی نیشنل کونسل کے رکن تھے۔ کامریڈ مخدوم کی اچانک موت سے ملک کے طول و عرض میں غم و اندوہ کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہے۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس عوام کے اس غم میں برابر کی شریک ہے۔ ان کی رحلت سے صرف محنت کش طبقات ہی نہیں بلکہ ملک کے دانشور بھی ایک ایسی صائب الرائے شخصیت سے محروم ہو گئے۔ جو ترقی پسند رجحانات کے پرچار کے لیے زندگی بھر مصروف عمل رہی۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے محنت کش طبقہ سے تعلق رکھنے والے اس عظیم سپوت کو خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔ وہ مرحوم کے افراد خاندان، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی نیشنل کونسل اور آندھرا پردیش کے مزدور و محنت کش طبقات سے اظہار ہمدردی کرتی ہے جن کے لیے مخدوم کا بے وقت انتقال بلاشبہ بہت بڑا صدمہ ہے۔"

"مخدوم محی الدین کا ۲۵ اگست کو قلب پر شدید حملہ کے نتیجہ میں دہلی کے اروِن ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کی عاملہ اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی نیشنل کونسل کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے دہلی آئے تھے۔"

پیامات

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی (بتوسط پرسنل سکریٹری)

نئی دہلی۔ ۱۶ راکتوبر۔

وزیر اعظم نے "نیا آدم" کے مخدوم نمبر کے لیے پیام ارسال کرنے کے سلسلہ میں آپ کے روانہ کردہ مکتوب کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مخدوم صاحب کی یاد میں آپ جو نمبر نکال رہے ہیں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کہا ہے کہ وہ اس کے شایانِ شان ہونے کی متمنی ہیں۔

دستخط

ایچ وی شاردا پرشاد

مسٹر فخر الدین علی احمد مرکزی وزیر صنعتی ترقی

نئی دہلی۔ ۸ راکتوبر۔

مجھے مسرت ہے کہ جناب مخدوم کی یاد میں نیا آدم کا "یادگار نمبر" نکالا جا رہا ہے۔ مخدوم صاحب منفرد شاعر تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے اپنی پسندیدہ اقدار کے تحفظ کے لیے زندگی بھر سخت اور صبر آزما جد وجہد کی۔ ان کے سیاسی عقیدہ، اور اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے تعلق سے ان کے طریقہ کار سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن ان کی بے باکی، خلوص، رحمدلی، شرافت اور شاعرانہ ذہانت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کی وفات سے صرف اردو ادب ہی کو نہیں بلکہ سارے ملک کو شدید نقصان ہوا ہے۔

دستخط

فخر الدین علی احمد

گورنر آندھرا پردیش مسٹر کھنڈو بھائی دیسائی

گورنر آندھرا پردیش مسٹر کھنڈو بھائی دیسائی مخدوم صاحب کے بڑے صاحبزادے مسٹر نصرت محی الدین کے نام اپنے پیام تعزیت میں تحریر کرتے ہیں "مجھے آپ کے والد محترم جناب مخدوم محی الدین صاحب کے دہلی میں اچانک رحلت کر جانے کی خبر سن کر سخت افسوس ہوا۔ وہ آندھرا پردیش کے ایک بہت مشہور ٹریڈ یونین لیڈر تھے

انھوں نے مزدوروں کی بھلائی کے بہت سے کام کیے ہیں۔ ان کی وفات سے ہندوستان اردو کے ایک شہرہ آفاق شاعر سے محروم ہوگیا ہے۔ میں آپ کے اور آپ کے دیگر افراد خاندان کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔

مسٹر جی ایم صادق چیف منسٹر کشمیر

سری نگر، ۲۴ ستمبر:

ڈیر راج بہادر جی۔ مجھے آپ کے ۱۴ ستمبر کے مکتوب سے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ نیا آدم ہفتہ وار جناب مخدوم کی یاد میں ایک خصوصی نمبر نکال رہا ہے۔ میں اس کے لیے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں۔ دستخط

جی۔ ایم۔ صادق

مسٹر جے وی نرسنگ راؤ ڈپٹی چیف منسٹر آندھرا پردیش

حیدرآباد:۔ ۲۷ اکتوبر:

مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ نیا آدام کا مخدوم نمبر شائع کیا جارہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شمارہ عوام کو مخدوم کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقف کردے گا۔ مخدوم بلا شبہ ایک شاعر تھے۔ اپنے ایک قابل احترام دوست کی حیثیت سے وہ مجھے بے حد عزیز تھے۔ دستخط

جے وی نرسنگ راؤ

پرنس اعظم جاہ

پرنس اعظم جاہ نے بیگم مخدوم کے نام اپنے تعزیتی پیام میں لکھا ہے کہ وہ آپ کے شوہر کے انتقال کی خبر سے مجھے بے حد صدمہ پہنچا۔ خدا آپ کو اس غم کے برداشت کرنے کی طاقت عطا کرے۔ آپ کے اور مرحوم کے دیگر افراد خاندان سے مجھے پوری ہمدردی ہے۔ خداوند قدوس مرحوم کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

تعزیتی مکاتیب

مرزا ظفر الحسن

کراچی ۲۸ راگست ۶۹ء

میر حسن! کیا غضب ہو گیا۔ مخدوم ہمیں سوگوار کر گیا، اکیلا چھوڑ گیا۔ حیدرآباد اجڑ گیا اور اس دفعہ تو ایسا اجڑا کہ اب نہیں بس سکتا۔

۱۹۶۶ء میں بھی ایسی ہی خبر آئی تھی جس کی تردید اسی دن ہو گئی کاش اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوتا۔ اس تمام قرب کے باوجود جو مخدوم سے تھا ہم لوگوں سے جو ہم اتنی دور رہ کر اس غم کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو تم پر ٹوٹا ہے۔ اسا زری نصرت اور ظفر محی الدین پر ٹوٹا، مخدوم کی بیوی پر ٹوٹا۔ جب سے یہ خبر سنی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کس طرح دھاڑیں مار مار کر رو رہے ہو، اشفاق دیوانہ ہو گیا ہے، عابد اور جگر رو رہے ہیں۔ شہریار، شنکر، جیونت، حسینی شاہد، لاہوتی ــ کس کس کے نام لکھوں پورا دکن ماتم کر رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ زینت ساجدہ کی نظر لگ گئی اور مخدوم کی عمر کا پہیہ جو الٹا گھوم رہا تھا پل بھر کے لیے سیدھا گھوم کر اور اچانک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رک گیا۔ میں جانتا ہوں زینت ساجدہ اور دوسری دختران دکن پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی۔ سب سناٹے میں آ گئے، **بات کہنا چاہتے ہیں** منہ سے بات نہیں نکلتی۔

صمد رضوی سانز آیا تھا، شوکت آیا تھا، علی احمد نے **فون کیا تھا**، سبط حسن بات بھی نہ کر سکا، جلیس گم سا ہے۔ میرا آٹھ سالہ لڑکا کاشف کہہ رہا تھا "مخدوم چاچا کا گانا **اک** چنبیلی کے منڈوے تلے" کتنا پیارا لگتا ہے۔

اخباروں کو تصویریں دی ہیں۔ روزنامہ جنگ کے لیے میں نے ایک مضمون "شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی" مخدوم لکھا اور اس کے ساتھ چند تصویریں اشاعت کے لیے دی ہیں۔ روزنامہ مشرق کے لوگوں نے بھی مضمون مانگا تھا۔ ایک انھیں بھی دیا ہے۔ یادوں کے چراغ اس کے لیے بھی تصویریں تیار کروائی ہیں۔ روزنامہ حریت کو "صبا" کا مخدوم نمبر بھیجا ہے کچھ تصویریں دی ہیں اس میں بھی مضمون شائع ہوگا۔ یہ سب شائع ہونے کے بعد تمھیں بھیجوں گا ـــــ اس لیے نہیں کہ یہ بتاؤں کہ یہاں کیا ہوا بلکہ یہاں کا ریکارڈ وہاں بھی محفوظ ہو جائے۔ مخدوم ان تمام باتوں سے بلند و بالا تھا۔ نہ اسے حاجت تھی اور نہ پرواہ۔

کل ابنِ انشا، فیض اور دوسرے ادیبوں کی جانب سے تعزیت کا ایک تار عابد کو دیا تھا جو اب تک مل چکا ہوگا جی چاہتا ہے اور لکھوں مگر قلم رک جاتا ہے آنسو بھر آتے ہیں۔ میر حسن میں بہت بے کیف ہو گیا ہوں، اپنی بے چینی کس طرح بیان کروں۔

اشفاق کو سنبھالو، خود ضبط کرو۔ اب تو یہ عمر بھر کا غم ہے۔ مگر شکر ہے کہ ہماری عمریں زیادہ ہیں اس لیے غم کے دن بھی تھوڑے ہی رہ گئے ہیں روتے ہوئے گزار دیں گے۔

مرزا ظفر الحسن

کراچی ۱۲ ستمبر ۶۹ء

محترمین! مخدوم کے انتقال کے بارے میں تمہارے خط سے بہت کچھ تفصیل معلوم ہوگئی مگر جی چاہتا ہے کہ مخدوم ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ مخدوم ہی کے متعلق پڑھتا اور سنتا رہوں۔ یہاں مخدوم سے متعلق جو بھی لکھا گیا ہے اور آئندہ لکھا جائے گا میں پابندی کے ساتھ جمع کرتا رہوں گا۔ کراچی کی سات ادبی انجمنوں کی جانب سے ایک مشترکہ تعزیتی جلسہ فیض کی صدارت میں کرایا گیا۔ یہ جلسہ میں نے ہی کنڈکٹ کیا مگر بڑی مشکل سے۔ بار بار آنسو نکل رہے تھے اور میں شہ نشین چھوڑ کر دور جانے اور وہاں جی بھر کر رونے کے بعد واپس آنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ کوئی چھ سات سو ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع تھا۔ میں نے ہی کیا آج تک کسی نے کراچی میں اتنا بڑا تعزیتی جلسہ نہیں دیکھا۔ مخدوم کی غزل "چپ ہے" عزیز کارٹونسٹ سے سنوائی۔ تحسین سروری نے روتے ہوئے ایک نظم سنائی۔ سبطے نے کہا مخدوم کی موت میرا ذاتی غم ہے جس میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتا۔ فیض نے کہا میرے خاندان کا ایک فرد دوامی طور پر بچھڑ گیا۔ احمد علی علوی نے کہا کہ ہندوستان میں مسٹر نہرو کے بعد سب سے محبوب شخصیت مخدوم کی تھی۔ مخدوم نے اس سال فروری میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر دلی میں جو نظم غالب پر سنائی تھی اس کا ٹیپ مخدوم ہی کی آواز میں سنوایا گیا۔ چھ سات سو حاضرین نے دو منٹ تک کھڑے ہو کر خاموش تعزیت کی۔ بلکہ مسجد حیدرآباد کالونی میں عصر کی نماز کے وقت ختم قرآن کرایا گیا اور شیرینی تقسیم کرائی گئی۔

مخدوم نے اپنے ایک خط میں مجھے اجازت دی ہے کہ میں اس کا کلام شائع کرا سکتا ہوں۔ محبان مخدوم نے "مخدوم" نام کی ایک کتاب جس میں اس کا سارا کلام بھی شامل ہوگا اعلیٰ ترین کتابت اور طباعت کے ساتھ جلد شائع کرانے کا تصفیہ کیا ہے۔ چند احباب سو سو اور چند پچیس پچیس روپے دے کر اس کتاب کا سارا خرچ برداشت کریں گے۔ اب تک کوئی ڈیڑھ ہزار روپے کے وعدے ہو چکے ہیں اور یہ سب ایسے احباب اور محبان مخدوم ہیں جو فوراً رقم دے دیں گے۔ کتابت کا کام عنقریب شروع ہونے والا ہے۔

تمہاری حد تک مجھے اطمینان ہے کہ تم میں ضبط کا مادہ ہے۔ تم پر بھی غم کا بہت بڑا پہاڑ ٹوٹا ہے مگر تم صبر کر سکتے ہو۔
میں نے اپنی کتاب کا نام "یادوں کے چراغ" رکھا تھا کہ کتاب شائع ہونے کے دو تین ماہ بعد حیدرآباد آؤں اور تم لوگوں کو پیار کروں، تمہاری گالیاں سنوں۔ ہائے ایک کم ہوگیا اور وہ بھی مخدوم۔ اب حیدرآباد آکر کیا کروں ——
مخدوم کے انتقال کی خبر یہاں کے اخباروں میں شائع ہوئی تو میری کتاب کے کاتب نے آکر مجھے پرسہ دیا۔ کتاب میں جگہ جگہ مخدوم کا ذکر ہے اس لیے کاتب سمجھ گیا کہ یہ دونوں مخدوم ایک ہی ہیں۔
میں نے ابھی تک مخدوم کی بیوی، اسادری، نصرت اور ظفر کو تعزیت کے خط نہیں لکھے۔ جب بھی لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں ہاتھ کانپ اٹھتا ہے کس طرح لکھوں۔ مخدوم کی وجہ سے سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں کو فائدہ پہنچا۔ اس نے سب کی خدمت کی اور اب ان سب کا فرض ہے کہ وہ اس کے بیوی بچوں کا خیال رکھیں۔ یہاں کے احباب بہت دور ہیں اور مجبور بھی ہیں اس کے باوجود لکھو اور بتاؤ کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔

محبّی لوڑھا صاحب تسلیم

مخدوم کے مرنے نے بڑا خلا پیدا کر دیا۔ اور اچانک موت نے مبہوت کر دیا۔ یہاں ہم لوگوں نے کئی چھوٹے بڑے جلسے کیے۔

میری صحت آج کل خاصی خراب ہے، کچھ لکھ پڑھ نہیں رہا ہوں، جو کام بالکل لازمی اور ادھورے ہیں وہ بھی پورے نہیں ہو رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے لیکن اس وقت کچھ نہیں لکھ سکتا۔ مخدوم پر کوئی کتاب ضرور مرتب ہونی چاہیے۔

آپ کا احتشام حسین

اختر حسن

۲۶ ستمبر ۱۹۶۹ء

کیا لکھوں راج؟ شاید کچھ نہیں لکھ سکوں گا۔ مخدوم بہت پیارے ساتھی تھے۔ وقت سے پہلے بچھڑ گئے اور حیدر آباد کو اکیلا چھوڑ گئے۔ رونے دھونے کا تو میں قائل نہیں لیکن غم مجھے بہت عزیز ہے اور مخدوم کا غم تو عزیز بھی ہے اور قیمتی بھی۔ کئی وقت قلم اٹھایا لیکن چند الفاظ سے آگے نہ چل سکا۔ شاید کچھ یہ بات بھی ہو کہ ابھی غم کے طوفان میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا اور پھر ادھر میری بے معنی سی الجھنیں بھی بہت بڑھ گئی ہیں طبیعت ٹھیک نہیں رہتی جی چاہتا ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر حیدر آباد کا رخ کروں لیکن حیدر آباد کتنا سونا سونا سا ہوگا مخدوم کے بغیر۔ پھر کہاں جاؤں، کیا کروں، اسی ادھیڑ بن میں رہتا ہوں۔ کب سے ہنسی نہیں آئی کب سے کھل کر کسی سے دل کی بات نہیں کی ——— آپ سمجھ سکتے ہیں، میری تنہائی اور جگر سوزی کا عالم لیکن اس عالم بے رنگ و بو میں بھی مایوس نہیں ہوں۔ دل میں نظر آتی ہے اک بوند لہو کی! کاش لہو کی یہ بوند جلد سے جلد سیل بہار بن جائے۔ گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے ——

ہاں مخدوم تم چلے گئے شاید تاب انتظار نہ لائے اور ہم بھی شاید یوں ہی چشم براہ ایک روز آنکھ بند کر لیں گے اور تمھارے پاس آ جائیں گے ——— لیکن اس سے پہلے تمھاری یادوں کو محفوظ کر دوں کا ندیز یہ تمنا ضرور ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان کی ہر تمنا پوری ہو جائے۔

تمھارا
اختر حسن

اشفاق حسین

وجے واڑہ

برادرم راج۔ میرے صدمہ کا اندازہ کرو کہ باوجود تقاضوں کے میں اس کی زندگی میں کچھ نہیں لکھ سکا اور اب جب کہ وہ ہم سے رخصت ہو چکا ہے تو لکھنے پر مجبور ہوں۔ اس عزیز کی کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ اب تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ:

بے صحبتِ رخسار اندھیرا ہی اندھیرا

۱۸ ستمبر ۶۹ء

پیارے اشفاق! ۲ ستمبر ۶۹ء۔ اورنگ آباد

۲۰ دن ہوئے دمہ سے علیل اور پریشان ہوں۔ مخدوم کی موت نے کمر توڑ دی۔ کسے خبر تھی کہ ۳۵ برس کی دوستی یوں اچانک ختم ہو جائے گی:

گریۂ آتشیں کی داد شبِ غم نہ دے تو کون دے
خود سرِ شام کیا بجھی شمع نے دل بجھا دیا

تمھارا۔ سکندر علی وجد

محترم کامریڈ راج ۲۳ اکتوبر ۶۹ء

مخدوم کی یاد کسی روز پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی چشمِ نگراں زندگی کا حوصلہ بڑھانے کے لیے روز ہی شفقت اور پیار کے پھول برساتی رہتی ہے۔ اب یہ احساس شدید تر ہو گیا ہے کہ مخدوم رگِ جاں سے کس قدر قریب ہیں۔ میں اپنے اس احساس کے بارے میں یہ کیسے یقین دلاؤں کہ اس میں کہیں بھی کوئی مبالغہ نہیں؟ کیا آپ کا احساس بھی یہی نہیں؟ کوئی تو یقین کرے!

میرے لیے کئی دن تک مخدوم کے بارے میں کسی کو بھی کہ آپ کو بھی، ایک لکھنا مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی طبیعت کی ناسازی کی خبر پر وحشت زدہ ہو جانے کے بعد میں نے بیدی کو، حیدر کو اور دوسروں کو پیغام لکھوائے لیکن خود نہ لکھ سکا۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مخدوم کی یاد غم و الم کی مرہم لے کر محترم درد لے کر زندگی کا حوصلہ بنتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کم از کم میں مخدوم کا ذکر روز اس طرح کرنے لگا ہوں جیسے وہ ساتھ ہیں — اور میں ان تمام باتوں کو محض جذباتی نہیں پاتا۔ آپ مجھے یاد کیا کیجیے۔ زندگی کا حوصلہ بہت کچھ آپ نے دیا ہے۔ آپ ہی اس کی لو بڑھانے میں میری مدد کیجیے۔

آپ کا اپنا۔ احمد معظم

شبِ غزل۔ کھار۔ بمبئی ۵۲ ۳۰ اگست ۶۹ء

محترم اڈیٹر صاحب

مخدوم صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ خبر پر یقین نہ آیا۔ بار بار پوچھا۔ اخبار منگوا کر کئی بار پڑھا۔ یقین کی گنجائش ہی نہ تھی لیکن قدرت کی مرضی! بہرحال اس ناگہانی حادثہ پر یقین کرنا ہی پڑا۔ مگر کس قدر ناقابلِ یقین خبر ہے یہ۔ یہ گمان تک نہ تھا کہ ایسی قیامت اچانک آئے گی۔ خط میں کیسے اظہار کروں؟ میرا صدمہ تو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اللہ مرحوم کی روح کو سکون عطا کرے۔

سوگوار
شکیلہ بانو

مخدوم — ایک اندازِ فکر

"نیا آدم" کا "مخدوم نمبر" پیشِ خدمت ہے۔ اس کی ترتیب و تیاری میں ضرورت سے زیادہ تاخیر ضرور ہوئی لیکن "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا"۔ نیا آدم کے حلقۂ ادارت سے "مخدوم" بھی وابستہ تھے، اور اسی لیے نیا آدم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ "مخدوم نمبر" کو ایک "ادبی دستاویز" کی صورت دے۔ چنانچہ اس کے لیے ہم نے ان سبھوں کی نگارشات حاصل کی ہیں جنھیں مخدوم کی رفاقت کا اعزاز حاصل رہا۔ پاکستان سے مخدوم کے پاکستانی دوستوں نے بھی نیا آدم کے لیے لکھا۔ لندن میں قیام پذیر جناب حیدر حسین صاحب نے بھی ہماری درخواست پر ایک مضمون روانہ کیا اور یہ سب مضامین "مخدوم نمبر" میں شامل ہیں۔ مخدوم کے تعلق سے ہمارا ایقان تو یہ ہے کہ اس کی زندگی کو مختلف خانوں میں بانٹ کر اس کا جائزہ لینا اور مخدوم کی شخصیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا درست نہیں۔ مخدوم — دراصل ایک اندازِ فکر کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہی اندازِ فکر ان کی سیاسی زندگی میں جھلکتا رہا۔ اور اسی اندازِ فکر نے ان کی شاعری کو ایک نیا لب و لہجہ عطا کیا۔ مخدوم کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مخدوم کے اسی اندازِ فکر کے تانے بانے میں اس کے کیے دھرے کا جائزہ لیا جائے ہمیں اپنے ان دوستوں سے کوئی شکایت تو نہیں جو مخدوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اس کے پسندیدہ اندازِ فکر کی مخالفت اور مذمت ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن جو لوگ مخدوم کو کانٹ چھانٹ کر خانوں میں بانٹ کر ایسی باتیں کہتے ہیں جن سے مخدوم کا امیج بگڑ جاتا ہے تو یہ بات ان لوگوں کو کیسے برداشت ہوگی جو صرف مخدوم سے محبت ہی نہیں ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ مخدوم صرف شاعر ہی نہیں تھے وہ آخری سانسوں تک ایک انقلابی تحریک سے وابستہ رہے۔ اگر کوئی نقاد مخدوم کے اس کُل کو نظر انداز کر کے کسی ایک جزو کا تجزیہ کرنا چاہے تو یہ مخدوم سے ناانصافی اور ادبی تنقید سے بددیانتی ہوگی۔

ترقی پسندوں کی تحریک سے وابستہ ہمارے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے ۱۹۴۷ء کے دوران جو غلطیاں کی تھیں انھیں نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جائے کہ اسی ادبی تحریک نے ہمیں مخدوم فیض اور سردار جعفری جیسے شاعر عطا کیے ہیں۔ اسی کی اثر آفرینی نے منشی پریم چند کو اس سے وابستہ کر دیا اور عبدالماجد دریا بادی جیسے علامہ کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے مقصد سے انھیں کوئی اختلاف نہیں یہی نہیں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت، شاہد لطیف اور رام تا پریتم بھی اسی ادبی تحریک کی دین ہیں — مخدوم نے

اسی ادبی تحریک تو اس لیے "واسطاتِ واجبات" کے ساتھ اپنا یا تھا۔ اگر اس کے کلام کا خالصتاً جدا باقی امرانی نقطۂ نظر سے تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو یقیناً یہ بات مخدوم کے ساتھ ناانصافی کرنے کے مترادف ہوگی۔ مخدوم سارے ہندوستان میں ایک ترقی پسند ادیب اور کمیونسٹ لیڈر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ان کی شعوری زندگی کے ابتدائی دور میں جب کہ پرانی اقدار کا طلسم ٹوٹ رہا تھا اور نئی ادبی قدروں نے جنم نہیں لیا تھا انھوں نے کسی مجاز کی طرح شب بیداری اور اختر شماری کی مشق کی ہے۔ آسمان سے تارے توڑ لینے کی روایت کا تذکرہ ان کی شاعری میں بھی مل جائے گا۔ داخلی کرب اور مایوسی کے اس ماحول میں بیک گونہ بےخودی کی رسم شاعرانہ کو مخدوم نے بھی اپنا یا ہو تو کیا لیکن کیا ان لوگوں کو جو صرف اسی دور کے علاوہ دور تک ہی مخدوم کو جانتے ہیں۔ یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ مخدوم نے "مسلک و پرورش" اور "جام خفتہ ہوئے" رہے۔ شعر کیا انتقاد کے اگلے مراحل پر مخدوم کیا سے کیا بن گئے تھے — آپ اسے کیسے اور کس طرح بھلا سکتے ہیں۔ . . . سال کی تو لوچہ کہ . . . یہ انھوں نے جاولی کی گرانی کے خلاف بھوک ہڑتال کی — لاتعداد مطالبہ والی کمیٹیوں میں شامل رہے — اسمبلی میں برسراقتدار جماعت کے خود سر فاسدین کی بدعنوانیوں کا پول کھولا — مجاہدانہ شان سے ہر ناانصافی سے ٹکر لیتے رہے — مخدوم کا لہجہ ان ہی معرکوں سے بنتا ہے۔ اسی مسلسل اور پیہم جد و جہد کی جھلک سویرے سے بار بار نفس ناس کے ہر مجموعۂ کلام کی روح ہے — اپنی نجی اور گھریلو زندگی میں بھی وہ ایک ایسے انسان کی نمائندگی کرتے رہے جو اپنی سماجی ذمہ داری کو ایک لمحہ کے لیے فراموش نہیں کرتا۔ مخدوم اسمبلی کے رکن تھے۔ اس اعتبار سے ان کی برسراقتدار جماعت کے ذی اثر نمائندوں سے کافی جان پہچان تھی لیکن ان کے قریبی دوستوں کو بھی اس بات کی شکایت رہی کہ وہ سعی و سفارش کے بارے میں کافی محتاط تھے یہاں تک کہ اپنے لڑکے کی ملازمت کے لیے انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ بات آسان تھی لیکن نہیں تو اپنے لیے ہی ایک اچھا سا مکان الاٹ کرا لیتے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ انھوں نے یہ احسان بھی گوارا نہ کیا۔ صبح کی ابتدائی ساعتوں میں ان سے ملاقات کے لیے جانے والے کئی لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ ایم ایل اے کوارٹر کے مختصر سے مکان میں ایک بید کی کرسی پر بیٹھے ہوئے مخدوم کس طرح اپنی نواسیوں کے جھرمٹ میں گھرے ان کی طفلانہ باتوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

مخدوم کے مختلف کرم فرماؤں سے کہیں زیادہ بلند وہ بچے ہیں جو کنگ کوٹھی کے احاطہ میں چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں۔ مخدوم کی جان لیوا بیماری کی خبر سن کر انھوں نے جانمازیں بچھالیں اور باجماعت دعا کرنے لگے کہ یا رب "گورے نانا" کو شفایاب کر دے۔

آخر ان معصوم بچوں کے سامنے بھی تو مخدوم کی کوئی تصویر تھی اور یہ تصویر نتیجہ تھی اس ہمہ گیر تحریک اور ان انقلابی سرگرمیوں کا جنھوں نے مخدوم کی شخصیت کو نراش کر نکھار کر ایک سرچشمۂ وجدان کی شکل دے دی تھی۔

بحث یہ نہیں کہ مخدوم انسان تھے یا فرشتہ۔ مخدوم سو فیصد انسان تھے۔ انسان اپنے ماحول سے رنگ حاصل بھی کرتا ہے اور اپنی کاوشوں سے ماحول میں رنگ بھرتا بھی ہے۔ اس سماجی کاوش میں انسان ہر لمحہ ترقی کرتا ہے۔

اور فرد اپنی منازل طے کرنے میں سماجی کاآئیں اور ان میں فرد کا رول ان سوال کو نظرانداز کر کے مخدوم کا جائزہ لینا فضول ہے. مخدوم کا سب سے بڑا ... تو یہ تھا کہ اس نے اپنی انفرادیت کو اس کی تمام خوبیوں کے ساتھ اجتماعیت کا ایک جزو بنانے کی کوشش کی. نیا آدم نے مخدوم نمبر کے ان صفحات سے مخدوم کا جو پیکر ابھرتا ہے وہ کیسا ہے اس کا اندازہ تو پڑھنے والے ہی کریں گے اگرچہ ہماری کوشش ضرور رہی ہے پیکر فی الواقعی مخدوم کا پیکر ہو جس نے سارے زمانہ کو ساتھ لے چلنے کا عہد کیا تھا، اور جو سمارت تھا ایک انداز نظر سے ایک ایسے تصور سے جو حقیقت کا روپ دھار کر ایک نئی دنیا اور ایک نئے عالم کو جنم دے سکتا ہے. (ادارہ)

نجی زندگی

مخدوم ——— "تھا" آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

مخدوم کو لوگوں نے جن مختلف زاویوں سے دیکھا اور ان کی شخصیت کے بارے میں جو تاثر جس نے قائم کیا، وہ اکثر صورتوں میں مختلف و متضاد سی نظر آتی ہے۔ گوپی چند نارنگ انہیں "مطربِ انقلاب" قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مسیح الزماں "کردار کا غازی" کہتے ہیں۔ ظ انصاری نے انہیں "حدیثِ جواں" کا نام دیا۔ جوگندر پال جی نے "معصوم بزرگ" کے روپ میں دیکھا ——— لیکن سب سے زیادہ پتہ کی بات تو جادہ تبسم نے کہی ہے ——— "م سے محبت م سے مخدوم"۔ محبت، مخدوم کی شخصیت کی تعمیر میں بنیاد کا پتھر بن گئی تھی۔ اور اسی نے انہیں، راج بہادر گوڑ کے الفاظ میں "کلچر کے سپاہیوں کے لئے یونیفارم [illegible] کے لئے انگریزی اور انقلابیوں کے لئے اسلحہ خانہ کا روپ دے رکھا تھا۔ اس بنا پر [illegible] نے "جعفری" کو مخدوم کی وفات کے بعد یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ "مخدوم کے بعد حیدرآباد [illegible] ہو گیا ہے کہ کوئی وہاں آئے"

کچھ لوگ مخدوم کی وفات کے بعد چھپائے جانے والے رسالے میں، بہتان تراشی [illegible] کر اپنے وجود کو منوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے لئے بھی انہیں مخدوم سے "جھوٹ موٹ" کی قربت کا سہارا لینا پڑتا ہے ... کسی برگد کے سایہ میں بیٹھ کر کسی نہ گذری ہوئی رات کی، کوئی بڑی گندی داستان سنا کر، وہ اپنی آلائش ذہن کو، مخدوم سے [illegible] کی یادگار قرار دینا چاہتے ہیں ...
لیکن اس ندیاں سرائی کے پس پردہ محرکات سے، مخدوم کے ان تمام ہمدرد دوستوں کا ذہن [illegible] ہے۔

مخدوم کی کتاب زندگی کا پہلا صفحہ، حیدرآباد میں طغیانی کے اس دور سے شروع ہوتا ہے جب [illegible] علی العمان حکمران نے بھی ہزاروں انسانوں کی نعشوں کو غضبناک موسی کی سطح پر بے کسی کے عالم میں تیرتا دیکھ کر [illegible] ان کے بیان کے مطابق اسے ہاتھی کو بھی پانی میں اتار دیا تھا۔ شاید موسی کی ان ہی طغیانی روایات سے مخدوم کا ضمیر گوندھا گیا تھا۔ حسب نسب کے اعتبار سے، مخدوم کے جد اعلیٰ آنحضرت صلعم کے مشہور صحابیوں میں شامل تھے۔ دادا [illegible] اعظم گڑھ سے حیدرآباد آئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ انہوں نے ضلع میدک میں سکونت اختیار کر لی۔ مخدوم کے [illegible] ان کے پر دادا، جناب مخدوم محی الدین صاحب حیدرآباد کے بہت اچھے قاریوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ مخدوم کے والد جناب غوث محی الدین صاحب تعلقہ اندول میں تحصیل کے صیغہ دار تھے۔ لیکن مخدوم کی پیدائش کے چار سال بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے چچا جناب بشیر الدین صاحب نے، مخدوم کی کفالت اور پرورش کی ذمہ داری قبول کر لی۔ یہ بھی تحصیل ہی کے صیغہ [illegible] ترقی کرتے کرتے تحصیلدار بن گئے تھے۔ مخدوم کی ابتدائی تعلیم، مدرسہ [illegible] اور سنگاریڈی میں ہوئی۔ مخدوم صاحب کے [illegible] ان کے الفاظ میں، جو،

اب پاکستان میں گئے ہیں۔ [illegible] خدو [illegible] سے مظہر کو پر لو ہے کا بھیجہ گھمانے والے کم عمر لڑکوں پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے [illegible] عمر کے لڑکوں سے [illegible] ہو جایا کرتے تھے۔

جناب اولاد اشرف [illegible] تحقیقاتی مقالہ میں لکھتے ہیں کہ مخدوم کا گھرانہ بھی [illegible] واقع ہوا تھا [illegible] ان کے لئے وعظ کا پانی بھرنا اور مدرسہ میں جاروب کشی بھی کرنا پڑتا [illegible] پڑھائی لکھائی [illegible] نگرانی [illegible] حفظ قرآن اور خطاطی کی مشق کرنے ۔ چچا صاحب مذہبی اور سیاسی طور [illegible] تحریک خلافت کے وہ پر جوش موید رہے۔ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کی [illegible] ایک دن [illegible] نے مادر پدر آزاد خاندانی زندگی [illegible] اور بتایا کہ اب وہاں ایک عورت کا ذہن سیٹ کیا [illegible] ایک [illegible] مخدوم [illegible] عجیب [illegible] اور وہ سوچتے رہتے کہ سب لوگوں کو ایک دسترخوان پر کیا کھلایا [illegible] دسترخوان بنایا گیا ہوگا۔

مخدوم صاحب کی [illegible] اور گلستاں [illegible] سال سے شروع ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے سٹی کالج ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان [illegible] امتیازی کامیابی حاصل کی۔ [illegible] ۱۹۲۹ء [illegible] جہاں [illegible] کے استاد جناب مناظر احسن گیلانی سے ہر وقت کی صحبت [illegible] کی کمی کی وجہ سے وہ امتحان میں [illegible] حیدرآباد [illegible] میں مخدوم تعلیم حاصل کر رہے تھے [illegible] اخراجات کی تکمیل کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں [illegible] ایک نواب صاحب کی انگلو انڈین محبوبہ کو [illegible] تھے۔ دو تین مہینوں تک سابق ریاست حیدرآباد کے محکمہ ملکی و مال میں محمد ڈگریلی کی کلرکی بھی کی۔ [illegible] اس وقت کی علم ستاروں کی [illegible] کبھی فروخت کیا۔ دن بھر محنت و مشقت اور حصول علم [illegible] اور رات میں [illegible] دوست نور الہدیٰ کے ساتھ سلطان بازار کی ہری مسجد میں پڑے رہتے [illegible] لیکن مذکرہ سنجی اور زندہ دلی [illegible] آزمائش و امتحان کے اس مرحلہ پر بھی، ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ مخدوم، نور الہدیٰ، میر حسن، اور اشفاق حسین، یہ ایک ایسے مربع کی شکل اختیار کئے ہوئے تھے جس کے اندر غم و اندوہ کے لئے کوئی جگہ نکلنی [illegible] جمال الدین کے لطیفوں اور بیلا دوست اللہ کا خالق مخدوم [illegible] دنیا کو دار المحن نہیں سمجھتا۔

جس طرح [illegible] تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح مخدوم بھی نئے نئے لطیفے گھڑ لے۔ جہاں بیٹھے ایک لطیفہ بنا دیا۔ جس نے بلایا کسی نہ کسی لطیفہ کی [illegible] مخدوم کو حاضرین و سامعین کی ضرورت تھی اور بعض وہ سوکھ کھاؤ ملنے لگے۔ لڑکے تفریح چاہتے تھے اور مخدوم نے لطیفوں کے انبار لگا دیئے۔ مخدوم کا یہ کاروبار ایسا چمکا کہ سبحان اللہ یا ماشاء اللہ۔ عام قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے محفل سجتی ہے، پھر شمع محفل پیدا ہوتی ہے۔ جامعہ میں اس کے برعکس ہوا۔ پہلے مخدوم چراغ بنا اور اس کی کرنوں سے محفل بعد میں سجی۔ چھوٹے بڑے [illegible] بننے لگے اور ان میں مخدوم کا ذکر ہونے لگا۔ مخدوم [illegible] اور [illegible] مخدوم نے توڑا۔

مخدوم نے ڈرامے لکھے، اسٹیج کئے، ہیرو کا رول ادا کیا۔ اور اس فن میں بھی کمال فن کا [illegible] مظاہرہ کیا کہ گرودیو ٹیگور بھی، جو اُن کے ایک ڈرامہ کے خصوصی دیکھنے والوں میں شامل تھے، اُن کی ذہانت اور اداکاری سے متاثر ہو کر اسٹیج پر چلے آئے، اور انھیں شاباشی دیکر اس شرکت کا کلائمکس کیا۔ جہاں تک مخدوم کی شاعری کا تعلق ہے، اس کا آغاز ۱۹۳۳ء میں کی گئی، خواجہ نظم "بلاؤ دوشالہ" سے ہوتا ہے جو شائع تو کہیں نہیں ہوئی، لیکن ہر محفل میں فرمائش کر کے سنی جاتی تھی۔ ان کی پہلی [illegible] جناب محبوب گورکھپوری کے رسالہ ایوان میں ۱۹۳۴ء میں "طور" کے زیر عنوان شائع ہوئی۔

انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں نہ بٹھائے جانے کے دوران میں جناب مخدوم پر ایک [illegible] ایسا وقت بھی آیا کہ انھیں کئی گھنٹوں تک بھوکا رہنا پڑا۔ جب ضبط و تحمل کا پیمانہ چھلک اٹھا تو، یہ اپنے ایک رشتہ کے چچا کے گھر [illegible] گئے اور وہاں ان کی لڑکی کے اصرار پر انھوں نے اسی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی روٹیاں کھائیں اور چھ سات گھنٹوں تک اسی گھر میں [illegible] رہے۔ یہی لڑکی بعد میں ان کی رفیقۂ حیات بنیں۔ زندگی بھر، وہ اس خاتون کا احترام کرتے [illegible] کے مطابق، اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے "اس خاتون [illegible] اس کا دل [illegible]"

[illegible] اسی [illegible] ان کی شاعری کو [illegible] شاعری سے ممیز رکھا [illegible] بالکل درست ہے کہ "مخدوم کی رومانی شاعری بھی، ان کی زندگی کے علاوہ القلب [illegible] [illegible] رواجی شباب میں [illegible] تھے۔ ان کو ایسی خلوت معصوم درکار تھی، جس پر [illegible] رشک ہونے لگے۔"

مخدوم ادب و شعر ہی کے راستہ [illegible] ۱۹۳۶ء میں انھوں نے ہی حیدرآباد میں، جناب سبط حسن، احمد حسین رائے پوری، اور [illegible] کے اشتراک و تعاون [illegible] ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی اور اپنے خلوص، معیارِ شعر، ذہانت و فراست [illegible] اولی [illegible] شمار ہونے لگے۔ ۱۹۴۵ء میں وہ اپنی صاحبزادی [illegible] کے ساتھ فرینڈس آف سوویٹ یونین کی کانفرنس میں شرکت کے لیے بمبئی گئے۔ اور اس موقعہ پر، سروجنی نائیڈو نے ان سے اور ان کی صاحبزادی سے گاندھی جی کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا — "یہ میرا بیٹا ہے۔ اور یہ لڑکی، میرے بیٹے کی بیٹی ہے۔" اس سے پہلے ہی ۱۹۳۸ء میں وہ [illegible] "میں پنڈت نہرو سے بھی متعارف ہو چکے تھے۔

قاضی عبدالغفار صاحب کے [illegible] جلد آگیا جب کہ اس نے اپنے [illegible] میں قدم رکھنا پڑا۔ اس نے اپنے [illegible] اوراق کی پابندیوں سے آزاد ہو گئی" [illegible] ۱۹۳۹ء میں مخدوم کا [illegible] وقت تک مخدوم کی نظمیں حیدرآباد کی ہر محفل میں سنائی دینے لگی تھیں۔ اور "انقلاب" [illegible] بھی صادر فرمایا تھا۔ مخدوم نے ۲ سال تک سٹی کالج میں کام کیا۔ لیکن اس دوران ان کے سیاسی معاملات [illegible] سیاسی مصروفیات کا دائرہ

وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ کالج کے بعض گوشوں سے دبی دبی آوازیں۔ شکایت بھی کی جانے لگی کہ، مخدوم، اپنی جماعتوں میں اشتراکیت کا پرچار کیا کرتے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر انہوں نے ۱۹۴۱ء میں ملازمت سے استعفیٰ پیش کر دیا۔ مخدوم جن دنوں قید ملازمت سے آزاد ہوئے، ریاست حیدرآباد میں، اشتراکیت تو بڑی بات ہے، جمہوریت اور آزادی کا نام لینا گناہ سمجھا جاتا تھا، مجلس اتحاد المسلمین کا اثر بڑھتا جا رہا تھا اور " انا الملک" کے گمراہ کن نعرے کے ذریعہ یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ، ظلِ سبحانی، اسلامی اقتدار کے مظہر ہیں اور ان کے مقابلہ میں جمہوریت و آزادی کے نعرے لگانے والے اسلام کے دشمن ہیں۔ احتساب و رجعت پسندی کے اس صبر آزما ماحول میں، سبط حسن، احمد حسن رائے پوری، سعید حسن اور جے ڈی برسنگ راؤ نے مارکسسٹ اسٹڈی سرکل کی بنیاد رکھی۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، احسن علی مرزا اور ابراہیم مرحوم نے، کامریڈز اسوسی ایشن کے قیام کا اعلان کیا۔ دوسری طرف کامریڈ روی نارائن ریڈی، اپنے ایک گروپ کے ساتھ مصروف عمل تھے۔ یہ سب ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے لاعلم اور ناواقف تھے۔ تاہم کسی نہ کسی طرح ان کو ایک دوسرے سے قریب ہونے کا موقع ملا اور مخدوم، کامریڈز اسوسی ایشن کی روح رواں بن گئے۔ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے جونیر طلبا کے قائم کردہ اسی ادارہ نے ۱۹۳۹ء میں، کمیونسٹ پارٹی کی شکل اختیار کر لی۔ اور کل ہند کمیونسٹ پارٹی سے اس کا الحاق عمل میں آیا۔ آندھرا مہاسبھا بھی، جو ایک خالصتاً تہذیبی اور ثقافتی تنظیم تھی، کامریڈ روی نارائن ریڈی اور کامریڈ مخدوم کے اثر کمیونسٹ تحریک کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بن گئی اور تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کے آغاز میں، اس جماعت نے نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۴۲ء میں مخدوم نے پارٹی کی ہدایت کے مطابق ریلوے ورکرس یونین میں کام شروع کیا اور جلد ہی اس کے جنرل وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ اس سے پہلے ہی مخدوم کے سرکاری ملازمت سے استعفے کے بعد، انہیں بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے، تین ماہ کی نظر بندی کی سزا دی جا چکی تھی۔ اور اسی رہائی کے بعد ہی سے انہوں نے مزدوروں کو منظم کرنے کا کام، انتہائی جوش و خروش سے شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے ٹریڈ یونین خطوط پر مزدوروں کی پہلی تنظیم قائم کی۔ اور اس کے پرچم تلے پہلی مرتبہ حیدرآباد کی مطلق العنان حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کرایا۔ چند ہی مہینوں کے اندر مخدوم نے اپنی کاوش و کوشش سے، مل مزدوروں، بلدی مزدوروں، کوئلہ کے کان کنوں، اور دیگر محنت کش طبقات کی ۴۲ ٹریڈ یونینیں قائم کیں۔

جن لوگوں کو، اس وقت کی ریاست حیدرآباد کے حال و ماحول کا اندازہ ہے، وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ، ان حالات میں مزدوروں اور محنت کش طبقات کو منظم اور مائل بہ عمل کرنے کے لئے کس دل گردہ کی ضرورت تھی۔ مخدوم نے، ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی تمنا میں جو، محنت کے استحصال کو گوارا نہ کر سکے، نیا مہر کی مشقتیں جھیلیں۔ اور ۱۹۴۵ء میں، آل حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد کرانے میں کامیاب رہے۔ حکومت حیدرآباد نے اگرچہ کہ، اس اجلاس کے انعقاد کی اجازت دے دی تھی لیکن جلسہ کے دوران ہی، مخدوم کو گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت سے مسٹر مخدوم رہا کر دیئے گئے۔ اور قانونی داروگیر کی اس منزل کو، کامیابی سے طے کرنے کے بعد، انہوں نے، پہلے سے زیادہ جوش و خروش اور لگن کے ساتھ، ٹریڈ یونین تحریک میں حصہ لینا شروع کیا۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں، وہ سمنٹ فیکٹری کے مزدوروں کے حالات کی چھان بین کے لئے شاہ آباد گئے ہوئے تھے کہ، وہیں انہیں ان کے وارنٹ گرفتاری کی خبر ملی اور وہ روپوش ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء

تک مخدوم روپوش رہے۔ اور اس دور میں ان کی صعوبتوں کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی لڑکی آسا دری اور ان کا لڑکا نصرت، دونوں ہی انہیں والد کے بجائے چچا کہنے لگے تھے، تاکہ اس وقت کے انتقام جو حکومتیں، مخدوم کی، محنت کش طبقہ سے والہانہ محبت کی پاداش میں، مخدوم کے ان بچوں کو بھی ظلم و زیادتی کا ہدف نہ بنائیں۔

روپوشی کے اس دور نے، مخدوم کے کردار اور اس کی شخصیت کو کافی نکھارا — اور اپنی استقامت کردار کی بناء پر وہ ان گھروں میں بڑی توقیر اور بڑے ہی احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے رہے، جن میں انہوں نے پناہ لی تھی، روایت پسند، بے شعور اور غیر سیاسی گھرانوں کے بڑے بوڑھے بھی، ان کی ہمدردی و دل سوزی سے متاثر ہو کر، اپنے آپ کے خطرہ میں گھر جانے کے احساس سے بے نیاز ہو کر، ان کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ اسی اثناء میں انہوں نے، تلنگانہ کی مسلح جد و جہد کی رہنمائی بھی کی۔ پولیس ایکشن کے بعد بھی یہ جد و جہد جاری رہی، مارچ ۱۹۵۱ء میں مخدوم جب حیدرآباد پہونچے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا اور آزاد ہندوستان کے پہلے چناؤ سے کچھ ہی قبل انہیں ۱۹۵۲ء میں رہا کر دیا گیا۔ اور کانگریس کے مقابلہ کے لیئے بائیں بازو کے بعض گروہوں اور افراد پر مشتمل عوامی جمہوری محاذ تشکیل دیا گیا۔ مخدوم محاذ کے ٹکٹ پر، اسمبلی اور پارلیمنٹ دونوں ہی کے امیدوار نامزد کیئے گئے۔ لیکن کانگریس کی دھاندلیوں کی وجہ سے، مخدوم کو اپنی بے پناہ مقبولیت کے باوجود کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ ضمنی چناؤ میں وہ حضور نگر کے حلقہ سے سابق حیدرآباد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ قیام آندھرا پردیش کے بعد وہ ۱۹۵۶ء میں قانون ساز کونسل میں کمیونسٹ پارٹی کے امیدوار بنے اور اپنی اچانک وفات تک کونسل میں کمیونسٹ گروپ کے لیڈر رہے۔

نصرت محی الدین

میں جس کو یاد کرتا ہوں...

آج سے تقریباً دو سال پہلے جب شہر میں جشنِ مخدوم منایا جا رہا تھا، میں نے اپنے شفیق باپ جناب مخدوم صاحب کے تعلق سے اپنے تاثرات ایک مضمون کی شکل میں پیش کیے تھے۔ اس مضمون کی روزنامہ سیاست میں اشاعت کے بعد والد بزرگوار نے اسے بڑے شوق سے پڑھا اور اسے بے حد پسند کیا تھا۔ آج ان کے انتقال کے بعد جب میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں مجھے بار بار یہ خیال آ رہا ہے کہ اب اسے کون پسند کرے گا، اور ان کی طرح کون میری حوصلہ افزائی کرے گا۔ میں نہ تو مضمون نگار ہوں اور نہ ہی میں اس امر کی جسارت کر سکتا ہوں کہ میرے والد بزرگوار کی منفرد شخصیت کے بارے میں کوئی مضمون لکھوں میں تو صرف ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں گا جو ان کی گھریلو زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ عوامی جدوجہد سے گہری وابستگی اور عوامی لڑائیوں کی رہنمائی کی پاداش میں ان کا گنجِ گراں مایہ عمر نذرِ زنداں ہوا۔ اور کتنے ہی سال انھوں نے روپوشی میں گزارے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بچپن ہی سے انھیں میرے والد ہونے کے باوجود "چچا باوا" کہتا رہا۔ میں ان چند سطروں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان کی عوامی زندگی اور نجی زندگی میں کتنا تال میل اور ربط تھا۔

"چچا باوا" کا پیار صرف ان ہی کی اولاد تک محدود نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ پیار بانٹتے پھرتے تھے اور جس سے بھی ملتے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتے کہ اسی سے بہت زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے انتقال کے بعد کتنے ہی لوگ ان سے بہت زیادہ قریب رہنے کے دعویدار ہیں۔ چچا باوا کے لیے بچے دنیا کی سب سے بڑی نعمت تھے۔ گورے نانا، چچی چچا بابا ماموں جان۔ غرض وہ بچوں اور بچیوں میں کتنے ہی ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ بعض بہت چھوٹے تو انھیں صرف "مخدوم" کہا کرتے تھے۔ اور وہ ننھے منوں کو اس بے تکلفی سے اپنا نام لیتے دیکھ کر بے حد خوش ہوتے۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چچا باوا، گھریلو ذمہ داریوں سے بے تعلق اور بے نیاز رہا کرتے تھے۔ لیکن ان کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ میں نے انھیں اپنے ہاتھ سے چھوٹے موٹے گھریلو کام کرتے دیکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ گھریلو کاموں کی انجام دہی میں وہ بڑی خوشی سے ہمارا ہاتھ بٹاتے۔ مہینہ بھر کے غلّہ اور دیگر ضروریات کی فہرست امّی اور ہمارے مشورے سے خود ہی تیار کرتے بعض دفعہ تو خود ہی روزمرہ کا سودا بھی لا دیتے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ چچا باوا جلانے کی لکڑی لیے چلے آ رہے ہیں۔ ہم بچوں نے انھیں کسی وقت بھی امّی سے لڑائی تو کجا درشت لہجہ میں

کچھ بولتے ہوئے نہیں سنا۔ لیکن جب کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہو جاتی تو وہ بے حد سنجیدہ بن جاتے اور ہم سب کو اندازہ ہو جاتا کہ آج چچا باوا غصہ میں ہیں۔ سالن میں مرچ زیادہ ہو جاتی یا دھوبی ان کی بنیان غائب کر دیتا تو ان کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ جب وہ بہت زیادہ ناراض ہو جاتے تو رنگ سیاہ ہونے کے باوجود اس سے لالی جھلکنے لگتی۔

امی کے ایثار اور ان کی قربانیوں کا وہ اکثر ذکر کرتے اور ہم سے کہتے اس خاتون کی جتنی عزت کر سکو کرو کیونکہ اس نے میرے اور تمھارے لیے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب چچا باوا علی نوشیر وانی کے جشن میں شرکت کے لیے تاشقند جا رہے تھے تو انھوں نے ہم سبھوں سے پوچھا کہ وہاں سے کون کون سی چیزیں لائی جائیں۔ گھر کے ہر فرد نے کچھ نہ کچھ فرمائش کی اور جب امی کی باری آئی تو انھوں نے بڑی سادگی سے کہا "ہمارے لیے چوڑیاں لے آئیے" چچا باوا قہقہے لگانے لگے اور بولے "بیگم! سوویت یونین کی عورتیں تمھاری طرح چوڑیاں کہاں پہنتی ہیں۔ وہ تو اس رواج کو کبھی کی ترک کر چکی ہیں۔ اب تمھارے لیے تاشقند میں چوڑیاں کہاں ڈھونڈتا پھروں..."

ایک دفعہ ہم سب افراد خاندان باتیں کر رہے تھے۔ چچا باوا "فلم برسات" کی کہانی سنا رہے تھے جس کے گانے خود انھوں نے ہی لکھے ہیں۔ مجھے یاد کہ یہ فلم راج کپور کی "برسات" نہیں بلکہ اسی نام کی ایک نئی فلم ہے جو ابھی تک مکمل نہیں ہوئی ہے۔ اسی سلسلے میں چچا باوا کے معاوضہ کا بھی ذکر نکلا۔ امی نے شکایت کے لب و لہجہ میں کہا "تم سارے پیسے برباد کر رہے ہو۔ ان سے کوئی اچھا سامکان خریدا جا سکتا ہے۔" امی کی اس تجویز پر ہم سب کی رائے لی گئی۔ چچا باوا کے سوا ہم سبھوں نے امی کی صلاح کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا۔ چچا باوا ہنستے ہوئے بولے بھئی ہمارے لیے مکان کی کیا ضرورت ہے۔ ایم ایل اے کوارٹر چھوٹ جائے تو کسی پیڑ کی گھنی چھاؤں میں سر چھپا لیں گے!

چچا باوا کو سادگی بے حد پسند تھی۔ تکلف، تصنع اور بناوٹ سے وہ سخت نفرت کیا کرتے تھے۔ کھانے کی حد تک بھی انھیں سادہ غذائیں بہت پسند آتیں۔ جو کچھ بھی گھر میں پکتا وہ بڑی خوشی سے کھا لیتے۔ جوار کی روٹی اور کھٹی دال ان کا من بھاتا کھانا تھا۔ چچا باوا کے لیے ناشتہ میں کھچڑی ضروری ہوتی۔ بیرونی ممالک کے دورے سے جب کبھی واپس ہوتے تو سب سے پہلے کھچڑی پکانے کی فرمائش کرتے۔

گھر کی حفاظت اور گھر کے دروازے کو مقفل کرنے سے انھیں نفرت تھی۔ اکثر اوقات جب وہ رات گئے گھر میں داخل ہوتے تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتے اور رات بھر دروازہ کھلا ہی رہتا۔ جب امی دروازہ بند کرنے کی خواہش کرتیں تو مسکرا کر کہتے "ہمارے پاس دھرا ہی کیا ہے جو کوئی اٹھا لے جائے گا۔ آنے والا خود ہی پشیمان ہوگا۔"

جب میرے چھوٹے بھائی ظفر کا ہاتھ ٹوٹ گیا تو انھیں سخت صدمہ ہوا۔ وہ اس کے لیے اکثر پریشان بھی رہا کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ظفر کی بہادری کی داد بھی دیا کرتے: "شاباش بیٹے! درخت سے گر کر ہاتھ چور چور ہو جانے کے باوجود اُف تک نہ کی۔" اس سے کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے معالج ڈاکٹر رنگا ریڈی پر پورا بھروسہ رکھے۔

"چچا باوا" ہمارے ہر راز کو راز رکھتے تھے۔ چنانچہ اب تک بھی میری کئی باتیں راز سربستہ ہی ہیں جن کی

تفصیلات سے چچا باوا پوری طرح واقف تھے۔ ۱۹۶۷ء میں میں اپنی شادی کے سلسلے میں ان کی اجازت حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن پاس ادب میں راست ان سے رجوع نہ کرسکا لہٰذا کامریڈ نصیر بیگ، کامریڈ یوسف، اور کامریڈ چندر را کے توسط سے میں نے اپنے ارادہ سے چچا باوا کو واقف کرایا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ چونکہ میں یہ شادی اپنی مرضی سے کر رہا تھا اس لیے انھوں نے امّی کو بھی اس کے بارے میں کوئی بات نہیں بتائی جس پر وہ اعتراض کرسکتی تھیں۔ ان دنوں آر ٹی سی کی ہڑتال چل رہی تھی۔ چچا باوا کو اسی ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار کرلیا گیا۔ اور میری بدبختی کہ وہ شادی میں شریک نہ ہوسکے ان کی عدم موجودگی میں راج چچا نے میرے سرپرست اور ولی کے فرائض انجام دیے۔ میں سیول میرج کرنا چاہتا تھا اس ضمن میں میری ہونے والی رفیقہ حیات نصیرہ کی رائے بھی معلوم کی گئی لیکن اس نے کسی رائے کے اظہار کے بجائے خاموشی اختیار کرلی۔ چچا باوا کو جب اس کا علم ہوا تو وہ سمجھ گئے کہ نصیرہ کو سیول میرج کی تجویز پسند نہیں۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں نصیرہ کے جذبات، افتادِ طبع اور ماحول وغیرہ کا لحاظ کرتے ہوئے سیول میرج پر اصرار نہ کروں۔ چنانچہ ان کے مشورہ کے مطابق مجھے مذہبی انداز میں شادی کرنی پڑی۔ میں پوری صداقت اور ایمان داری سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے دیگر لوگوں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا۔

چچا باوا سے میری آخری ملاقات پارٹی آفس میں ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مہینہ کی پہلی تاریخ کو شہر میں نہیں ہوں گے اس لیے گھر کے خرچ اور غلّہ وغیرہ کی سربراہی کی ذمہ داری میں قبول کرلوں۔ واپسی کے بعد وہ حساب چکا کردیں گے۔ ہم دونوں جب گھر آئے تو سب بچّوں نے چچا باوا سے مختلف چیزیں لانے کی فرمائشیں کیں۔ بنی، منجو، فرخ، ظفر، کپڑے اور گڑیوں کے لیے اصرار کرتے رہے۔ ہم سب نے بڑی دیر تک ہنسی خوشی سے باتیں کیں۔ چچا باوا نے سب کو یقین دلایا کہ وہ ان کی فرمائشیں ضرور لیتے آئیں گے کیونکہ مشاعرہ کا انھیں خاصہ معاوضہ ملے گا۔ دلی کو روانگی سے کچھ پہلے اپنا سامان باندھتے ہوئے انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر صدارتی چناؤ میں مسٹر گری جیت جائیں تو وہ ضرور راشٹر پتی بھون جائیں گے۔

انھیں دلی جاکر دو تین دن بھی نہ گزرے تھے کہ کامریڈ امولک رام نے فون پر اطلاع دی کہ چچا باوا کا دلی میں مزاج خراب ہوگیا ہے مجھے اور امّی کو دلی جانا ہے۔ میں نے صحیح صورت حال سے واقف ہونے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ چچا باوا کے قلب پر حملہ ہوا ہے لیکن تشویش و پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم سبھوں کی رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹی۔ امی، بی بی اور پھوپی جان رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں۔ گھر سارا ماتم کدہ بن گیا تھا۔ سہ پہر میں کامریڈ امولک رام اور کامریڈ چندر را نے ہمیں طیران گاہ بیگم پیٹ پہنچایا اور ہمارا ہوائی جہاز دلی کے لیے روانہ ہوا۔ راستہ بھر میری اور امی کی بے چینی اور پریشانی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ بالآخر ہم پالم کے ہوائی اڈہ پر اتر پڑے۔ کامریڈ معین اور کامریڈ مہدی عابدی نے ہمیں پارٹی بیس پہنچایا۔ ان دونوں سے ہم چچا باوا کے بارے میں کتنے ہی سوالات پوچھے لیکن وہ ٹالتے رہے۔ تاہم ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے ہمیں اندازہ ہوگیا کہ چچا باوا کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ پارٹی بیس کے سامنے ہی ارون ہسپتال ہے جہاں چچا باوا زیر علاج تھے۔ ہسپتال کے اندر داخل ہوتے ہی مریضوں کی کراہوں نے ہمیں اور زیادہ بدحواس کردیا۔ ہم جب چچا باوا کے بیڈ کے قریب پہنچے تو تیمارداروں کی آنکھوں

سے آنسو رواں تھے۔ راج چچا نے مجھے قریب بلا کر کہا تم اپنے آپ کو قابو میں رکھو ورنہ امّی کی بھی جان پر بن جائے گی۔ میں نے ضبط و تحمل سے کام لینے کی بہت کوشش کی لیکن جب امی نے چچا باوا کے پلنگ پر بیٹھ کر ان کی بند آنکھیں کھولیں اور جب انھیں اندازہ ہو گیا کہ اب چچا باوا کا لمحۂ رخصت آنے ہی کو ہے تو ان کی شکیبائی کے ساتھ میرا پیمانۂ صبر بھی چھلک پڑا۔ میں نے ان کے منہ پر منہ رکھ دیا ان کے رخساروں کے بوسے لیے، ہاتھ چومے — لیکن چچا باوا تو ہم سے جدا ہو جانے کا تہیہ کر چکے تھے ان پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ کچھ دیر بعد امی کو راج چچا نے ڈاکٹر رشید احمد کے گھر بھجوا دیا۔ ان کے جانے کے بعد چچا باوا کا مزاج اور خراب ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلتے بنے۔

ہسپتال پر موت کا بھیانک سایہ رقص کرنے لگا۔ راج چچا اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن تب تک مہدی بھائی، معین صاحب، معظم صاحب سب کے سب بت بنے کھڑے تھے۔ امّی کو صبح میں چچا باوا کے انتقال کی خبر دی گئی تاکہ رات میں وہ کچھ آرام لے سکیں۔ صبح میت کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے پارلیمنٹری ہال میں رکھا گیا۔ کامریڈ ڈانگے، کامریڈ راجیشور راؤ اور کامریڈ موہت سین کے علاوہ نیشنل کونسل کے دیگر اراکین نے اس عظیم لیڈر کو خراج عقیدت پیش کیا۔ چیف منسٹر کشمیر مسٹر جی ایم صادق چیف منسٹر آندھرا پردیش مسٹر برہمانند ریڈی، مرکزی نائب وزیر قانون مسٹر یونس سلیم، مسٹر آنند نارائن ملّا، کامریڈ کانتیا اور کامریڈ سبارا‌ؤ نے بادیدۂ نم میت پر پھول چڑھائے۔ سوگواران میں کئی سرکردہ ادیب، شعرا اور دانشور بھی شامل تھے۔

"چچا باوا" — کی شاندار زندگی کا آخری باب اس طرح دہلی میں اختتام کو پہنچا — وہ عوامی خدمت گزاری کا جذبہ ورثہ میں چھوڑ گئے ہیں۔ صداقت، سچائی اور سادگی کے خزانہ سے انھوں نے ہمارا دامن بھر دیا ہے۔ دوسروں کے لیے مصیبت اٹھانے کا جو درس انھوں نے زندگی میں دیا اگر ہم اسے یاد رکھیں تو ہم بجا طور پر فخر کر سکیں گے کہ ہم "مخدوم" کی اولاد ہیں — اس عظیم انسان کی جو غریبوں، محنت کشوں اور کسانوں کے لیے لڑتا رہا اور جس نے ان کی کشمکش اور جدوجہد کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

وہ آج ہم میں نہیں ہیں — لیکن سارے بچے خوباں، منجو، فرح، طلعت داں سڑک سے گزرنے والی موٹر کے ہارن کی آواز سن کر یکایک تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ شاید اس موٹر میں ان کے چچی آرہے ہیں۔ اب انھیں کون بتائے کہ چچا باوا اس جگہ گئے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ ان میں سے جو بڑے ہیں وہ دوسرے ہی لمحہ سنبھل جاتے ہیں انھیں اندازہ ہے کہ اب چچا باوا اب نہیں آئیں گے۔ اس کے باوجود دھیمے سروں میں یہ مصرع گنگنانے لگتے ہیں ع

"اب — آبھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے"

داؤد اشرف

مخدوم ـــ ادھورا مطالعہ

جامعہ عثمانیہ میں ۶۶ ـ ۱۹۶۵ء کے تعلیمی سال کے دوران ایم. اے (آخری) کے امتحان کیلئے جن ادبی شخصیتوں پر مقالے لکھے گئے ان میں مخدوم کو شامل تھے جنھوں نے جامعہ عثمانیہ ہی سے اردو میں ایم اے کیا تھا اور جن کے دور طالب علمی میں حیدر آباد کی اس عظیم درس گاہ سے جدید حیدر آباد اور اس کی جدید تہذیب کے نقوش ابھر رہے تھے. نئی روایات شروع ہوئی تھیں. ایک ایسا ماحول پیدا ہوا اور ایک ایسی فضا تیار ہوئی تھی جس نے حیدر آباد کی ساری زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالنا شروع کیا.

جامعہ عثمانیہ سے اپنے اس گہرے تعلق کی وجہ سے بھی اردو ادب اور شاعری کی یہ قدآور شخصیت اس بات کی مستحق تھی اور اس پر اس کے وطن میں ہی اور اس کی اپنی جامعہ میں تحقیق کی جائے. ریسرچ کیا جائے۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ نے اپنے ایک بہترین فرزند کو اس کی زندگی ہی میں موزوں خراج تحسین ادا کیا۔

یہ اگست ۱۹۶۵ء کی بات ہے جامعہ عثمانیہ کے امتحان ایم. اے (آخری) کے لیے مجھے بحیثیت طالب علم اپنے مقالے کے موضوع کا انتخاب کرنا تھا. میرے ساتھی موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں اس وقت کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں سے مشورہ کرنے اور اجازت حاصل کرنے میں معروف تھے. مجھ سے بھی کہا گیا تھا کہ میں اپنے TOPIC کے بارے میں سوچ کر ڈاکٹر صاحب سے ملوں. مخدوم صاحب کا انتخاب کرنے میں مجھے دیر نہیں ہوئی. اسی طرح حصول اجازت کا مرحلہ بھی تیزی سے کے ساتھ طے ہوگیا. سب سے پہلے تو میں نے اپنے استاد محترم ڈاکٹر عبد الحفیظ قتیل سے مل کر ارادہ ظاہر کیا تھا کہ میں مخدوم پر کام کرنا چاہتا ہوں. میں اردو کے اس بڑے شاعر اور حیدر آباد کی اس عہد ساز اور محبوب شخصیت سے بے حد متاثر ہوں اور اس کی شخصیت اور فن کو ہی موضوع بنانا چاہتا ہوں. مخدوم کے ماحول سے قریب رہنے اور حیدر آباد کے "رستوں" جلسہ گاہوں اور ادبی ایوانوں میں برس ہا برس سے ملنے والے مخدوم کے تذکرے اور چرچے سننے کے بعد مخدوم کے مطالعہ کا خیال میرے لیے فطری تھا ڈاکٹر حفیظ قتیل نے میرے انتخاب کو پسند کیا. یہی نہیں بلکہ قتیل صاحب نے میرے حوصلے بھی بڑھائے. اس کے

بعد جب میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبہ سے ملا تو ڈاکٹر صاحب نے بھی فی الفور میرے موضوع کو منظور کرلیا۔ میرے دوسرے ساتھی کئی کئی بار اپنے موضوع بدل چکے تھے لیکن میرے لیے موضوع تبدیل کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ مخدوم میرا پسندیدہ موضوع تھے۔

مخدوم صاحب کے ماحول سے قریب رہنے اور برسوں تک ان کے جلسوں اور مشاعروں اور دوسری ادبی تہذیبی اور سماجی نشستوں میں شرکت کے باوجود ان سے مل کر دیر تک بات چیت میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا لیکن اپنے کام کے سلسلے میں ایسا کرنا میرے لیے ضروری تھا۔ مخدوم سے ملنے اور انھیں قریب سے دیکھنے اور ان کے بارے میں بہت سی باتیں جاننے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ مخدوم ایک بڑے شاعر ہی نہیں ہیں ایک بہترین انسان بھی ہیں۔

میں جب پہلی بار مخدوم صاحب سے ملنے کی غرض سے ان کے گھر گیا تو اس وقت میں ان کی شخصیت سے مرعوب تھا اور اپنے آپ کو نروس محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس وقت گھر پر موجود تھے۔ اطلاع ملنے کے کچھ ہی دیر بعد باہر آئے۔ بڑھ کر مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔ میں نے مختصر طور پر اپنا تعارف کرایا اور غرض بیان کی۔ سن کر ہنسنے لگے اور ایسے لب و لہجہ میں گفتگو کی اور اس سادگی اور انکسار سے ملے کہ سارا نروس نس Nervousness ختم ہوگیا اور میری ہمت بڑھی انھوں نے میری باتیں توجہ سے سنیں مجھے قابل اعتنا سمجھا اور مسکراتے ہوئے جوابات دیئے۔ میں آئندہ تفصیلی ملاقات کے لیے دن اور وقت مقرر کرکے وہاں سے واپس لوٹا۔

میرے بعض ساتھیوں کو جو ایسے ادیبوں اور شاعروں پر مقالے لکھ رہے تھے جو بقید حیات تھے شکایت تھی کہ انھیں اپنے مقالوں کے لیے ان ادیبوں اور شعرا کا مکمل تعاون حاصل نہیں ہو رہا ہے لیکن میں اس سلسلے میں خوش قسمت تھا کیونکہ مجھے مقالے کی تیاری میں مخدوم صاحب سے بھرپور تعاون ملا۔ صرف ایک بار اہم معروفیت کے باعث وہ مقررہ وقت پر مجھے وقت نہ دے سکے۔ دوسری طرف دوبار ایسا بھی اتفاق ہوا کہ خود میں ان سے وقت لے کر ان کے پاس نہ جاسکا۔ فون پر ربط پیدا کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ میرے منتظر ہیں۔ مجبوری بیان کرکے میں نے معذرت چاہی۔

پہلی دفعہ انٹرویو دینے کے لیے مخدوم صاحب نے مجھے صبح ۸ بجے گھر پر بلایا تھا۔ میں سوا آٹھ بجے ان کے گھر پہنچا پتہ چلا کہ وہ میرا انتظار کرکے پارٹی آفس جاچکے ہیں۔ مجھے شرمندگی اور حیرت ہوی۔ شرمندگی اس لیے کہ میں مقررہ وقت پر نہیں پہنچ سکا تھا اور حیرت کی وجہ یہ تھی کہ مخدوم ۸ بجے تک ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر باہر جاچکے تھے میں تو یہ سمجھتا تھا کہ شاعر مخدوم صبح دیر تک سوتے ہوں گے اور ۱۱ یا ۱۲ بجے گھر سے باہر نکلتے ہوں گے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اتنے پابند اور اصولی آدمی نکلیں گے ان کی زندگی میں اتنی باقاعدگی اور اتنا سلیقہ ہوگا۔ میں ان کے گھر سے پارٹی آفس پہنچا۔ گھر پر دیر سے پہنچنے کی معافی چاہی اور دریافت کیا کہ کیا وہ مجھے کچھ وقت دے سکتے ہیں۔ مخدوم تیار ہوگئے اور ہم قریب کے ایک کافی ہاؤس میں بیٹھ گئے۔ اس وقت میرے ساتھ ایک سوال بند تھا جس میں مخدوم کے حالات

زندگی اور شاعری کے بارے میں بیسیوں سوالات درج تھے۔ میں جانتا تھا کہ نہ صرف مخدوم کا بلکہ میرا وقت بھی بچے اور کام میں ربط اور ہم آہنگی رہے۔ مخدوم تقریباً ایک گھنٹہ تک سوالات کے جواب دیتے رہے۔

ایک بار صبح میں مخدوم صاحب کے دیے گئے وقت پر ان کے گھر پہنچا۔ وہ ایک چھوٹی بچی سے بیٹھے ہوئے کھیل رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس بچی کو باغ عامہ لے جانا ہے وہاں کچھ تصویریں کھنچوانی ہیں اس کے بعد ہم اپنا کام کریں گے۔ ہمارے ساتھ نصرت بھی تھے۔ باغ عامہ میں تصویریں کھنچوانے کے بعد بچی کو مخدوم صاحب نے نصرت کے ذریعے گھر روانہ کر دیا اور ہم بہت دیر تک باغ عامہ کے ایک گوشہ میں بیٹھے رہے۔ میں سوالات پوچھتا جاتا اور مخدوم صاحب کبھی مختصر اور کبھی تفصیل سے جواب دیتے۔ بعض سوالات کا انھوں نے بہت کھل کر جواب دیا تھا۔ ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ وہ سوالات کی نوعیت اور جوابات دیتے وقت اپنے موڈ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ زندگی کے گزرے ہوئے ایام کی یاد تازہ کرتے وقت وہ اپنے سارے وجود کے ساتھ اُس ماحول میں پہنچ جانا چاہتے تھے جن سے ان یادوں کا تعلق ہوتا۔

مقالے کے مکمل ہونے تک مخدوم صاحب سے کچھ اور ملاقاتیں رہیں اور جب میرا مقالہ مکمل ہو گیا تو سب سے پہلے مخدوم صاحب نے خواہش کی کہ وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں ــــــ امتحان گزر گیا، احباب کا اصرار تھا کہ مخدوم پر لکھے گئے مقالے کو میں کتابی شکل میں شائع کروں۔ میرا خیال تھا کہ جو مطالعہ میں نے کسی حد تک امتحان کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ہے اسے فی الفور شائع کر دینے کی بجائے اس شخصیت کا بھرپور مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ اس کی زندگی کے مختلف اجزا جمع کرنے چاہئیں۔ اس کی شاعری اور فکر و فن کا تفصیلی جائزہ لینا چاہیے اس کے بعد کہیں ایک ضخیم کتاب شائع کی جا سکتی ہے۔ لیکن میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ مخدوم پر میں نے جو کام کیا ہے اسے جلد از جلد معمولی رد و بدل کے بعد شائع کر دینا چاہیے کیونکہ مخدوم جیسی قد آور شخصیت کی زندگی اور شاعری پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ مخدوم اور ان کی شاعری پر مضامین بھی بہت کم لکھے گئے ہیں۔ مخدوم پر لکھنے والوں کی سہولت کے لیے کتاب کی شکل میں بہت سا ضروری مواد ان کے سامنے ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس استدلال یا ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے "مخدوم ــ ایک مطالعہ" کے نام سے کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کتاب کی رسم اجرا کے موقع پر ایک پر اثر تقریب منعقد ہوئی تھی اس تقریب میں مخدوم کو میں نے بڑے ہی اچھے موڈ میں دیکھا اور اس تقریب میں انھوں نے اپنے بارے میں اور ان کے اس "ایک مطالعہ" کے بارے میں جو باتیں کہی تھیں وہ میرے دل پر نقش ہو کر رہ گئی ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ضخامت بتاتے ہوئے کہا کہ وہ تو چاہتے تھے کہ ان پر لکھی جانے والی کتاب بہت زیادہ ضخیم ہو۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے جس ضخامت کا اشارہ کیا تھا وہ مولوی عبدالحق کی ڈکشنری کی ضخامت سے کچھ کم نہ تھی جب کہ میری کتاب مقابلتاً بہت ہی پتلی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت اور جلسہ پر مذکورہ بالا تقریب اور دوسرے موقعوں پر کیے گئے تبصروں، تجاویز اور مشوروں سے متاثر ہو کر میں چاہتا تھا کہ "مخدوم ــ ایک مطالعہ" کو حقیقی

معنی میں ایک تفصیلی اور بڑی حد تک مکمل مطالعہ میں تبدیل کروں، اور مولوی عبدالحق کی ڈکشنری جیسی ضخامت والی ضخیم اور موٹی کتاب شائع کی جائے جس میں مخدوم کے کلام کا انتخاب اور ان کے بعض اہم خطوط ان کے کہے ہوئے لطیفے اور بہت کچھ ہو ــــ

مخدوم صاحب کے انتقال سے دو چار روز پہلے بھی میں نے اپنے بعض قریبی دوستوں سے اس بارے میں گفتگو کی تھی کہ مجھے پھر سے مخدوم صاحب سے ملنا پڑے گا اور ان کی کتاب زندگی کے اوراق جو منتشر ہیں ترتیب وار اور تاریخ وار جمع کرنا ہوں گے ــــ ایک نیا مطالعہ شروع کرنا ہوگا۔ لیکن ابھی یہ نیا مطالعہ شروع بھی نہیں ہوا کہ مخدوم صاحب کے قلب پر اچانک شدید حملے کی منحوس اطلاع ملی اور چند گھنٹے بعد یہ معلوم ہوا کہ مخدوم اب نہیں رہے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ جو ابھی ابھی ہمارے ساتھ تھے کس طرح "نہیں رہے" کہلائے جا سکتے ہیں۔ کاش یہ اطلاع غلط ثابت ہوتی کوئی اس افواہ کی تردید کرتا لیکن یہ ایک حقیقت تھی موت کی طرح اٹل ــــ

مخدوم صاحب کے خطوط

اپنے بڑے لڑکے نصرت محی الدین کے نام

ڈیر نصرت

سمرقند ۲۶ ستمبر ۶۸ء

آج سمرقند میں علی شیر نوائی شاعر ازبکستان کی ۵۲۵ ویں سالگرہ کا جشن تھا۔ یہ شاعر (۱۴۴۱ - ۱۵۰۱ء) تھا۔ جشن میں ایک خوبصورت مخطوطہ [illegible] خراج عقیدت پیش کیا۔ میں نے ہندوستان کی طرف سے تہنیت پیش کی۔ اس جشن کو یہاں عوام "عید" [illegible] کے نام سے مناتے ہیں۔ سمرقند (۲۵۰۰) سال قدیم شہر ہے۔ غالب کے باپ دادا یہیں سے ہندوستان آئے تھے۔ آج اس شہر کا بچہ بچہ اس تقریب میں حصہ لے رہا ہے۔ آج ہزاروں لوگوں نے علی شیر نوائی کے مقبرہ [illegible] دل آرام کو دیکھا [illegible] کہ میں سمرقند میں اس موقع پر موجود [illegible] تمہارا [illegible] پیار [illegible]

نصرو

اور حبیبہ کے لیے [illegible] مخدوم

کارڈ پر تیمور کے مقبرہ کی تصویر ہے

ڈیر نصرت پیارے   ہوٹل [illegible] (احا حبیبا)

ماسکو سے کل یہاں آیا۔ طبیعت ٹھیک ہو گئی تھی مگر یہاں کی آب و ہوا، اور میزبان نوازی نے ساری تکان دور کر دی۔ میں چار دن تک [illegible] رہوں گا۔ اور پھر ماسکو سے دلّی اور دلّی سے حیدرآباد ۱۳ کو پہنچ جاؤں گا۔ سب کو سلام و پیار۔ میرے میزبان [illegible] بہت بڑے شاعر [illegible] ہیں بہت خوب انسان ہیں۔

تمہارا مخدوم

نصرت پیارے

باکو پہنچ چکا ہوں۔ اچھا شہر ہے۔ فارسی زبان چل جاتی ہے۔ بحر خضر کے کنارہ پر تیل کا شہر ہے اب ایک اور شہر دیکھنے جا رہا ہوں بس کا نام [illegible] ہے۔ سب چھوٹے بڑوں کو پیار اور سلام۔ یہاں دو تین دن ٹھہر کر [illegible] جاؤں گا۔

مخدوم

ڈیر نصرت، پیار۔

کامریڈ راج ۹/ اگست کو حیدرآباد پہنچ رہے ہیں (صبح) چیک اور دوسرے کاغذات تم اُن سے لے لو۔ عابد روڈ پر جانکی پرشاد جوہری کی دکان پر جاکے سنبھالو، یہ دکان بول چند کے سامنے ہے، دس دن انہیں سے قرض لے لو، یہ سب پیسے لوٹا دینے کے ہیں۔ سامان خرید لو۔ نصیرہ کا علاج معقول ہونا چاہیے معلوم نہیں تم کس سے علاج کروا رہے ہو۔

میں دلی سے پنجاب، یوپی، بہار اور بنگال ہوتے ہوئے گھر آؤں گا۔ آتے آتے شاید ۲۰، ۲۲ ہو جائے۔ تم گھر کے معاملات پر دھیان دو۔

نصیرہ کو پیار۔ ظفر اور منی کو بھی پیار۔ تمہارا

مخدوم

مسٹر محمد مہدی سابق جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ پیام کے نام

ڈیر مہدی پیار　　حیدرآباد　۱۹-۱۱-۶۶ء

بھوک ہڑتال ۱۱ دن کے بعد، ۹ نومبر کو ختم ہوئی۔ سات دن اسپتال میں رہنے کے بعد اب گھر آگیا ہوں۔ آہستہ آہستہ مجھ پر باب رزق کھلتا جا رہا ہے۔ تبدیلی نے فاقہ کو دربار الٰہی کا ایک وسیلہ بنا دیا ہے۔ مجھے تو آدھی دنوں میں آنکھ بند کرنے پر ایسے رنگ، بدن اور چہرے دکھائی دیئے جو اس "عالم مجاز" میں کبھی نہیں دیکھے، اور کھانے کے لیے ایسی ایسی نعمتیں ملیں اس دار محن میں جن کے انسان صرف خواب دیکھتا ہے۔ کلیجی کی "بوراں لوری" کبھی آپ نے نام سنا ہے؟ کھانا تو کیا۔ میں نے دوران فاقہ خواب میں کھائی ہے۔ جب خیال آیا کہ ارے میں تو برت پر ہوں تو آنکھ کھل گئی۔ فاقہ مصوروں کے لیے مفید ہوگا۔ برت کا فائدہ اگر ہوا تو اتنا کہ چاول کی قیمت جو بڑھنے والی تھی نہ بڑھ سکی بس۔ زہرہ کو سلام بچوں کو پیار۔ جنرل کونسل کے لیے نہیں آرہا ہوں۔ ابھی آرام لینا ہے۔

مخدوم

ڈیر مہدی، پیار　　باکو ۴/ اکتوبر ۶۸ء

دلی سے ۱۹/ کو نکل کر ہم کابل میں اٹک گئے ۲۳ تک کوئی جہاز نہیں تھا جو ہمیں تاشقند لے جائے افرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں ہم دیر سے پہنچے مگر نوائی کے جشن میں شریک رہے۔ افغانستان میں قیام دلچسپ رہا۔ برج کمار پہلے سکریٹری اور سفیر ہند اشوک مہتا اور ان کی بیگمات نے بڑی مہمان نوازی کی۔ کابل، پغمان، جلال آباد، باوا

اور کارگہ جیسے مقامات دیکھے۔ کابل کا میوزیم قیمتی نوادرات کا خزانہ ہے۔

تاشقند اور سمرقند کا موسم دلی کا سا تھا۔ کانفرنس اور نوائی کا جشن بڑی دھوم دھام سے قومی پیمانے پر منایا گیا۔ ماسکو پہنچے تو رنگین خزاں نے استقبال کیا۔ کبھی دھوپ، کبھی ہلکی پھوار، سرد ہوائیں، ہر جگہ راتوں میں محفلیں جمیں، غزلوں نے اچھا اثر چھوڑا، نظمیں بھی ہوئیں مگر کم۔

افرو ایشیائی کانفرنس کی تقریب میں یہاں ایک مجموعہ کلام چھپا ہے جو (۲۵۰) نظموں پر مشتمل ہے جس میں افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے (۶۰) شاعروں کی نظموں کے علاوہ اور اس وقت کے شاعروں کا کلام بھی شامل ہے۔ بہت بڑا گرانقدر کارنامہ ہے۔ میں نے تجویز رکھی ہے کہ وہ اسے انگریزی میں شائع کریں تاکہ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو سکے۔ کاش ہم لوگ ہندوستان میں ایسی کتاب چھاپ سکنے کے قابل ہو سکتے۔ انگریزی میں شائع ہونے کے بعد غور کیا جا سکتا ہے۔

آج میں باکو میں ہوں۔ کل تبلیسی چلا جاؤں گا، وہاں سے ماسکو، ۱۰ر کو اکتوبر کی صبح دلی رہوں گا اور ۱۳ر کو حیدرآباد۔ جو بھی پروگرام بناؤ ان تاریخوں کا خیال رکھنا۔

باکو کی راتیں بڑی حسین ہیں۔ یہ شہر تیل، آگ اور ہوا کا شہر ہے۔ لوگ خوبصورت اور سنجیدہ ہیں۔ آج گیارہ بجے یہاں کے ادیبوں، دوسرے احباب سے ملوں گا۔ شہر اور میوزیم کی سیر ہوگی۔ موسم خوشگوار ہے، نہ تاشقند کی سی گرمی نہ ماسکو کی سردی، بین بین معتدل ہے۔

مسعود پراگ گئے ہوئے تھے۔ کل کچھ دیر کے لیے ان سے ماسکو میں ملاقات ہوئی۔ پراگ کی صورت حال پر باتیں ہوئیں۔ احباب کو سلام کہنا۔ حبیب حسن معلوم نہیں ابھی تک دلی رہیں گے یا نہیں؟ زہرہ اور بچوں کو پیار

تمہارا۔ مخدوم

"بساطِ رقص" کے بعد کی نظمیں

مخدوم محی الدین

اپنا شہر

یہ شہر اپنا
عجب شہر ہے کہ

راتوں میں
سڑک پہ چلیے تو
سرگوشیاں سی کرتا ہے
وہ لا کے زخم دکھاتا ہے
راز دل کی طرح

دریچے بند
گلی چپ
نڈھال دیواریں
کواڑ مہر بہ لب
گھروں میں میتیں ٹھہری ہوئی ہیں برسوں سے
کرایہ پر

(۳ ستمبر ۱۹۶۷)

مخدوم محی الدین

جز تری آنکھوں کے

جز تری آنکھوں کے کن آنکھوں نے
لطف کا ہاتھ رکھا درد کی پیشانی پر
پیار کی آنکھوں سے آنسو پونچھے

نرم میال
لمحۂ وصل کی مانند

دل و جاں میں اترتی ہی چلی جاتی ہیں
ہجر کی شام ہے ڈھل جائے گی
وصل کا لمحہ گریزاں ہے نکل جائے گا
تیرے رخسار کی ڈھلکی ہوئی رنگین شفق

اور بھی سرخ ہوئی
تیرے سلگے ہوئے ہونٹوں کے دہکتے شعلے

اور بھی تیز ہوئے
کب چھلک جائے نہ جانے تری لبریز وفا آنکھوں سے
مہر کی مے

کب نکل آئے ترے پیار کا چاند
توڑ دے حلقۂ زنجیر شب و روز
کہ یہ سلسلہ کرب و الم ختم تو ہو
اور ہو جائے جنوں آوارہ
تو مرے حلقۂ آغوش میں آ

(۱۰ ردسمبر ۱۹۶۷ء)

مخدوم محی الدین

درّۂ موت

(ویٹ نام کے پس منظر میں)

اس تباہی کی گذرگاہ سے چل
یہ کوئی رستہ ہے جس رستے میں
نہ کوئی پھول نہ پتّہ
نہ کوئی پیڑ نہ پھل
ایک ہیولائے سیاہ
حدّ نظر
جس طرف دیکھو کھنڈر
موت کا درّہ ہے تیزی سے گزر
شام کا چہرہ ہے خوں آلودہ
اور خورشید ہوا قلزم ظلمات میں حل
دشت خاموشی سے جب گذروگے
کئی امیدوں کی لاشوں سے گذرنا ہوگا

اس اندھیرے سے نکل
دامن کوہ میں چھپ جاب اترآئی ہے رات
اور رستوں سے چمٹ جاتی ہے
سائے مٹ جاتے ہیں
پھر وہی کرب و کراہ
پھر وہی نالہ و شیون
وہی چیخیں وہی آہ
چیخیں اس زخمی گم گشتہ کی
زندگانی نے جسے کاٹ لیا
ایسے اجڑے ہوئے رستے سے ذرا آگے چل

(یکم مئی ۶۸ ء)

مخدوم محی الدین

مارٹن لوتھر کنگ

یہ قتل قتل کسی ایک آدمی کا نہیں
یہ قتل حق کا مساوات کا شرافت کا
یہ قتل علم کا حکمت کا آدمیت کا
یہ قتل حلم و مروت کا خاکساری کا
یہ قتل ظلم رسیدوں کی غم گساری کا
یہ قتل ایک کا دو کا نہیں ہزار کا ہے
خدا کا قتل ہے قدرت کے شاہکار کا قتل
یہ شام شامِ غریباں ہے صبح صبحِ حسین
یہ قتل قتلِ مسیحا، یہ قتل قتلِ حسین

وہ ہاتھ آج بھی موجود و کارفرما ہے
وہ ہاتھ جس نے پلایا کسی کو زہر کا جام
وہ ہاتھ جس نے چڑھایا کسی کو سولی پر
وہ ہاتھ وادیِ سینا میں ویت نام میں ہے
ہر ایک گردنِ مینا ہر ایک جام میں ہے
"کمینہ شرطِ وفا ترکِ سربود حافظ
برو گذار تو ایں کار بر نمی آید"

(مئی ۱۹۶۸)

مخدوم محی الدین

رات کے بارہ بجے

رات کے کوئی بارہ بجے ہوں گے
گرمی ہے
سڑکوں پر کوئی نہیں
بوڑھا درویش بھی جا چکا ہے
اس جذامی بھکارن کی گاڑی
بھی نظروں سے اوجھل ہے
راستہ صاف ہے
ہوٹلوں سے نکلتی ہوئی لڑکیاں ہیں
نہ لڑکوں کے جھرمٹ
منڈیروں پہ
دل میں
نہ دل کا دھڑکنا
نہ بھوکی نگاہیں
نہ سیٹی

قہقہے
گردنیں تانے
چشم براہ ہیں
کوئی گزرے تو گل ہو کے
ان کا تماشہ کریں

دھیرے دھیرے
سرکتے سرکتے

وہ فٹ پاتھ سے
کوئی چکرتی ہریالی پر آ جمے ہیں
چاند نکلا
تو چاروں نے چلّایا

لو چاند نکلا
(ماسٹک منہ سے نکلا ہوا جیسے پیلا پیپ زدہ)
تو چاروں نے دیکھا کر

وہ چاند ٹھہرا ہے [illegible]
اب [illegible] سب کے دلوں میں مچلنے لگا
ان کی [illegible] لیے چاند کے
جیسے [illegible] ٹھہرایا
[illegible] کے سارے
[illegible]
جوشِ وحشت کے عالم میں
شیشے سے [illegible] تھی
[illegible] ناخنوں [illegible]
قہقہے مار کر
پی گئے
اور [illegible] کے
ایک دو تھے کہ جو بہت دیر تک
چیختے بھی رہے

قہقہے مار رہے تھے
ناچتے ناچتے
چاروں رونے لگے
اور ہر ایک کے منہ سے نکلا
ماں !
ماں یاد آتی ہے، جانتا ہوں
میں نے تورات و انجیل و قرآن میں
یرمیہ، ہاجرہ اور یعقوب
کے کرب کی داستانیں پڑھی ہیں
ان کا رونا سنا ہے
اور رویا بھی ہوں
آج بھی رو رہا ہوں

(۱۵ مئی ۶۸ء)

مخدوم محی الدین

غزل

گلوئے یزداں میں نوکِ سناں بھی ٹوٹی ہے
کشاکشِ دلِ پیغمبراں بھی ٹوٹی ہے

سراب ہے کہ حقیقت نظارہ ہے کہ فریب
یقیں بھی ٹوٹا ہے، طرزِ گماں بھی ٹوٹی ہے

سیاستِ دلِ آئینہ تیرہ جبیں تو تھی
سیاستِ دلِ آہنگراں بھی ٹوٹی ہے

اندھیری رات کا یہ خیمہ بانِ سناٹا
گلوں کی سانس رگِ گلستاں بھی ٹوٹی ہے

تمھارے جسم کا سورج جہاں جہاں ٹوٹا
وہیں وہیں میری زنجیرِ جاں بھی ٹوٹی ہے

مکاں میں عالمِ امکاں وجود میں آئیں
نظر نظر ہی رہی ہے جہاں بھی ٹوٹی ہے

شکست و ریختِ زمانے کی خوب ہے مخدوم
خودی تو ٹوٹی تھی منعیٔ خوئے بتاں بھی ٹوٹی ہے

(۲۰ اگست ۱۹۶۸ء)

مخدوم محی الدین

ملاقات

نوٹ :- ماسکو سے دلّی آتے ہوئے کوہ ہندوکش پر سے جب ہوائی جہاز ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی سے گزرتا ہے تو صبح کے ساڑھے تین چار بجے ایک جانب رات اور دوسری جانب صبح کی شفق بیک وقت دکھائی دیتی ہیں

میں آفتاب پی گیا ہوں
سانس اور تیز ہو گئی ہے
تشنگی ہی تشنگی
تو سرزمینِ عطر و نور سے اُتر کے
آفتاب بن کے آ گئی
بلور کا جہاز
ابر سے پرے
رواں، رواں
ادھر اندھیری رات ہے
شفق کی تیغ سرخ اس طرف

تمام آسماں
شہاب ہی شہاب ہے
گلال ہی گلال ہے
ستارہ ہم نشین ہے
ماہ ہم نفس ہے
سازِ جاں نواز ساتھ ہے
گریزپا سفر کا
ایک ایک پل ہے
جاوداں
الٰہی یہ سفر کبھی نہ ختم ہو

(۲۱ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

مخدوم محی الدین

غالب

(۲۲ فروری ۶۹ء کو رات میں لال قلعہ کے مشاعرہ میں پڑھی گئی)

تم جو آجاؤ دلّی میں
خود کو پاؤ گے اجنبی کی طرح
تم پھرو گے بھٹکتے رستوں میں
ایک بے چہرہ زندگی کی طرح

دل ہے دستِ خسیس کی مانند
رات ہے دامنِ تہی کی طرح
پنجۂ زرگری و زرگیری
عام ہے رسمِ رہزنی کی طرح

آج ہر میکدہ میں ہے کہرام
ہر گلی ہے تری گلی کی طرح
وہ زباں جس کا نام ہے اردو
اٹھ نہ جائے کہیں خوشی کی طرح

ہم زباں کچھ ادھر ادھر سائے
نظر آئیں گے آدمی کی طرح
تم تھے اپنی شکست کی آواز
آج سب چپ ہیں منصفی کی طرح

آ رہی ہے ندا مناروں سے
ایک گمنام روشنی کی طرح
اس اندھیرے میں اک روپہلی لکیر
ایک آوازِ حق نبی کی طرح

مخدوم محی الدین

واسوخت

تیری دیواروں کے سایوں نے نہیں پہچانا
ایک ایسا بھی زمانہ ہے کہ اب آنے لگا
خوشنما یادوں کے ڈھانچوں سے ملاقات ہوئی
چہرہ ٹوٹا ہوا آئینہ نظر آنے لگا
تیری باتیں تھیں کہ پھولوں کی مہکتی چہکار
جی تری باتوں سے کیا بات ہے گھبرانے لگا
گیان سے دھیان سے پوجا تھا کسی صورت کو
آنکھ کھولی تو کوئی اور نظر آنے لگا
دل کے تہہ خانوں میں باروت بچھی ہو جیسے
ایک اک سانس پہ دل ہے کہ سلگ جانے لگا
دشت کے پھولوں نے جب پاس بٹھایا ہم کو
عرش ٹوٹا ہوا تارہ سا نظر آنے لگا
اس جنوں کو ذرا دھوپ سے روکو مخدوم
چھوڑ کر چھاؤں گُلِ تر کی کہاں جانے لگا

(یکم مئی ۶۹ء)

مخدوم محی الدین

رُت

دل کا سامان اٹھاؤ
جان کو نیلام کرو
اور چلو
درد کا چاند سرِ شام نکل آئے گا
کیا مداوا ہے ؟
چلو درد پیو
چاند کو پیمانہ بناؤ
رُت کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے کالے آنسو
رُت سے کہہ دو
کہ وہ پھر آئے
چلو
اس گُل اندام کی چاہت میں بھی کیا کیا نہ ہوا
درد پیدا ہوا درماں کوئی پیدا نہ ہوا

(۱۹ مئی ۶۹ء)

کسب اور جہد کا پیغام سنایا جس نے

موہبت حسین

مخدوم۔ جو زندہ ہے

کامریڈ مخدوم انتقال کر گئے ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ زندگی پانے والی ہر چیز ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اپنے جیتے جی وہ نقش چھوڑ جاتی ہے، تب اس تک ہی اور موت کا ہاتھ اس تک نہیں پہونچ سکتا۔ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ محبت، موت سے کچھ کم طاقتور نہیں ہوتی۔ جہاں تک مخدوم کا تعلق ہے اسی سے نہیں بلکہ اس کی تخلیقات سے بھی بے پناہ محبت کی جاتی رہی۔ آدمی کے فنا ہو جانے اور بقائے دوام حاصل کر لینے کا راز یہی ہے کہ، جو لوگ، اپنے کام، اور اپنی حیات کا رشتہ لاکھوں عوام سے جوڑ نہیں پاتے وہ مر جاتے ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی زندگی اور جن کے کام کی جڑیں، عوام میں پیوست ہوتی ہیں۔ انہیں کوئی طاقت مار نہیں سکتی۔ ایسی شخصیتیں تاریخ کا ایک جزو بن جاتی ہیں۔ وہ لاکھوں عوام کی زندگی کے رواں دواں اور حیات بخش دہارے کا ساتھ بھی دیتے ہیں اور اپنی انفرادیت کو باقی اور بے قرار بھی رکھتے ہیں۔

۴۲-۴۳-۱۹ء کی طلبا کی تحریک میں حصہ لینے والوں نے، غالباً مخدوم کی انقلابی نظموں کے توسط سے ان کا نام سنا تھا ان میں سے کئی ایک کو انہیں دیکھنے کا موقعہ نہ ملا ہوگا لیکن یہ بالکل درست ہے کہ، ان سبھوں نے، مخدوم کی نظمیں کسی نہ کسی صورت میں پڑھیں، اور اس احساس کے ساتھ پڑھیں کہ، وہ کمیونسٹ بنتے جا رہے ہیں۔ انھیں نظموں سے جھانکنے والی اس کی ذہنی دیانت، غربت اور زیادتیوں کے خلاف اس کا غم و غصہ مستقبل کے خوش آئند ہونے پر بھروسہ اور یہ ایقان کہ، زندگی کو زیادہ بہتر اور خوبصورت بنایا جا سکتا ہے۔ جانے کتنے لوگوں کو، کمیونزم سے قریب تر کرنے کا سبب بنا ہے۔ ان گنت مرد اور عورتیں نسلاً بعد نسلاً، ایسے ہی تصورات سے متاثر ہوتی رہیں گی اور جو لوگ ان تصورات کی صورت گری کے لیئے جد و جہد کرینگے وہ اندازہ کر سکیں گے کہ جب تک ظلم اور ناانصافیوں سے لڑنے کا حوصلہ، ایک چنگاری کی صورت میں، چمکتا دمکتا رہے گا۔ اس وقت تک ان کی زندگی موت کی دسترس سے باہر رہے گی ...... ہر دور میں ایسے لوگوں کے لیئے، مخدوم، ایک مینار نور اور سرچشمہ وجدان بنے رہیں گے۔ اگر کوئی آدمی پورے دس برس تک مخدوم کو نہ دیکھنے کے باوجود، اسے اپنے آپ سے قریب محسوس کرتا رہا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے دل میں

جنھیں اس سے ملاقات کا موقع نہ ملا ہو۔ قربت کا یہ احساس پیدا نہ ہو سکے، بہر حال مخدوم کی یاد ایک لامتناہی سلسلہ کی شکل اختیار کرے گی جو ہر نسل کو متاثر کرتی رہے گی۔

کسی انسان کا اس طرح لازوال اور لافانی بن جانا، دراصل ایک مخصوص اہمیت کی نمائندگی کرنا ہے۔ صرف ایسے ہی لوگ جو اپنے عہد کے صحیح معنوں میں نمائندے ہوں، جن کے کان سنتے ہوں لمحہ وقت کے قدموں کی چاپ سن سکیں ..... اور اس چاپ سے اپنے عصر کے لاکھوں لوگوں کو روشناس کرانے کی صلاحیت کے حامل ہوں وہی، حیات بعد الموت پاتے ہیں۔ وقت پر تسخیر پانا بھی ان ہی کے بس کی بات ہوتا ہے۔

ایسی زندگی اور اس قسم کی تحریری تخلیقات کے تعلق سے یہ تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی بندھی ٹکی نوعیت کی ہوتی ہیں اور اکثر پروپگنڈہ سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ بلاشبہ یہ اندیشہ لگا رہتا ہے لیکن دانشور تو وہی ہوتا ہے جو نہ صرف جدوجہد کا ایک جزو بن جاتا ہے، بلکہ تحریک جدوجہد کو بھی لازوال بنا دیتا ہے۔ ایسے دانشور مر نہیں سکتے۔ اور مخدوم، بالکل اسی قسم کا دانشور تھا۔

ادبی حقائق کے بھرپور شعور اور اپنی صلاحیتوں کے ٹھیک ٹھیک اندازہ کے بعد ہی، اس نے ایک سرگرم ٹریڈ یونینسٹ اور کمیونسٹ رہتے ہوئے بھی، اپنی مشق سخن جاری رکھی۔ اور اس طرح، شاعری اور اپنے پسندیدہ سیاسی فلسفہ کے خوشگوار امتزاج سے، اپنی شخصیت کو ہشت پہلو بنایا۔ شاید یوں شاعری اور کمیونزم میں کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں کا امتزاج ہونا بھی مشکل ہے۔ ایسے کتنے ہی شاعر دیکھنے میں آئے جنھوں نے سرگرم کمیونسٹ سے اپنی شعوری زندگی کا آغاز کیا لیکن جلد ہی، ایسے شاعر کہلائے جانے لگے جو کسی وقت کمیونسٹ تھے۔ انہوں نے یا تو صرف الفاظ کی شاعری کی تخلیق کی یا پھر ناگوار حد تک موضوعاتی بن گئے۔ کچھ تو ایسے بھی نکلے جنھوں نے غیر منصفانہ ماحول سے مفاہمت کے پیشکش کو قبول کر لیا۔ اور ان کے برخلاف چند لوگوں نے شاعری چھوڑ دی اور محض سیاسی کارکن بن گئے۔ سب عزت و احترام کے مستحق ضرور ہیں لیکن ان پر رحم اس لیئے آتا ہے کہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ اور شاعری اور سیاست کا خوشگوار امتزاج عطا کرنے میں ناکام رہے۔

مخدوم کی انفرادیت یہ تھی کہ انہوں نے شاعری اور سیاست میں توازن برقرار رکھا۔ وہ ایک عملی کمیونسٹ اور ایک باعمل شاعر بنے رہے۔ ان پر مختلف سمتوں سے کافی دباؤ پڑا تاکہ وہ دونوں ہی سے کسی ایک سے دستبردار ہو جائیں۔ لیکن وہ بیک وقت شاعر اور سیاسی قائد بنے رہے۔ مخدوم اسی امتزاج و ہم آہنگی کا نام تھا۔ اگر کچھ لوگ، انہیں صرف ان کی شاعری کی بہت سی باتیں یاد رکھیں گے تو ہم اس اعتبار سے خوش نصیب ہیں کہ ہمیں ان کی شاعری اور سیاست دونوں ہی، سے اکتساب فیض کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ ہم نے تو انہیں، شاعر اور سیاست داں کے ملے جلے روپ میں دیکھا ہے۔

۱۹۵۴ء میں، جامع مسجد دہلی کے علاقہ میں منعقدہ ایک جلسہ میں مخدوم کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اور یہ بھی ایک

عجیب اتفاق ہے کہ، میں نے جامع مسجد دہلی کے قریب ہی کے ایک ہسپتال میں، انھیں موت اور زندگی کی کشمکش میں الجھا ہوا دیکھا۔ میرے لیئے یہ نظارہ، بالکل غیر متوقعہ تھا۔ کیوں کہ میں نے یہی سمجھا تھا کہ موت کا ٹھنڈا ہاتھ مخدوم کے حلق تک پہونچ ہی نہیں سکتا۔ مخدوم سے ایک اور ملاقات کی یاد کو بھی میں فراموش نہیں کرسکتا۔ ان کی موت سے چند گھنٹوں پہلے ہم وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس کے لان پر بیٹھے مسز گیری کی کامیابی پر مسرت کا اظہار کررہے تھے۔ دونوں ہی موقعوں پر کتنے ہی لوگوں نے مخدوم سے نظم سنانے کی خواہش کی۔ لیکن دونوں ہی دفعہ، مخدوم نے اس خواہش کی تکمیل نہیں کی۔ وہ اسی وقت کوئی نظم لکھتے اور سنایا کرتے تھے، جب کہ شاعرانہ وجدان خود ہی متحرک اور مائل بہ عمل ہوتا۔ وہ صرف تخلیق کے دباؤ کے آگے جھک جاتے تھے۔ داد و تحسین کی انہیں کوئی ہوس تھی، اور نہ صرف اس کے لیئے کوئی نظم لکھا یا سنایا کرتے تھے۔ جو لوگ صحیح معنوں میں شاعر ہوتے ہیں وہ صرف تخلیق کے دباؤ ہی کو محسوس کرتے ہیں مخدوم، کسی فرمائش کی تکمیل سے انکار کے سلسلہ میں بھی فرمائش کرنے والوں کے جذبات کو مجروح نہ ہونے دیتے۔ وہ کسی پرانی گھسی پٹی نظم کے اعادہ کو پسند نہیں کرتے، بلکہ کوشش کرتے کہ، فرمائش کرنے والوں کو بالکل نئی چیز دیں

میں نے جن دو ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے ان کی بہت سی باتیں مجھے آج بھی یاد آرہی ہیں۔ ان کی گرمجوشی نے، مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ سنہ ۱۹۵۴ء میں، جب وہ مجھ سے پہلی بار ملے تو انہوں نے شرارت سے بھرے ہوئے بعض ایسے الفاظ کہے، کہ قہقہوں ایک فوارہ سا پھوٹ پڑا۔ یہ الفاظ زندگی اور اس کی مسرتوں کی نمائندگی کررہے تھے۔ اس جذبہ اخلاص کی، جو ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے قریب کردیتا ہے۔ مجھ پر ہی کیا موقوف ہے، مخدوم، ہر شخص سے اس طرح کھلے دل کے ساتھ ملا کرتے تھے۔ ٹیلیفون پر بات چیت کے دوران بھی وہ اپنی روایتی بذلہ سنجی اور زندہ دلی کو برقرار رکھتے۔ آخری ملاقات کا وہ منظر بھی، میرے ذہن میں تازہ ہے، جب وہ اپنے ایک ہاتھ میں جلتا ہوا چار مینار سگریٹ تھامے اپنے لطیفے اور دلچسپ باتوں کی داد حاصل کرنے کے لیئے، دوسرے ہاتھ سے بار بار مصافحہ کررہے تھے۔ شرکائے محفل میں سے ہر ایک سے انھوں نے قہقہوں کی بارش سی برسادی۔ ان کی زندگی اور ان کے کردار کا یہ پہلو بھی منفرد تھا کہ وہ، اپنے مخاطب کے دل میں بھی زندگی کی حرارت، اور جینے کی چاہت پیدا کر دیتے۔

مجھے سنہ ۱۹۶۲ء سے، ان کے بہت قریب رہ کر ان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ ہم دونوں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی سٹی کونسل کے رکن تھے۔ ان کے ساتھ رہ کر کام کرنے کا یہ تجربہ، میرے لیئے بیحد خوشگوار رہا۔ اور اسی کی بنا دپر میں کہہ سکتا ہوں کہ مخدوم میں وہ سب صلاحتیں موجود تھیں جو تجربہ کار انقلابیوں میں ہوا کرتی ہیں۔ وہ اصولوں کے سختی سے پابند رہتے۔ یہی نہیں بلکہ اس بات کا اندازہ بھی ان کے لیئے کچھ زیادہ مشکل نہ ہوتا کہ کسی خاص ماحول میں کامیابی سے اپنے مشن کو کس طرح آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ مخدوم یہ بھی اندازہ کرلیتے کہ کس طرح سے ماحول کو ہموار، اور محنت کش طبقات کے لیئے سازگار بنایا جاسکتا ہے۔

پارٹی کے لیئے وہ دور بڑا ہی [illegible] اختلافات [illegible] دن شدت پیدا ہوتی جارہی تھی۔

اور توقع کے مطابق نظریاتی اور سیاسی اختلافات کو، شخصیتوں سے وابستہ کیا جانے لگا تھا۔ نتیجتاً پارٹی کے طریقہ کار اور پارٹی کے ارکان کے رویہ میں، بڑا فرق پڑ گیا تھا۔ بلاخوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ، شہر حیدرآباد کے بعض سرکردہ کمیونسٹ قائدین اور سب سے زیادہ کامریڈ مخدوم کے غیر معمولی اثر کی بنا پر پارٹی کی شہر کمیٹی ان حالات سے، بڑی حد تک محفوظ رہی۔ عوام میں اس کی مقبولیت، اس کے تنظیمی دائرہ عمل، اور اس کے ارکان کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ کامریڈ مخدوم کو ان دنوں بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ تنظیمی کام انجام دینے پڑے جنھیں عام طور پر غیر شاعرانہ کہا جا سکتا ہے۔ انھیں پارٹی ورکرس کے آگے، پارٹی کے صحیح موقف کی وضاحت کرنی پڑتی جس کے متعلق مختلف گوشوں سے، دنیا بھر کی غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام غیر معمولی صبر و تحمل، اور بے مثال قوت استدلال کا طلب گار تھا۔ مخدوم کو اس زمانہ میں، کتنے ہی جلسوں کو وقفہ وقفہ سے مخاطب کرنا پڑتا۔ وہ تھکن اور بیزارگی کے اظہار کے بغیر، یہ اہم فریضہ انجام دیتے رہے۔ پارٹی میں پیدا ہو جانے والے اختلافات سے وہ بجد متاثر تھے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ، ان اختلافات کے بہت برے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انقلابیوں کی زندگی، ہمیشہ نشیب و فراز ہی کی نمائندگی کرتی ہے۔ انہیں لاتعداد ناکامیوں اور مایوسیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ مصائب و مشکلات کے ایسے دور میں ہر انقلابی کو اپنے مورچہ پر ڈٹے رہنا اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو روبہ عمل لانا چاہیئے۔

انقلابی زندگی کے ان تجربات ہی نے، مخدوم کی شاعری میں گہرائی، گیرائی اور سنجیدگی پیدا کی۔ ۱۹۶۵ء سے مخدوم کو مزید تنظیمی ذمہ داریاں قبول کرنی پڑیں جب کہ پارٹی کی حیدرآباد سٹی کونسل کے سکریٹری کے عہدہ پر ان کا چناؤ عمل میں آیا۔ انہوں نے اس حیثیت سے، پارٹی کے استحکام، سرکردہ قائدین کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے اور داخلی جدوجہد کے طویل دور سے بے عمل ہو جانے والے تنظیمی ڈھانچہ کو، عوامی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کے سلسلہ میں جو اہم خدمات انجام دیں انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

وہ اس تنظیمی ذمہ داری کو قبول کرنے میں ہچکچاتے رہے۔ ابتدا میں، انہوں نے اس سے بچنے کی بہت کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ ان پر پہلے ہی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ اور یوں بھی تنظیمی کام، انہیں کچھ زیادہ پسند نہیں۔ لیکن جب انھیں احساس ہو گیا کہ سکریٹری کے عہدہ کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تو انہوں نے اپنے روایتی خلوص کے ساتھ اسے قبول کر لیا۔ اور دو سال کے اندر ہی، شہر کمیٹی کو پارٹی کی ایک مثالی یونٹ بنا دیا۔ ان کی اس کامیابی کا راز یہ تھا کہ انہوں نے نہ صرف پارٹی ڈسپلن، اور اس کے قواعد و ضوابط کی سختی سے پابندی کی بلکہ دوسرے کامریڈز کے آگے اپنی مثال پیش کر کے، انہیں بھی، ڈسپلن کی پابندی اور محنت و خلوص سے پارٹی کے کام انجام دینے کا راستہ دکھایا۔ انہوں نے سمجھایا کہ صرف اسی طرح پارٹی کو ترقی کے راستہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے اور آپسی اختلافات کی یکسوئی کی کوئی صورت نکالی جا سکتی ہے۔

بظاہر یہ سارا کام معمولی اور آسان سا نظر آتا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس کے لئے غیر معمولی صلاحیت اور غیر معمولی خلوص درکار ہوتا ہے۔ توانائی، صبر و تحمل کے غیر معمولی مظاہرے، اور چھوٹی موٹی باتوں کو بھول جانے والے ظرف کے بغیر یہ سب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ کمیونسٹ باشعور ہونے کے ساتھ ساتھ نظریاتی وابستگی کے سلسلہ میں جذباتی بھی ہوتے ہیں۔ ان سب کے مختلف گروہوں کو، جو نظریاتی اساس پر ایک دوسرے سے کٹ گئے ہوں، دوبارہ متحد کرنا آسان نہیں۔ مخدوم اپنی متعدی مقناطیسیت اور جاذبیت کے ساتھ، اس امر کا اعتراف کیا کرتے تھے، ان کی یادداشت اور حافظہ کمزور ہے اپنی اس زود فراموشی کی دہائی وہ اس لیئے دیا کرتے کہ، ان کا مقابل ماضی میں ان سے کسی ناخوشگوار ملاقات اور بات چیت کے خیال سے، اظہار خیال میں، تکلف نہ کرے وہ بڑے خلوص سے کہتے کہ ماضی کو فراموش کر کے محض یہ سوچنا چاہیئے کہ فی الوقت کیا کرنا ہے۔

اختلافات کے اس نازک دور میں ان کی شاعرانہ افتادِ طبع کام آگئی چنانچہ انہوں نے سٹی کونسل کی عاملہ کا ایک اجلاس، گنڈی پیٹ کے پُر فضا اور خوبصورت ٹورسٹ بنگلہ میں طلب کیا تاکہ اجلاس کے دوران عاملہ کے ارکان کو ٹیلیفون کالس کا جواب دینا پڑے اور نہ مقررہ جلسوں میں وقت پر پہونچنے کی کوئی فکر لاحق ہو۔ اس سے جو جلسے منعقد ہوا کرتے تھے، وہ ناخوشگوار حد تک طویل ہوتے اور اس کے ردعمل کے طور پر شرکائے جلسہ کی تنک مزاجی میں اضافہ ہوتا، گنڈی پیٹ کے نظر نواز ماحول میں، یہ صورتحال پیش نہ آئی اور کسی دباؤ اور ناخوشگواری کے بغیر بہت سے نزاعی مسائل طے پا گئے۔ اس دن کے بعد سے، حیدرآباد کے کامریڈ راکثر گنڈی پیٹ کے جادو کا ذکر کرنے لگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جادو گنڈی پیٹ کا نہیں، بلکہ اس شخص کا تھا جس نے اس جگہ کو، مصالحت ومفاہمت کا مرکز بنانے کے لیئے انتھک کوشش کی تھی۔ یہ جادو تو مخدوم کا تھا!

مجھے ایک اور واقعہ بھی یاد آرہا ہے۔ دسمبر ۱۹۶۸ء کی بات ہے کہ پارٹی کے شعبہ تعلیم کی جانب سے "جدلیاتی مادیت" کے موضوع پر لکچرز کے لیئے ایک مرکزی اسکول کا سمینار کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اور ۶۱ سالہ مخدوم اپنے ۴۳ سالہ پارٹی تجربہ کے ساتھ اس اسکول کے طالب علموں کے گروہ میں شامل ہوگئے۔ یہ وہی مخدوم تھے جنہیں کئی کلاسس لینے کا موقع ملا تھا۔ اور جو پارٹی کے قائدین میں بہت اونچا مقام حاصل کر چکے تھے۔ انہیں اپنے بازو بٹھا کر "حیات" کے بعض نئے کامریڈز کو جو حیرت ہوئی تھی، اسے میں فراموش نہیں کر سکتا ان کو یہ توقع تھی کہ مخدوم بھی انہیں اس موضوع پر کوئی لکچر دیں گے، ان کی توقعات کے برخلاف مخدوم نے اس اسکول کا طالب علم بننا گوارا کیا اور بڑے فاضل ذوق طالب علم بنے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو وقت کی سختی سے پابندی پر مجبور کرتے۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ خواہ کوئی طالب علم موجود رہے نہ رہے کلاس بہرحال صبح کے ۹ بجے سے شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ٹھیک ۹ بجے سارے طالب علم آجاتے اور کلاس شروع ہو جاتی، مخدوم بڑی محنت سے نوٹ لیتے، سوالات پوچھتے اور اسلامی فلسفہ اپنے عبور اور تبحر کی بنا پر مباحث میں ایک نئی جان ڈال دیتے سب سے دلچسپ بات تو یہ تھی کہ وہ، ان کلاسس سے بڑے مسرور و مطمئن ہوئے۔

ان کا کہنا تھا کہ ان کی وجہ سے خود ان کی معلومات میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر ادھیکاری کے سوائے، اس اسکول کے تمام اساتذہ، مخدوم کے جونیر تھے، تاہم انہوں نے، اس موضوع پر کے گہرے مطالعہ سے، بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ مخدوم کو ان کی کدوکاوش کا نہ صرف اعتراف تھا بلکہ وہ ان کے ممنون تھے کہ انہوں نے اپنے مطالعہ کا کچھ حصہ لیکچرز کی صورت میں انہیں بھی عطا کیا۔ اسکول کے دوران کسی مرحلہ پر بھی انہوں نے محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ سینیر کامریڈ ہیں۔ آخری کلاس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا "موہیت تم نے جمالیات کے موضوع کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ جب تاریخی مادیت کے موضوع پر دوبارہ کلاسوں کا انعقاد عمل میں لایا جائے تو اس پر ضرور بحث ہونی چاہئیے اس کے لئے میں خود تیاری کروں گا لیکن جہاں تک دوسرے موضوعات و مسائل کا تعلق ہے میں ایک طالب علم ہی کی حیثیت سے کلاسوں میں شریک ہونگا"

آج مخدوم ہم میں نہیں ہیں — اور میں سوچ رہا ہوں کہ اب پارٹی اسکول میں جمالیات یا تاریخی مادیت کے موضوع پر کون لیکچر دے گا۔

کامریڈ روی نارائن ریڈی سے ایک انٹرویو

مخدوم ـــــ یادوں کے جھروکے سے

بھونگیر سے چھ آٹھ میل دور، ایک چھوٹا سا گاؤں ہے "بولے پلی" ایک چھوٹی سی پایاب ندی کو پار کرکے۔ اس کنارہ پر پہونچ جائیے تو، ایک اونچی عمارت نظر آئے گی۔ اس کا بالائی حصہ جلا ہوا ہے ...... اور اسی مکان میں۔ روی نارائن ریڈی رہتے ہیں۔ حیدرآباد میں کمیونسٹ تحریک کے اولین معمار، کامریڈ ریڈی نے، نظام کے دور میں، تلنگانہ کے کسانوں کی مسلح جدوجہد کی، رہنمائی کرکے، سابق ریاست حیدرآباد کے کسانوں اور محنت کش طبقات کے دلوں پر قابو پالیا تھا۔ ان کی مقبولیت و ہردلعزیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پہلے عام چناؤ میں، انہوں نے ضلع نلگنڈہ کی ایک پارلیمانی نشست کے کمیونسٹ اُمیدوار کی حیثیت سے، جتنے ووٹ لیئے، اتنے ووٹ، ہندوستان کے وزیر اعظم، اور انتہائی محبوب قائد جواہر لال نہرو کو بھی نہیں مل سکے تھے۔

کامریڈز ایسوسی ایشن کے قیام کے دور ہی سے، وہ، حیدرآباد کے اس ترقی پسند گروہ کے ساتھ رہے جس نے، بعد میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ کامریڈ ریڈی، اب کافی ضعیف ہوگئے ہیں۔ انہیں اعصابی عارضہ لاحق ہوگیا ہے۔ اور اپنے معالجین کے مشورہ پر ہی وہ بولے پلی کے آبائی مکان ہی میں آرام لے رہے ہیں۔ مخدوم سے، ان کی محبت و وابستگی کا عالم یہ ہے کہ مخدوم کے انتقال کے بعد جب انھیں خبر ملی کہ، جناب عابد علیخان اڈیٹر سیاست کی صدارت میں، مخدوم کا تعزیتی جلسہ بھونگیر میں منعقد ہورہا ہے تو ان ہی کے الفاظ میں انھیں عارضہ اور بیماری کا خیال نہیں رہا۔ اور اکوسپرم کی ایک گولی کھاکر وہ اپنے بھتیجہ کی اسکوٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے اور ۶، ۸ میل کے فاصلہ طے کرکے بھونگیر پہونچ گئے۔ یہی نہیں بلکہ یادِ نغم اپنے مرحوم دوست کو خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔

"نیا آدم"، کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کی اس تجویز پر کہ، اس کا مخدوم نمبر کامریڈ ریڈی کے تاثرات سے خالی نہیں ہونا چاہیے، میں اور امجد باغی نے ایک دن کامریڈ ریڈی کو ان کے مکان ہی پر جالیا۔ کامریڈ ریڈی، شرٹ اور دھوتی میں ملبوس اپنے بھتیجہ کے دیوان خانہ میں، ایک ایزی چیر پر دراز تھے، دروازہ پر پہونچ کر، جب ہم نے اندر آنے کی اجازت طلب کی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا "پہچانا نہیں آپ نے! ...... میں احسن علی مرزا ہوں ...... کامریڈ ابراہیم اور کامریڈ مانک لال گپتا کا ساتھی"۔۔ ... ریڈی صاحب ایک لمحہ کیلئے خاموش رہے اور پھر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کے لیئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا"

یہ ہیں کامریڈ امجد باغی " میں نے ایڈیٹر نیا آدم کا تعارف کرایا " ہم نیا آدم کا مخدوم نمبر نکال رہے ہیں ۔ اور اسی سلسلہ میں آپ سے تھوڑا سا وقت لینا چاہتے ہیں " ۔ کامریڈ ریڈی پھر اپنی کرسی پر دراز ہو گئے ۔ ۔ ۔ اور میری آنکھوں کے آگے [illegible] کے دن ابھرنے لگے ۔ آندھرا مہاسبھا کا وہ تاریخی اجلاس جس میں ہم نے، مخدوم کی مشہور نظم "مستقبل" کو آندھرا مہاسبھا [illegible] کا ترانہ بنا دیا تھا ۔ جس کی قیادت کامریڈ روی نارائن ریڈی کر رہے تھے، غالباً یہ اجلاس ورنگل [illegible] میں منعقد ہوا تھا ۔ کامریڈ ریڈی کی قیادت میں ہم نوجوانوں کی ٹولی، ہر صبح جلسہ گاہ کے احاطہ میں یہ نظم [illegible] گشت کرتی تھی ۔

چلا آ رہا ہے ۔ چلا آ رہا ہے
اڑاتا ہوا پرچم زندگانی
سناتا ہوا عہد نو کی کہانی
غلاموں کو آزادیاں دے رہا ہے
جوانوں سے قربانیاں لے رہا ہے
چلا آ رہا ہے ۔ چلا آ رہا ہے

اس اجلاس میں، کامریڈ روی نارائن ریڈی نے ایک قرارداد پیش کی تھی، جس کے ذریعہ اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ دوسری عالمی جنگ کو عوامی جنگ قرار دیا جانا چاہیئے ۔ مجھے اب تو یاد نہیں آ رہا ہے کہ اس قرارداد کا انجام کیا ہوا لیکن بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس اجلاس میں آندھرا مہاسبھا کے " اولڈ گارڈ " کو پہلی مرتبہ ایک نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا اور مہاسبھا کے بعض ممتاز لیڈروں کے لب و لہجہ میں منافقانہ رنگ جھلکنے لگا تھا ۔ میں نے کامریڈ ریڈی سے مخدوم پر بات چیت کا آغاز ان ہی دنوں کے تذکرہ سے کیا ۔ ماضی کے ان دنوں کی یاد سے کامریڈ ریڈی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی کھیلنے لگی ۔ انہوں نے اس ڈنڈے کو کرسی سے دور رکھ دیا ، جو ان کے لیئے عصائے پیری کا کام دے رہا ہے ۔..... چلا آ رہا ہے ۔ چلا آ رہا ہے .... کامریڈ ریڈی گنگنانے لگے ۔ لیکن کہا ! جس شخص نے خوش آئند مستقبل کے آنے کی نوید سنائی تھی وہ ہی مٹی کے ڈھیر میں دبا پڑا ہے ۔

کامریڈ ریڈی کی پرسکوت ٹوٹی ۔ ۔ ۔ میں نے پوچھا ، کامریڈ ! آپ کو مخدوم سے اپنی پہلی ملاقات کا خیال تو ہوگا ہی ۔ ریڈی اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے بولے ! پہلی ؟ دوسری ، تیسری ! بھئی، مخدوم کو میں کب سے جانتا ہوں ، یہ بتانا میرے بس کی بات نہیں ۔ مجھے تو اب محسوس ہوتا ہے جیسے ہم دونوں کا جنم ایک ہی دن اور ایک ہی گھر میں ہوا تھا ۔ میں زمانہ طالب علمی ہی میں مخدوم کا نام سننے لگا تھا ۔ اس کی پہلی نظم " پیلا دوشالہ " کے چرچے ، جامعہ عثمانیہ سے نکلکر ، نظام کالج میں پہونچ گئے ۔ اور پھر کسی دن، سروجنی دیوی کے مکان پر ، مس پدماجا نائیڈو نے ، ایک دبلے پتلے سانولے سے نوجوان ــــــــ سے میرا تعارف کرایا ــ یہ ہیں مسٹر مخدوم " اور اس رسمی ملاقات کے بعد تو ہم ایک دوسرے کے بہت پرانے دوست بن گئے "

کامریڈ ریڈی گذرے ہوئے دنوں کو اپنے ذہن سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے ، دو پیام اور اس کے ایڈیٹر "

قاضی عبدالغفار صاحب، نئی نسل کے ذہن و افکار کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ اور اسی لئے انہوں نے اس دور کی نئی نسل کا اعتماد و احترام بھی حاصل کر لیا تھا۔ میری بھی قاضی صاحب سے اکثر ملاقاتیں ہوتیں۔ ان کے شریک مدیر جناب سبط حسن تو میرے اور مخدوم کے بے تکلف دوست تھے۔ سبطے کی محفل یاراں میں ہم بھی، اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کے امکانات کا جائزہ لیتے۔ شاعر، ادیب، صحافی، سیاسی کارکن، سبھی قسم کے لوگ سبطے اور مخدوم کے دوستوں میں شامل تھے۔ ان ہی بیٹھکوں میں میں نے مخدوم کی لاتعداد نظمیں سنیں۔ انتظار... آتش کدہ،... یہ جنگ ہے جنگ آزادی... اور نہ جانے کیا کیا۔ مخدوم اپنے مسحور کن ترنم سے، محفل پر چھا جاتے اور سننے والوں کے دلوں میں، نئی زندگی کی ایک تڑپ کر دیتے"

ہم نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا "تلنگانہ کی مسلح تحریک کے دوران بھی، کیا آپ ان کے ساتھ رہتے تھے؟" کامریڈ ریڈی نے جواب دیا "روپوشی کے دور میں اگرچہ کہ مجھے ان کے ساتھ ایک ہی شیلٹر میں رہنے کا موقعہ نہیں ملا۔ لیکن کوریئر کے ذریعہ ہمارا ایک دوسرے سے ربط تو ضرور برقرار رہتا تھا۔ میں نے اس پر آشوب دور میں بھی، مخدوم کو کبھی مایوس اور دل شکستہ نہیں پایا، وہ تو ہر امتحانی مرحلہ پر عزم و ہمت کی ایک مشعل بن جاتے۔ رضاکاروں نے جب بولے پلی کے اسی مکان کو نذر آتش کر دیا اور میرے افراد خاندان کے تحفظ کا نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا، تو میں پریشان ہو گیا تھا۔ لیکن اس دور میں بھی مخدوم سے ملاقاتیں، میرا حوصلہ بڑھاتیں۔ روپوشی کے دور میں، ہم نے کتنے ہی بہروپ بدلے.... نام بدلے، لباس بدلے...... وقت پڑتا تو اپنی پہچان کا کوئی [illegible] طریقہ! ہمیں اپنی عادتوں کو بالائے طاق رکھ کر، اپنے ہمدردوں اور پناہ دینے والوں کے رنگ میں رنگ جانا پڑتا تھا۔ اور اس معاملہ میں مخدوم کو کمال حاصل تھا۔ کیا مجال جو وہ کسی کی نظر میں کھٹک جائیں۔"

کامریڈ ریڈی نے، تھوڑی دیر کے توقف کے بعد اپنے بھتیجہ کو آواز دی۔ غالباً انہیں اب یہ احساس ہوا تھا کہ، انہوں نے دور سے آئے ہوئے مہمانوں کی تواضع نہیں کی۔ بھتیجہ آیا! تو بولے کیوں نہ ہم چائے پی لیں۔... ان کے ایماء پر چائے آئی۔ ریڈی صاحب چائے کا ایک ایک گھونٹ پی کر مخدوم کی باتیں پھر سنانے لگے۔ "مخدوم کو میں نے ہر روپ میں۔ بالکل ایک سا پایا۔ کھرا، سچا اور مخلص! میری رائے تو یہ ہے کہ پسماندہ اور پچھڑے ہوئے طبقات کی دردمندی کے جذبہ ہی نے اس کی شاعری کو جنم دیا تھا۔ اور یہی جذبہ اسے کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ کرنے کا سبب بنا۔ اس نے اپنے خلوص و ایثار سے تلنگانہ کے کسانوں میں اتنی ہر دلعزیزی حاصل کر لی کہ آج تک بھی اس علاقہ کے گاؤں گاؤں میں اس کا نام سنا جاتا ہے۔ ہم نے پارٹی کے اعلیٰ سطح کے مشاورتی اداروں میں بھی ایک ساتھ کام کیا ہے اور مجھے اندازہ ہے کہ مخدوم نظریاتی اعتبار سے بھی کمیونزم پر کتنا ایقان رکھتے تھے۔ ایسے آدمی کبھی کبھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

کامریڈ ریڈی ہماری طویل بات چیت سے تھک گئے تھے۔ اور ہم نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ انہیں زیادہ تکلیف دینا مناسب نہیں۔ وہ دیوان خانہ سے ہم کو اپنے ساتھ لے کر اپنی خواب گاہ کی طرف چلے اور وہاں پھر ایک بار چائے کا دور چلا...... ریڈی صاحب سے ہم نے اجازت چاہی تو وہ ہمیں چھوڑنے کے لئے دور تک چلے آئے اور راستہ بھر، مخدوم کی نظم 'مستقبل' کا یہ مصرعہ ورد کرتے رہے۔

"چلا آرہا ہے...... چلا آرہا ہے"

لیکن چند ہی قدم طے کرنے کے بعد کہنے لگے "مستقبل تو چلا آرہا ہے، لیکن تابناک اور خوش آیند مستقبل کے خواب دیکھنے والا مخدوم ہی چلا گیا ہے ...... ہم بھی چراغ سحری ہیں جانے کب بجھ جائیں .... لیکن مخدوم مخدوم تھا۔ اس کی ہمسری کون کر سکے گا۔

جب ہم رخصت ہونے کے لیئے اٹھ کھڑے ہوئے تو ردی نارائن ریڈی نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے پرجوش لہجہ میں کہا کہ مخدوم کے پاس مکان کہاں سے آئے گا کیونکہ وہ خود لوگوں میں زمین اور مکان تقسیم کرتا پھرتا تھا۔ چونکہ مخدوم نے ۱۲ لاکھ ایکڑ زمین کسانوں میں تقسیم کی۔

جس شخص نے ہاوزنگ بورڈ کی کرسی پر بیٹھ کر بھی اپنے لیئے ایک جھونپڑی تک نہیں بنائی۔ اس کا خلوص کوئی کہاں سے لائے گا۔

امجد باغی

مخدوم — ایک شخصیت ایک انجمن

سینکڑوں لاکھوں قدم سینکڑوں لاکھوں عوام کا ایک ہجوم ایک سانولے سلونے دبلے پتلے انسان کے پیچھے چل رہا تھا، یہ انسان کون ہے کیا نام ہے اس کا، اس کا مذہب کیا ہے، اس کی زبان کیا ہے، اس کا وطن کہاں ہے؟

"جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لیے" یہ کون آرہا ہے، کہاں سے آرہا ہے، کیوں آرہا ہے، اس کے پیچھے یہ ہجوم یہ بھیڑ، ان کے مصروف قدم، ان کے ماتھے پہ تردد کے نقوش۔ یہ دیوانہ تو ہو نہیں سکتا، پاگل بھی نہیں ہے یہ دیوانوں اور پاگلوں کے پیچھے تو جذبات سے عاری چند شریر اور آوارہ بچے ہاتھوں میں پتھر لیے ہوتے ہیں، یہ فرشتہ تو نہیں ہے، نہیں یہ فرشتہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ فرشتہ کا کوئی چہرہ نہیں ہوتا کوئی بدن نہیں ہوتا کوئی لباس نہیں ہوتا، کوئی وطن نہیں ہوتا کوئی زبان نہیں ہوتی۔ وہ انسان کے ساتھ نہیں ہوتا مگر ہوتا ہے پھر اس کے پیچھے یہ غریب اور مفلوک الحال مزدور، کسان کلرک ادیب اور ہر طبقہ اور ہر جاتی کے لوگ کیوں چل رہے ہیں یہ کوئی بڑا اور عظیم انسان ہوگا، بہت بڑا فنکار ہوگا، بہت بڑا شاعر ہوگا اور یہ تو بہت بڑا رہنما ہی ہو سکتا ہے جو اپنے ساتھ "حیات و کائنات" لے کر چل رہا ہے، آخر حیدرآباد میں یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ زور و شور یہ ہاہمی، یہ چہل پہل کیوں ہے، یہ کس کا استقبال ہے کہ سارا شہر سڑکوں پر ٹوٹ پڑ رہا ہے۔

آج سے ٹھیک ۲۱ برس پہلے کی بات ہے ۱۹۵۲ء کا زمانہ تھا اس وقت میں بھی ۱۷ یا ۱۸ سال کا تھا، گویا لڑکپن تھا اور میں اپنے لڑکپن میں مست تھا، دنیا سے لاپرواہ، ذمہ داریوں سے نا آشنا، بے فکر خوش تھا، ماں باپ کی غربت و افلاس اور تنگ دستی کا احساس کیے بغیر خوب کھانا، خوب کھیلنا، خوب سینما دیکھنا اور موقع بے موقع شرارتیں کرنا یہی سب کچھ تو ہوتا ہے لڑکپن میں۔

مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس دن شہر میں اور خاص طور پر دیوان دیوڑھی میں کیا ہونے والا تھا نہ اس کا علم تھا کہ میری زندگی میں بھی اس دن کوئی ہنگامہ، کوئی فتنہ، کوئی طوفان کھڑا ہوگا اور میں یوں اچانک سنجیدہ اور جہاندیدہ بن جاؤں گا جیسے میں اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔

وہ دن جو آج مجھے یاد نہیں ہے لیکن اتنا خیال ضرور ہے کہ رات کے ۸، ۹ بجے ہوں گے شہر کے سارے راستے دیوان ڈیوڑھی پر ختم ہو رہے تھے۔ دیوان ڈیوڑھی کے علاوہ گلزار حوض، پتھر گٹی، ہائیکورٹ روڈ اور نیا پل پر تل دھرنے جگہ نہ تھی۔

حیدرآباد فرخندہ بنیاد تو بادشاہوں اور بزرگان دین سے عبارت ہے لیکن اس شخص نے تو اپنے استقبال میں تو اپنے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ چار مینار نے یوں تو ہزاروں خیر مقدمی جلوس اور مظاہرے دیکھے ہیں لیکن یہ خیر مقدمی جلوس اور جلسہ ہر اعتبار سے مثالی اور تاریخی تھا۔ حیدرآباد کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، ہجوم میں سے کسی نے سب کو متوجہ کیا کہ ع "وہ دیکھو شفق کی پیٹھ کے پیچھے سے آ رہا ہے قمر" اور لوگوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیا، لوگوں کی نگاہیں مخدوم کی طرف اٹھیں، وہی انسان جو دبلا پتلا ہے، سانولا سلونا ہے ہر طرف نور کی چادر بچھاتا ہوا آ رہا ہے، لوگ خوشی میں پاگل ہوئے جا رہے تھے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے، ایک دوسرے کو ہوا میں اچھال رہے تھے، ناچ رہے تھے، جھوم جھوم کر ناچ رہے تھے۔ مخدوم محی الدین زندہ باد، شیر تلنگانہ زندہ باد کے نعروں سے محل لرز رہے تھے۔

میں بھی اس بھیڑ میں جگہ بناتا ہوا کسی نہ کسی طرح دیوان ڈیوڑھی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میں اپنی اس حرکت کو لوگوں کا کرم سمجھتا ہوں کہ انھوں نے مجھے بچہ جان کر جگہ دی۔ اب اسٹیج سامنے تھا۔ اسٹیج کے اطراف کارکنوں کا ہالہ تھا اسٹیج پر سفید ساڑی میں ملبوس ایک دبلی پتلی خاتون مسز ارونا آصف علی جو جنگ آزادی کے سپاہیوں میں سے ایک تھیں کھڑی تھیں ان کے دائیں بائیں، وی نارائن ریڈی، ارٹلہ لکشمی نرسمہا ریڈی، بدم یلا ریڈی، ارٹلہ راجیندر ریڈی، چندر گپت چودھری، جے سوریا نائیڈو، ستی نارائن ریڈی اور درمیان میں وہی دبلے پتلے سانولے سلونے مخدوم اپنی مخصوص اور دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے تھے۔

مخدوم اسی دن اپنے ساتھیوں کے ساتھ کانگریس سرکار کی جیل سے رہا ہوئے تھے۔ ان پر اور ان کے ساتھیوں پر ہر دو حکومتوں کے سنگین الزامات تھے کہ انھوں نے حیدرآباد دکن میں غریبوں، مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور درمیانی طبقے کے لوگوں کو بیدار کیا۔ انہیں اونچا اٹھایا، ان کی یونینیں بنائیں اور انھیں ہر دو حکومتوں کے خلاف صف آرا کیا۔ ایک اور سنگین الزام ان تمام پر یہ تھا کہ انھوں نے ریاست حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی تھی جس نے نظام کی مطلق العنان حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، جس نے نظام وقت کی چولیں ڈھیلی کر دی تھیں، جس نے ساری ریاست میں بہت بڑا طوفان برپا کر کے بادشاہت کے فولادی محل میں شگاف ڈال دیا تھا جس نے بعد میں کانگریس سرکار کی موافق جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور زمیندارانہ پالیسیوں کے خلاف تلنگانہ میں ہتھیار بند لڑائی منظم کی۔

جے سوریا نائیڈو جو پی ڈی ایف کے صدر تھے عوام کے بے پناہ اور یادگار ہجوم کو دیکھ کر فرط مسرت میں دو چار لفظ بھی ادا نہیں کر سکے بیٹھ گئے۔

مخدوم گرج رہے تھے ؎ زلزلو آؤ، دہکتے ہوئے لاوؤ آؤ
بجلیو آؤ، گرجدار گھٹاؤ آؤ

آندھیو آؤ، جہنّم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

جلسہ برخواست ہو چکا تھا، لوگ مخدوم کے گن گاتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو رہے تھے۔ سڑکوں، گلی کوچوں میں لوگوں کی ٹولیاں مخدوم کی روپوشی کے زمانے کے کارناموں کو گنوا رہی تھیں کہ کس طرح مخدوم نے سات سال تک نظام کی پولیس اور کانگریس سرکار کی پولیس اور فوج کی آنکھ میں دھول جھونکتے ہوئے اپنے مشن کو آگے بڑھایا۔ ہر شخص کی زبان پر مخدوم ہی کا نام تھا، مخدوم ہی کا تذکرہ تھا۔ میں بھی تازہ تازہ جلسہ سے نکلا تھا، جسم میں تقریروں کی گرمی تھی ایک ولولہ ایک جوش، ایک جذبہ اور ایک عزم لیے گھر واپس ہو گیا لیکن رات بھر سو نہ سکا، لاکھ لاکھ جتن کیے نیند کو نہیں آنا تھا نہیں آئی کروٹیں بدل بدل کر صبح کی۔

میں مخدوم کی طرف کھنچ رہا تھا یا مخدوم میری طرف میں نہیں جانتا صرف اتنا جانتا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے کیونکہ مخدوم مجھے ہی نہیں بلکہ میری ہی طرح کے ہزاروں نوجوانوں کو آنے والے خطرات سے خبردار کر رہے تھے کہ سنبھلو ــ

ایسی آندھیاں آنے کو ہیں بدبخت عالم میں
نفس کا ذکر کیا سارا چمن اڑ جانے والا ہے

یہاں میں ایک ایسے جلوس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خالص میری ذات سے وابستہ ہے ان ہی دنوں یہ جلوس تاریخی چارمینار سے نکالا گیا تھا جب کہ میں نے بغیر علیک سلیک اور بغیر جان پہچان کے مخدوم سے کچھ کہا تھا اور مخدوم نے مسکراتے ہوئے مجھے جواب بھی دیا تھا۔ اس جلوس میں میں بھی شامل ہو گیا تھا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور ایک چبوترے پر کھڑا جلوس کا نظارہ کر رہا تھا۔

مخدوم کی عوام سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ لوگ مخدوم کی قدم قدم پر گل پوشی کر رہے تھے۔ عوام کے بے پناہ ہجوم نے منتظمین جلوس کے سارے انتظامات کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ لوگوں نے انھیں اپنے بے خلوص و محبت کے اظہار کے طور پر اٹھا لیا اور ناچتے گاتے اور نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

فلک شگاف نعروں سے سارا شہر لرز رہا تھا۔ تاریخی چارمینار بھی اپنے اس پہلے شہری کے اعزاز میں نکالے گئے اس عظیم الشان جلوس کو دیکھ کر فرط مسرت سے جھوم جھوم گیا، اپنا دامن وا کر دیا اور جھک جھک کر مخدوم کی بلائیں لیں چارمینار جو چار سو برس سے کھڑا ہے اور اس نے کئی انقلاب دیکھے ہیں سلطنتوں کو بنتے بگڑتے دیکھا ہے، انسانوں کو دیکھا ہے اور ان کی چال کو دیکھا ہے ان میں اسے مکر و فریب کے جالوں کے سوا کچھ اور نظر نہیں آیا لیکن اس شخص نے چارمینار کی عظمت کو چار چاند لگا دیے، چارمینار کا نام روشن کر دیا۔ چارمینار اس پہلے شہری پر ناز کیوں نہ کرے

جس کا ہر قدم ایک انقلاب تھا۔ یہ بانکا سجیلا، سانولا سلونا انسان بھی تو چار مینار کی طرح بلند تھا پاکیزہ تھا۔
جلوس ہمارے سامنے سے گزر رہا تھا میں نے اپنا ہاتھ ہوا میں اچھالا، مخدوم مسکراتے ہوئے میری طرف آئے میں نے میرے دوست رشید غوری کی جانب سے پھولوں کی تلوار مخدوم صاحب کے مضبوط پنجہ میں یہ کہتے ہوئے تھمادی کہ مخدوم صاحب ظلم کی اس تلوار کو جو بظاہر پھولوں کی معلوم ہوتی ہے توڑ دو، اس سے ہیرے کا جگر بھی کٹتا ہے توڑ دو اس تلوار کو تاکہ پھر کوئی بچہ یتیم نہ ہونے پائے پھر کوئی غریب کسی ظالم کے ہاتھوں مارا نہ جائے، کوئی مجبور ستایا نہ جائے، پھر کسی غریب کا لہو ٹپکنے نہ پائے۔

مخدوم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا کہ ہاں میں نے بھی دیکھا ہے ؎

ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں میری چشمِ گنہگار نے یہ بھی دیکھا
خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمن جو جلا دے وہ شرارہ ہوں میں
برق بن کر بتِ ماضی کو جلانے دے مجھے
رسمِ کہنہ کو تہہ خاک ملانے دے مجھے
تفرقے مذہب و ملت کے مٹانے دے مجھے
خواب فردا کو بھی اب حال بنانے دے مجھے

یہ جلوس شاہ علی بنڈہ میں ایک عظیم الشان جلسہ عام میں تبدیل ہوگیا تھا۔ ہندوستان کے نامور شاعر علی سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری نے بھی کلام سنایا۔ سردار کہہ رہے تھے ؎

خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لیے

مجروح نے مشورہ دیا کہ : رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

مخدوم کہہ رہے تھے :۔ حرم کے دوش پہ قحبائے سیم و زر ہے سوار
سروں میں دین کا سودائے خام ہے اب تک
تو ہمات کا آدم غلام ہے اب تک
آج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں
خواجہ شہر ہے یوسف کے خریداروں میں

مخدوم پوچھ رہے تھے:۔

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا مجاہد نہ بنوں؟

اس لیے آؤ سے

اس زمینِ موت پرور د کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

یہی نہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز اور ہر وہ شے حاصل کر لینی چاہیے جس سے غریبوں کو محروم کر دیا جاتا ہے:۔

کھونک دو قصر کو گر کاشانہ نہیں
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا نہیں

آزادی کے بعد ہندوستان میں پہلی بار بالغ رائے دہی کی اساس پر انتخابات ہو رہے تھے۔ اس سے قبل ہندوستان جنت نشان انگریزوں کی غلامی میں تھا اس سے پہلے بھی ہندوستان میں فالص راجے مہاراجے، بادشاہ، شہنشاہ ہوا کرتے تھے، کوئی چیز عوام کی نہیں تھی، عوام کے پسینے اور لہو پر بھی ایک ہی شخص کا قبضہ ہوتا تھا، وہی سیاہ سفید کا مالک ہوتا تھا۔ اللہ کی یہ خاص مخلوق جن پر اولیاء اللہ اور فرشتوں کا سایہ ہوتا تھا اللہ ہی کے بے زبان مجبور بندوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتی، تخت و تاج کی سلامتی کی خاطر انہیں عمداً جاہل رکھتی، انھیں دیواروں میں زندہ چنوا دیا جاتا تھا جس کے نتیجہ کے طور پر ہندوستان میں انتشار پھیلتا جا رہا تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے اس انتشار کا استحصال کیا۔

انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے آیا اور ہندوستان کا مالک و مختار بن بیٹھا اور ہندوستان جنت نشان کو جہنم کے حوالے کر دیا۔ آخر کار ہندوستانی عوام نے مسلسل جد و جہد اور عظیم قربانیوں کے بعد ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرا لیا۔ اس سلسلے میں انتخابات ہو رہے تھے۔

مخدوم بھی حلقہ شاہ علی بنڈہ سے اسمبلی کے لیے اور شہر حیدرآباد سے پارلیمنٹ کے امیدوار تھے ہم لوگوں نے انتخابات کے دوران کھانا پینا حرام کر لیا تھا، ہر روز صبح ۶ بجے سے رات دیر گئے گھر گھر جا کر رائے عامہ کو ہموار کرتے، جلسوں جلوسوں کا اہتمام کرتے اور آدھی رات کے بعد اور صبح دس دس، بیس بیس کی ٹولیاں "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" کا ترانہ گاتے ہوئے نکلتیں۔ مخدوم ایک ایک دن میں کئی کئی گروپ میٹنگوں، جلسوں کو مخاطب کرتے عوام کے اصرار پر ایک ہی سانس میں چھ سات نظمیں سناتے، جلسوں میں جو ہار مخدوم کو پہنائے جاتے انھیں فروخت کر دیا جاتا تھا غالباً ایک ہار کو کسی عاشق مخدوم نے پانچسو روپے میں خریدا تھا۔

مخدوم پر کیا لکھا جائے، جتنا لکھا جائے کم ہے، زینت ساجدہ نے سچ ہی تو کہا ہے کہ لوگوں نے مخدوم کو ٹوٹ کر

پیار کیا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ لوگوں نے مخدوم کو ٹوٹ کر چاہا ہے، ٹوٹ کر پوجا کی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ مخدوم صاحب کو ان کی زندگی ہی میں بہت سا پیار ملا، حیدرآباد کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ لوگوں نے مخدوم کے سوا کسی اور کو اتنا چاہا ہو، کسی اور سے اتنا پیار اور پریم کیا ہو۔

یہ بات نہیں ہے کہ سرزمین دکن نے مخدوم کے سوا کسی اور کو پیدا ہی نہیں کیا، پیدا ہوئے ہیں، پیدا ہوتے رہیں گے رہبر، لیڈر، عالم، پنڈت، ادیب اور شاعر لیکن یہ سب اپنے اپنے فرقوں کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ میں یہاں کوئی امتیاز برتنا نہیں چاہتا لیکن جو بات سچ ہے، ایمانداری کے لئے حق کی ہے کہوں گا۔ مخدوم ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور پارسیوں کے ہی نمائندہ نہیں تھے بلکہ انھوں نے موجودہ سماج کی حد بندیوں کو توڑ کر اپنا رشتہ عالمی برادری سے منسلک کر لیا تھا وہ ایک ایسی جماعت سے وابستہ تھے جو دنیا میں امن، ترقی، خوشحالی اور سوشلزم پر ایقان رکھتی ہے۔

ایک شخص میں اتنی ساری خوبیوں کا مجتمع ہو جانا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔ جو عظیم رہنما، عظیم ٹریڈ یونینسٹ جو عظیم شاعر جو ایک اچھا دوست ہے، جو شفیق باپ اور ایک شریف اور ایک بے لوث شوہر ہے، جو بچوں میں بچے جیسے، عالموں میں عالم اور فلسفیوں میں فلسفی ہے۔ حیدرآباد ہی پر کیا منحصر ہے ہندوستان اور دنیا کی تاریخ میں ایسے بہت کم لوگ ملیں گے جن میں اتنی ساری خوبیاں جمع ہو گئی ہوں۔

شاعر اور ادیب لوگ گوشۂ تنہائی تلاش کرتا ہے اس طرح وہ تنہائی کا مرہون منت ہوتا ہے۔ وہ اس تنہائی میں بیٹھ کر لکھتا ہے، دنیا کو افکار دیتا ہے، انقلاب کی ترغیب دیتا ہے۔ ٹریڈ یونین لیڈر مزدوروں میں الجھا ہوا ہوتا ہے، سیاستداں ملکوں اور قوموں کی گتھیوں کو سلجھانے میں معروف دکھائی دیتا ہے۔ بہت کم ادیبوں اور شاعروں کو اپنے افکار اور اپنے انقلابی پیام کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ میں تلوار اور بندوق لے کر فرسودہ سماج کے خلاف بغاوت کرتا ہوا دیکھا گیا، مظلوموں اور مجبوروں کی قیادت کرتے ہوئے دیکھا گیا، مخدوم بھی ان ہی چند شاعروں میں سے ایک تھے جن کے ہاتھ میں قلم بھی تھا، تلوار بھی تھی، بندوق بھی تھی اور جھنڈا بھی تھا، جو لکھتے بھی تھے، لڑتے بھی تھے اور نعرے بھی لگاتے تھے۔

مخدوم نے ایک خوشحال مستقبل اور بہتر سماج کی تشکیل کے لیے قدم قدم پر فتنے جگائے وہ ساری زندگی قلم اور بندوق کے ذریعہ مجبوروں اور محکوموں کی حمایت میں جہاد کرتے رہے۔ انھوں نے ایک روشن مستقبل کی نشاندہی کی اور راستہ بھی دکھایا ؎

رات کے ہاتھ پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

یوں تو ہزاروں باتیں اور واقعات ایسے ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، اور لوگ لکھیں گے۔ میں یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس سے عورت کے تعلق سے مخدوم صاحب کے رویہ کا اظہار ہوتا ہے

آج سے تقریباً ۸ سال قبل نمائش میدان میں ایک کل ہند مشاعرہ ہوا تھا جس میں ہندوستان کے مشہور شعراء کے علاوہ مقامی شعراء بھی اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پندرہ ہزار کے لگ بھگ عوام اپنے پسندیدہ شعراء کا کلام سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ مینا قاضی کلام سنا رہی تھیں مجمع میں سے ایک شخص نے جو اگلی صف میں بیٹھا ہوا تھا سینماؤں کے تھرڈ کلاس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرح ایک وحشت ناک آواز نکالتے ہوئے جیسے ہی اسٹیج پر چڑھنے کی کوشش کی مخدوم صاحب جو اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے (عورت ذات پر یہ حملہ، یہ ہتک، یہ توہین برداشت نہیں کر سکے) اور فوری اطراف کے ماحول کا خیال کیے بغیر جس تیزی سے وہ اسٹیج پر چڑھ رہا تھا اتنی ہی پھرتی سے اسے لے کر زمین پر آ رہے۔ حالانکہ یہ فریضہ کوئی بھی انجام دے سکتا تھا۔ پولیس بھی تھی، کارکن بھی تھے اور منتظمین مشاعرہ بھی تھے۔ سب کے سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے اور ۵۹ سالہ مخدوم ہزاروں کے مجمع میں اس بدمعاش شخص کو مزہ چکھا گئے۔ چشم زدن میں یہ واقعہ ختم ہو گیا مخدوم صاحب کی حالت غیر تھی وہ اسٹیج کے سیدھے جانب اندھیرے میں کھڑے سگریٹ کے کش پر کش لے رہے تھے اور چہرے پر پورا جلال تھا۔

ان کا چہرہ اندھیرے میں چمک رہا تھا، ایسا غصہ اور ایسا جلال میں نے پہلی بار دیکھا وہ آج بھی میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔ اس ایک واقعہ سے ان کے کردار، ان کے خیالات کی پاکیزگی، ان کی نیک نفسی، ان کی انسان دوستی، ان کی شرافت کندن کی طرح ہمیشہ ہمیشہ چمکتی رہے گی۔

ایک اور واقعہ سے بھی مخدوم صاحب کی عظمت اور وطن دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ آج سے چند سال پہلے "یادِ سرورڈنڈا" کے سلسلہ میں ان ہی کی صدارت میں اردو ہال میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ ایک شاعر صاحب نے اپنے کلام میں ہندوستان کا مذاق اڑایا تھا۔ مخدوم صاحب یہ مذاق برداشت نہیں کر سکے اور شاعر صاحب کو بھرے مشاعرے میں ڈانٹتے ہوئے بیٹھ جانے کو کہا اور فوری اپنی مختصر سی تقریر میں ان خیالات کی مذمت کی۔

میں یہاں ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ معاملہ ہم سے متعلق ہے، پارٹی نے اردو ہفتہ وار "نیا آدم" نکالنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مخدوم صاحب بھی اس کے بورڈ کے ممبروں میں شامل تھے۔ میں اور کامریڈ جہاندار افسر پہلے شمارہ کا مکمل مسودہ لے کر مخدوم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب مخدوم صاحب مسودہ پڑھ رہے تھے تو ہم دونوں کے چہروں پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک رنگ جا رہا تھا۔ انھوں نے مضامین اور تبصروں پر تعمیری انداز میں تنقید کی یہ مسودہ مسترد ہو گیا دوسری مرتبہ میں احسن علی مرزا صاحب اور کامریڈ یوسف دوسرا مسودہ لے کر مخدوم صاحب کے پاس گئے، مخدوم صاحب مسودہ کو دیکھ رہے تھے اور ہم چور نگاہوں سے مخدوم صاحب کو گھور رہے تھے کہ وہ کن جملوں اور کن سطروں پر ہم پر برستے ہیں ہماری حالت اس طالب علم کی طرح تھی جسے کچھ بھی یاد نہیں لیکن امتحان گاہ میں بیٹھا ہوا ہے۔

مخدوم صاحب نے مسودوں کو گہری نگاہ سے دیکھا، ایک ایک لفظ، ایک ایک سطر میں بال کی کھال نکالی اور کہا یہ اردو کا اخبار ہے جناب، زبان انتہائی سلیس اور سادہ ہونی چاہیے، مضامین نکھرے ہوئے تعمیری ہونے چاہئیں چونکہ

ہم سب مخدوم صاحب کا احترام ہی نہیں کرتے بلکہ ڈرتے بھی تھے صرف ایک ہی مقام ایسا تھا جہاں ہم مخدوم صاحب سے قطعی نہیں ڈرتے تھے [illegible] پارٹی کے دفتروں کا پہلا شمارہ [illegible] ہفتہ وار نکالنا چاہتے تھے [illegible] نکل سکا ہم نے بورڈ کے ایک [illegible] ممبر کامریڈ کے ایل مہندرا کو جو حیدرآباد سٹی [illegible] پارٹی آف انڈیا کے سکریٹری بھی ہیں اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ اس سلسلے میں مخدوم صاحب سے بات کریں کہ ہم ہفتہ اخبار نکال لیا کریں گے اگر پیش نظر شمارہ میں کچھ غلطیاں ہوں تو وہ ہمیں بتائیں تاکہ آئندہ شمارہ میں ان باتوں کا خیال رکھا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ہر ہفتہ اخبار نکلتا رہا اور ہر ہفتہ ہم ان کے زرین مشوروں سے استفادہ کرتے رہے۔

مخدوم صاحب اس مرتبہ بھی دلی گئے یہ بات ہمارے لیے اور خود مخدوم صاحب کے لیے نئی نہیں تھی ہمیشہ ان کا ایک قدم سفر میں ہوتا، وہ ہمیشہ جاتے رہے ہیں، ریاست کے اندر، ریاست کے باہر، ہندوستان کی مختلف ریاستوں کو خود دلی کو اور دلی سے باہر بیرون ممالک کو، اس لیے اس مرتبہ ہم لوگوں نے [illegible] نے مخدوم صاحب کے دلی جانے پر کوئی نوٹس نہیں لیا اور نوٹس لیتے بھی کیسے اور کس کے متعلق سے ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مخدوم صاحب ہم سب کو اتنی جلد دھوکہ دے دیں گے۔

۲۵ اگست کو پارٹی آفس میں کامریڈ یوسف کی زبانی معلوم ہوا کہ مخدوم صاحب کے قلب پر ۲۴ اگست کی صبح کو حملہ ہوا ہے اور دواخانہ میں ہیں یہ حملہ مخدوم صاحب کے قلب پر نہیں ہوا تھا بلکہ ہم سب کی طرح کے ہزاروں لاکھوں لوگوں کے قلب پر حملہ تھا اگر کوئی دوسرا کہتا تو زبان کھینچ لیتا چونکہ یوسف نے کہا تھا اس لیے اس خبر کی صحت کو تسلیم کرنا پڑا، میری آنکھوں میں مخدوم صاحب گھوم گئے اور وہ تمام راستے جن پر مخدوم صاحب چلا کرتے تھے ایک ایک کر کے سامنے آتے گئے، وہ جلسے وہ جلوس وہ مشاعرے وہ محفلیں سامنے آ گئیں جن میں مخدوم صاحب کے نغمے گونجتے تھے ان کی مخصوص چال ان کی چال میں ان کا وہ بانکپن وہ متانت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرا دل نوچ رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے مخدوم صاحب کے گھر گیا، نصرت محی الدین اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ دلی جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے تھوڑی دیر بیٹھا باتیں کیں اور رخصت ہو گیا۔

اسی دن شام کو میں اور مرزا صاحب ان کے گھر گئے، گھر میں قدم رکھتے ہی مرزا صاحبہ نے ہم سے کہا کہ ابھی ابھی مہندرا صاحب کے پاس سے ایک آدمی آیا تھا (انہوں نے فوری پارٹی آفس بلایا ہے) مرزا صاحب، بھابی اور میں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہ گئے کیونکہ مخدوم صاحب کے قلب پر حملہ کی وحشتناک خبر صحیح مل چکی تھی اور ہم وقت سے پہلے مخدوم صاحب کے تعلق سے اپنے دل میں کوئی منحوس خیال لا بھی کیسے سکتے تھے کیونکہ ہم مخدوم کے جاننے والوں میں تھے اور ہمیں ایک طرح کا یقین تھا کہ مخدوم صاحب مر نہیں سکتے۔ ایسا ہو نہیں سکتا میں اور مرزا صاحب غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے پارٹی آفس پہنچے، پارٹی آفس کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ریاستی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری این راج شیکھر ریڈی کے ایل مہندرا، اننت رام کے علاوہ ٹریڈ یونینوں کے نمائندے بھی کثیر تعداد میں موجود تھے، ہر ایک دوسرے کی صورت

گھور رہا تھا، سب کے چہروں پر غم کے بادل چھا گئے تھے پھر بھی ہر ایک کو یقین تھا کہ مخدوم صاحب موت سے مقابلہ میں فتح یاب ہوں گے جس طرح وہ سات سال تک پولیس اور فوج سے مقابلہ کرتے رہے تھے موت کو بھی ایک خوبصورت چکمہ دے دیں گے کہ دلّی کے روزنامہ "پیٹریاٹ" کے توسط سے ٹیلی پرنٹر پر یہ اندوہناک خبر آئی کہ مخدوم صاحب چل بسے۔

پارٹی آفس میں کہرام مچ گیا اور پارٹی آفس ماتم کدہ بن گیا۔ ہر ایک دوسرے کو لپٹ لپٹ کر رو رہا تھا، ایک دوسرے سے سوال کر رہا تھا کہ کیا مخدوم صاحب چلے گئے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی بیٹی مس ستارا گوڑ کا رونا اسی لئے دیکھا نہ گیا جو ہر ایک سے پوچھ رہی تھیں مخدوم چاچا کہاں گئے۔ یوسف انتہائی ضبط کے باوجود برداشت نہ کر سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ مرزا صاحب جو بلڈ پریشر کے مریض ہیں مخدوم صاحب کا غم آنسوؤں کے سہارے برداشت کر سکے۔ میری آنکھ میں آنسو نہیں تھے جی بھر کے رونا چاہتا تھا لیکن آنسو خشک ہو چکے تھے۔

مخدوم صاحب کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی لوگ اس اندوہناک خبر کی صحت کے سلسلہ میں پارٹی آفس اخبارات کے دفاتر اور خود مخدوم صاحب کے گھر پر شخصی اور ٹیلیفون کے ذریعہ دریافت کر رہے تھے اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مخدوم صاحب جب ۱۹ اگست کو مودی نگر کے مشاعرے میں شرکت کے لیے ذریعہ طیارہ دلّی روانہ ہو رہے تھے۔ وہ دلّی میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی کی نیشنل کونسل کے اجلاسوں میں شرکت کے بعد یکم ستمبر کو واپس حیدرآباد ہونے والے تھے وہ مقررہ پروگرام سے قبل ہی روز منگل ۲۶ اگست کو دلّی سے ذریعہ طیارہ حیدرآباد واپس آئے لیکن اس مرتبہ ان کی آنکھ بند تھی، زبان بند تھی اور جسم میں حرارت نہیں تھی —

اکثر یوں ہوتا کہ جب بھی مخدوم صاحب دلّی یا بیرونِ ہندوستان کو جاتے تو طیارے سے جاتے اور ٹرین سے واپس ہوتے اور اس مرتبہ وہ طیارے سے گئے اور طیارے ہی سے واپس آ گئے ہمیشہ کے لیے۔

موت کا یہ آخری سفر جو انھوں نے ۱۹ اگست کو انجانے میں شروع کیا تھا اور دوستوں، ہمدردوں اور پارٹی ممبروں اور حیدرآبادیوں نے جسے انھیں انجانے میں رخصت کیا تھا ۲۶ اگست کو اختتام کو پہنچا۔ دونوں شہروں میں سناٹا چھا گیا تھا:

کوئی دھڑکن
نہ کوئی چاپ
نہ سنچل
نہ کوئی موج
نہ ہلچل
نہ سانس کی گرمی

۲۶ راگست کو سہ پہر مخدوم صاحب بذریعہ طیارہ حیدرآباد آئے لیکن وہ چل نہیں رہے تھے، وہ مسکرا نہیں رہے تھے دوست احباب اور ہزاروں چاہنے والوں کو ہاتھ ہوا میں لہرا کر سلام نہیں کر رہے تھے، مخدوم صاحب ساکت تھے، جامد تھے اور پتھر ہو گئے تھے۔

انھیں موت کے دوسرے دن بھی اپنے غمگساروں کا کوئی دکھ نہیں تھا، کوئی غم نہیں تھا، کوئی پاس و لحاظ نہیں تھا وہ اتنے سخت اور ناراض ہو جائیں گے ہمیں پتہ نہیں تھا۔ کوئی روتا ہے تو رونے دو، ہماری بلا سے ہم تو سو گئے ہیں ہمیں اب نہ جگاؤ، کیوں کسی کو تنگ کرتے ہو سوتے رہنے دو۔

بیگم مخدوم اور ان کے نوجوان لڑکے نصرت محی الدین اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جیسے ہی جہاز کے دروازے پر نمودار ہوئے تو ہزاروں لوگوں نے انھیں انھیں اشک بار آنکھوں سے دیکھا اور شور ماتم برپا ہو گیا۔ لوگوں نے جو غم میں ڈوبے ہوئے تھے مخدوم امر ہیں، مخدوم محی الدین زندہ باد کے نعرے لگائے۔ طیرانگاہ بیگم پیٹ نے بھی ایک عوامی رہنما کے انتقال پر اتنا ہجوم پہلی بار دیکھا ہے۔

راج سے ان کے دیرینہ رفیق بچھڑ گئے تھے، نصرت سے ان کے شفیق باپ جدا ہو گئے تھے، بیوی سے ان کے نیک نفس اور شریف شوہر چھین لیے گئے تھے اور ہم سے ہمارا پیارا رہنما چھین لیا گیا تھا۔ ان کے تابوت کو ایک ٹرک پر اٹھا کر اس پر لال جھنڈا اڑا دیا گیا تھا" سرخ پرچم اونچا رہو اور بغاوت زندہ باد"۔

میت کو گھر لایا گیا، جہاں پر ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے، غسل کے بعد جلوس جنازہ پارٹی آفس پہنچا، جہاں آندھرا پردیش ٹریڈ یونین کانگریس کے زیر اثر یونینوں نے عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔ مسٹر اے راملو جو آر ٹی سی ایمپلائز یونین کے سکریٹری ہیں جس کے صدر خود مخدوم صاحب تھے مخدوم صاحب کی نعش سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ عورتیں اور لڑکیاں جو مقتولوں سے ڈرتی ہیں وہ بھی نعش سے چمٹ کر رو رہی تھیں۔ عوام کے آخری دیدار کے لیے مخدوم صاحب کو نمائش کلب میں رکھا گیا تھا جہاں سبھی فرقے اور طبقات کے ہزاروں سوگواروں نے مخدوم صاحب کا آخری دیدار کیا اور وقت کی تنگی کے باعث ہزاروں لوگ اپنے رہنما کے آخری دیدار سے محروم ہو گئے۔

مسجد مالاکنٹہ میں نماز جنازہ کی ادائی کے بعد جلوس جنازہ مکرم جاہی روڈ نامپلی ہوتا ہوا درگاہ حضرت شاہ خاموش رح پہنچا جو مخدوم صاحب کی ابدی آرام گاہ تھی۔ طیران گاہ سے گھر تک، گھر سے پارٹی آفس، پارٹی آفس سے نمائش میدان، نمائش میدان سے مسجد مالاکنٹہ، مسجد مالاکنٹہ سے درگاہ شاہ خاموش رح تک ہزار نہیں لاکھوں سوگواروں نے اپنے محبوب رہنما، بانیٔ ٹریڈ یونین تحریک اور ایک عظیم شاعر کو سسکیوں، آہوں اور آنسوؤں کے درمیان رخصت کر دیا۔

جلوس جنازہ میں کون کون تھے اس کی کسی کو خبر نہ تھی، ہر ایک بغیر واقفیت کے سامنے والے سے پوچھ رہا تھا، سوال کر رہا تھا کہ کیا واقعی مخدوم صاحب چل بسے ہیں۔ کیا مخدوم صاحب کوئی نیا گل تو نہیں کھلا رہے ہیں، کوئی ڈرامہ تو نہیں کھیل رہے ہیں کہیں وہ ہم سب کو ایک حسین چکمہ تو نہیں دے رہے ہیں یہ بھی کوئی لطیفہ تو نہیں ہے کیونکہ

ان کی ساری زندگی ڈرامہ کھیلتے، پولیس اور فوج سے مقابلہ کرتے گزری ہے۔ ایسا مجمع لگانا توان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، ہمیشہ وہ اپنے اطراف ایک مجمع لگاتے رہے ہیں۔ ان کا نام ہی ایک مجمع، ایک ہجوم ہے، وہ جانِ جلسہ، جانِ جلوس جانِ محفل اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے آخر موت پر بھی ویسا ہی مجمع لگالیا۔ موت کے دوسرے دن بھی سینکڑوں لاکھوں قدم، سینکڑوں لاکھوں عوام کی قیادت کرتے ہوئے "شہرِ خموشاں" درگاہ حضرت شاہ خاموش کے میں جلسہ عام میں تبدیل ہو گئے۔

اس بار انھوں نے کوئی تقریر نہیں کی، وہ زندگی بھر تقریریں کرتے کرتے تھک چکے تھے اس لیے اپنے چاہنے والوں کو کچھ کہے بغیر رخصت کر دیا اور لوگوں نے اپنا ایک بے باک رہنما، ایک شریف دوست، ایک پاکیزہ انسان، ایک محب وطن اور ایک آتش نوا کو "شہرِ خموشاں" کے سپرد کر دیا۔

حیدرآباد نے ایک ہیرا پیدا کیا تھا جو ساری دنیا میں چمکا جس کی آب و تاب سے ارضِ دکن کو بھی چار چاند لگ گئے، افسوس ہم نے اس ہیرے اور اس پارس کو کھو دیا، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں دو ہی تو چیزیں مشہور تھیں ایک : چارمینار دوسرے مخدوم محی الدین۔

ایک بچہ جو ضلع میدک کے ایک گاؤں اندول میں پیدا ہوا حیدرآباد میں لکھ پڑھ کر جوان ہوا، ہندوستان کے افق پر چھا گیا اور ساری دنیا میں رہتی دنیا تک اپنا اور حیدرآباد کا چھوڑ گیا۔

جب مخدوم صاحب کو منوں مٹی کے تلے سپرد کر دیا گیا تو ان کے رفیق ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے مخدوم صاحب کی خبر کے سرہانے انتہائی غم میں ڈوب کر کہا:

> "مخدوم کلچر کے شیدائیوں کے لیے ایک میوزیم، دانشوروں کے لیے ایک لائبریری اور انقلابیوں کے لیے ایک اسلحہ خانہ تھے اور پتھر دل مخدوم صاحب : ہم سبھوں اور ہزاروں لاکھوں انسانوں کو روتا بلکتا اور تڑپتا ہوا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے محوِ خواب ہو گئے۔"

مخدوم صاحب کے لیے میرے پاس الفاظ ہیں نہ زبان، وہ ہمیشہ ان سب باتوں سے بے نیاز رہے ہیں اب بھی جب کہ انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا ہے یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے ہیں یہ تو کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا سو گیا ہے، انھیں اب نہ جگاؤ، ابھی آنکھ لگی ہے سو رہنے دو" سرہانے میر کے آہستہ بولو" کوئی ابھی ع

سو گیا ہے ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے"

آج ہم میں مخدوم صاحب نہیں ہیں، لیکن ان کی شخصیت، ان کی شاعری ان کا پیام ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ مخدوم صاحب نے اپنی بیوی بچوں کے لیے کوئی اثاثہ نہیں چھوڑا ہے، لیکن یہ اثاثہ

یہ یاد کیا کم ہے کہ لوگ انھیں رہتی دنیا تک یاد رکھیں گے۔ کیوں کہ مخدوم خود اپنی زبان میں ؎

ہزار رنگ ملے اک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غبارِ مشتِ بہار
ہوا ہے وادیِ جنّت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے، بہت دور جستجو بن کر

کے۔ ایل مہندرا

کامریڈ مخدوم

یہ مضمون دراصل مسٹر کے ایل مہندرا سے ایک طویل انٹرویو ہے۔ مہندرا صاحب مخدوم کے رفیق رزم و بزم دونوں ہی تھے اور اسی لیے اس مضمون میں "کامریڈ مخدوم" کی زندگی کے وہ پہلو بھی نمایاں کیے گئے ہیں جو دوسروں کے لیے بالکل نئے ہیں اور جن سے مخدوم کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ (ا، خ۔ م)

مخدوم سے میری شناسائی کے نقطۂ آغاز کا تعین میرے لیے ممکن نہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ گوشت پوست کے مخدوم سے متعارف ہونے سے بہت پہلے ہی ان کے گیت میرے کانوں میں گونجنے لگے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ میری عمر مشکل سے ۱۹، ۲۰ سال کی تھی اور میں اپنے پیدائشی شہر حیدرآباد سے بہت دور برن پور (اسنسول) کی "آئرن اسٹیل فیکٹری" کے ناؤنڈر سکریٹری کی حیثیت سے مزدوروں میں کام کر رہا تھا۔ میں نے مخدوم کو دیکھا نہ تھا۔ بنگال کے محنت کشوں کے جلسوں میں ان کی بعض نظمیں بالخصوص ان کا ترانہ "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" اردو سے قطعی ناواقف بنگالی طلباء لڑکوں، لڑکیوں اور فنکاروں کی زبان سے سن کر یکبارگی چونک جاتا تھا اور میری "انا" کو یک گونہ تسکین ہو جاتی تھی کہ میرے حیدرآباد کے ایک شاعر کے گیت ارض بنگال میں بھی گونج رہے ہیں۔ نذر الاسلام میرا پسندیدہ شاعر تھا۔ نذرل کی سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف بغاوت نے اس عہد کے مجھ جیسے کتنے ہی نوجوانوں کو انقلاب کے راستے پر لا ڈالا تھا اسی دور میں جب میں نے مخدوم کی نظمیں "حویلی" اور "مشرق" پڑھیں تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ مخدوم دراصل نذرل کا اردو قالب ہے۔ وہی جوش و خروش وہی غم و غصہ، فرسودگی اور روایات کے خرمن پر بجلی بن کر گرنے کا وہی انداز ـــ

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھو کھیلتی ہے سانس سینے میں مریض دق کو دیکھو
ایک ننگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

مخدوم کے اس آہنگ میں انقلابی جلال وجبروت کی جھلک نے میرا دامن دل پکڑ رکھا تھا۔ زمین موت پروردہ کو ڈھاکر نئی دنیا کو بسانے اور نئے آدم کی تخلیق کے رومانی تصور نے مخدوم کے ہم عصروں کو نہیں بلکہ اقبال و جوش کو بھی تخریب کی ثنا خوانی پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن مخدوم اس اعتبار سے منفرد نظر آتے تھے کہ ان کی خالص اردو نظموں کی صدائے بازگشت دور افتادہ بنگال کے علاوہ کیرالا کے اس علاقے میں بھی سُنی جاتی تھی جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی مخدوم کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کرنے والے پہلے ہی اسے ٹریڈ یونینسٹ، کمیونسٹ شاعر اور دانشور کے الگ الگ خانوں میں بانٹ لیں لیکن میرا ایقان تو یہ ہے کہ مخدوم کی متنوع شخصیت کی تعمیر میں جو عنصر سب سے زیادہ اہم رہا وہ مخدوم کی عوام اور محنت کش طبقات سے وابستگی ہے۔ یہی وابستگی ان کے لیے سرچشمۂ وجدان بن جاتی تھی اور اسی کے زیر اثر ان کے اشعار جنم لیا کرتے تھے ــــــ اور پھر زبان و بیان سے ماورا ہو کر سارے ہندوستان میں گونجنے لگتے کیرالا کا نہیں اردو داں مزدور بھی ان سے ملک سو اور حیدرآباد کے اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی طرح متاثر ہوتا۔ مخدوم کا منفرد فکر ان کی لاتعداد اور متنوع شخصیتوں کے خوشگوار امتزاج کی نمائندگی کرتا تھا۔

۱۹۴۳ء میں میمن سنگھ میں جو کسان کانفرنس منعقد ہوئی تھی مجھے بھی اس میں شرکت کا موقع ملا۔ اور کانفرنس میں مجھے اس وقت کے مشہور بنگالی گائک ہیمنت رائے کو مخدوم کی دو نظمیں سناتے دیکھ کر اچنبھا ہوا۔ "السلام اے سرخ جانبازانِ کیور" کی نظم نے تو کیرالا کے ان چار شہیدوں کی یاد میں ساری محفل کو اشک بار کر دیا جنھیں پھانسی دی گئی تھی۔ اور جن کی جانبازی ہی نے مخدوم سے یہ نظم کہلوائی تھی۔ اس اجتماع میں مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ حیدرآباد کے مزدوروں کے دکھ درد اور ان کی جدوجہد میں برابر کے شریک مخدوم نے اس زبان پر عبور حاصل کر لیا ہے جس کا ہندوستان کے دستور کے آٹھویں شیڈول میں تو کوئی تذکرہ نہیں لیکن جسے بجا طور پر ہندوستان کے مزدوروں، کسانوں اور دیگر محنت کش عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کی زبان کہا جا سکتا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مخدوم نے لکچراری کا عہدہ چھوڑ دیا تھا اور ٹریڈ یونین تحریکوں میں عملی حصہ لینے لگے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں نظام اسٹیٹ ریلوے کی ٹریڈ یونین کے اندر اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں تو مخدوم چین سے نہیں بیٹھ پاتے اور اس ٹریڈ یونین کے مختلف گروہوں میں سمجھوتہ اور مفاہمت کی سعی شروع کر دیتے ہیں اور انھی اس مہم میں بڑی حد تک کامیاب رہتے ہیں اور نتیجتاً نائب صدر ریلوے امپلائز یونین کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ چار مینار سگریٹ فیکٹری کی ہڑتال کے وقت بھی مخدوم اہم رول ادا کرتے ہیں۔ پرانی کرنی کے مزدوروں کو منظم کرنے میں بھی مخدوم اور راج نے نمایاں دلچسپی لی ــــ میں اس وقت تک بھی اسنسول ہی میں ٹریڈ یونین کا کام کر رہا تھا۔ انھی دنوں مجھے ٹائیفائڈ کا عارضہ لاحق ہو گیا اور میں آرام لینے کی خاطر اپنی والدہ کے پاس حیدرآباد آ گیا۔ کچھ دن اپنے گھر پر رہنے کے بعد میں نے سکندرآباد میں کمیونسٹ پارٹی کے کمیون کا رخ کیا

اور وہیں اپنا بستر کھول دیا۔ یہ کمیون گڈانس منڈی میں تھا اور یہیں پہلی مرتبہ مجھے شخصی طور پر مخدوم سے ملاقات کا موقع ملا۔ ہماری یہ ابتدائی ملاقات غیر محسوس انداز میں کچھ اس منزل پر پہنچ گئی کہ مخدوم اور راج کی کوشش مجھے بنگال سے حیدرآباد لانے کا سبب بنی جہاں آباد میں ان دنوں پہلی مرتبہ ایڈجوڈیکشن مشنری قائم ہوئی تھی اور پرانی گرپنی کا صنعتی تنازعہ اس سے رجوع کیا گیا تھا۔ اور سابق ریاست حیدرآباد کی مطلق العنان حکومت کے خلاف وسیع سے وسیع تر ہونے والی عوامی تحریکوں کے لیے مناسب و موزوں کارکنوں کی سخت ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی۔ مخدوم بھی اس دور میں کئی محاذوں پر ستیزہ کار تھے۔ ان کی معروفیتوں کا دائرہ پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ عوامی تحریک سے اس درجہ وابستگی کے اس دور میں غالباً مخدوم نے کوئی نظم نہیں کہی۔ میری واپسی کے دو ماہ کے اندر ہی ۵۰ اسٹریڈ یونینوں کا قیام عمل میں لایا گیا، اور ان میں سے اکثر کا قیام مخدوم اور راج بہادر ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ جواد اور میں بھی ان ہی میں سے بعض ٹریڈ یونینوں کے سکریٹری تھے لیکن مخدوم تو ان تمام ٹریڈ یونینوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ تھے ۔۔ ۴۶ء میں آل حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس کا قیام بھی عمل میں آیا، اور مسٹر ایس ایم جوشی نے اس کی رسم افتتاح انجام دی۔ اس افتتاحی جلسے کے اختتام پر ہم جلسہ گاہ سے کچھ دور پر واقع سکندرآباد کے ایک ہوٹل میں چائے پینے کے لیے گئے اور وہیں پر مخدوم کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ ان کی پہلی گرفتاری تھی۔

اسی دوران آندھرا مہاسبھا کی زیر قیادت سارے تلنگانہ میں بیگار (وٹّی) کے خلاف زبردست تحریک شروع ہوگئی تھی اور ضلع ضلع، تعلقہ تعلقہ اور موضع موضع میں والنٹیر دل قائم ہو چکے تھے۔ کسانوں اور زرعی مزدوروں کے اس جوش و خروش نے زمینداروں، دیشمکھوں اور جاگیرداروں میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی۔ چنانچہ تعلقہ جنگاؤں کے ایک موضع کڑوینڈی میں ایک مخلص عوامی کارکن کمریا کو دیشمکھوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ قتل کرا دیا۔ اس صورت حال کے پیش نظر ٹریڈ یونینوں نے اکتوبر ۴۶ء ۱۹ کی کسی تاریخ کو یوم مخالف ظلم منانے کا فیصلہ کیا۔ مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے ہی کمیونسٹ پارٹی اور آندھرا مہاسبھا کے سرگرم لیڈروں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے لیکن اس کی اطلاع ملتے ہی تمام کمیونسٹ لیڈر روپوش ہو گئے اور ان میں مخدوم بھی شامل تھے۔

یہ وہ دور تھا جب کہ برطانوی راج کے قدم ہندوستان سے اکھڑنے لگے تھے اور پورا ملک انقلابی تحریکوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مسلم لیگ کی جانب سے پاکستان کے قیام کے مطالبہ پر پورا زور دیا جا رہا تھا اور پارٹی نے اس دور کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تحریک کو بھی اس ملک میں رہنے بسنے والے ایک مخصوص فرقہ کے لوگوں کی قومی تحریک قرار دینا چاہیے۔ پارٹی نے مسلمانوں کے حق خود ارادیت کے مطالبہ کو بھی جائز، معقول اور جمہوری مطالبہ قرار دیا۔ بعد میں پارٹی کو اپنے اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنی پڑی کیوں کہ اس سے بالواسطہ دو قومی نظریہ کی تائید ہوتی تھی۔ تاہم پارٹی کے اس اندازِ فکر نے مخدوم کو بھی متاثر کیا اور انھوں نے وہ نظم لکھی جس میں "پاکستان ہمارا" کے نعرہ کو اپنا عوامی نعرہ کی حیثیت سے استعمال کیا گیا تھا۔ مخدوم کو پارٹی کے فیصلہ میں نظر ثانی کے بعد اپنے اس نظم کے مضمرات پر بھی غور کرنا پڑا اور انھوں نے اسے اپنے کلام سے خارج کر دیا۔ مگر کچھ عرصہ تک یہ نظم بھی محفلوں اور مجلسوں میں دادِ تحسین حاصل کرتی رہی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تیار ملبوسات

اداروں سے متعلق خیاطوں کی ٹریڈ یونین کے ایک جلسہ میں جس کا میں جنرل سکریٹری تھا شریمتی برج رانی گوڑ امسز راج بہادر گوڑ کے کم عمر لڑکے نے یہ نظم سنائی تھی۔ اور اس کی وجہ سے غیر مسلم خیاطوں میں ناراضگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ لیکن میں نے صورت حال کا اندازہ کرتے ہوئے حاضرین کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ نظم سنانے والا بچہ کسی مسلم خیاط کا ہے۔ اور اس کی جانب سے ایسی کسی نظم کے سنانے پر ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت نہ تو میں شریمتی برج رانی کو جانتا تھا اور نہ ہم نظم سنانے والے بچہ کو۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ نظم مخدوم کی ہے۔ بعد میں دریافت پر پتہ چلا کہ یہ مخدوم کی ایک "عاق کردہ" نظم ہے۔ مخدوم کی روپوشی نے اس نظم کو بھی عوام کے ذہن سے محو کر دیا۔ وہ بدم یلا ریڈی اور روی نارائن ریڈی کے ہمراہ وجے واڑہ چلے گئے تاکہ وہاں سے تلنگانہ کے عوام کی تحریک جو ہتیار بند لڑائی کی شکل اختیار کر چکی تھی رہنمائی کر سکیں۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر یہ وضاحت کر دی جائے کہ اپنی روپوشی کے چند ماہ بعد راج بہادر گوڑ گرفتار کر لیے گئے تھے لیکن انھیں فرار کرا یا گیا اور حسن اتفاق کہ جس دن راج ہو بعوا د فراری کے بعد وجے واڑہ روانہ ہوئے مخدوم اسی دن حیدر آباد واپس ہوئے اور پولس ایکشن کے بعد سے اپنی گرفتاری تک کا سارا زمانہ شہر حیدر آباد ہی میں گزرا۔

روپوشی کے اس صبر آزما دور میں مجھے مخدوم کی شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے کا موقعہ ملا۔ وجے واڑہ سے واپسی کے فوراً بعد چند ماہ تک میں اور مخدوم ایک سیٹھو صاحب کے گھر میں روپوش رہے۔ سیٹھو صاحب تو ہماری اصلیت سے واقف تھے لیکن ان کے گھر والوں کو باور کرایا گیا کہ میری بیوی ٹیوشن کرتی ہے اور میں ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے اخبار میں کام کرتا ہوں۔ مخدوم صاحب کے متعلق یہ بتایا گیا کہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں اور ان کا دماغی توازن خراب ہونے کی بنا پر انھیں گھر سے باہر نکلنے نہیں دیا جاتا۔ سیٹھو صاحب نے نیک نفسی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی رفیقۂ حیات کو بھی ہماری اصلیت سے واقف نہیں کرایا۔ چنانچہ اس بنا پر کہ وہ اپنے بیان کے مطابق برہمن تھے ان کی بیوی ہر تہوار کے موقع پر میرے اور مخدوم کے پیر چھو کر دکھشنا دیا کرتیں اور سیٹھو صاحب یہ دیکھ کر بھی چپ ہو جاتے۔ سیٹھو صاحب کی اس فراخدلی کے پیچھے سابق ریاست حیدر آباد میں نظام کی مطلق العنانی کے خلاف ہماری پارٹی کی جاریہ لڑائی سے ہمدردی کا جذبہ کار فرما تھا۔ سیٹھو صاحب اور ان کے جواں سال بھتیجے نے جو ہماری حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے ہمیں کچھ عرصہ تک پناہ دی۔ لیکن روپوشی کے زمانے میں کسی ایک ہی مقام پر قیام پذیر رہنا چونکہ مصلحت کے خلاف ہوتا ہے اس لیے ہم نے ان کے مکان کا تخلیہ کر دیا۔

امتحان اور آزمائش کے اس دور میں مخدوم کی روایتی زندہ دلی میں کوئی فرق نہ پڑ سکا۔ پولیس کا ڈر، پکڑے جانے کے اندیشے ابتدائی احتیاطات کی عدم تکمیل ـــــ مصائب و آلام کے پیا پے حملے۔ لیکن کیا مجال کہ مخدوم کی جبین پر کوئی شکن بھی پڑی ہو۔ ان کا حوصلہ اور کردار ہم سبھوں کے لیے مشعل راہ تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مخدوم اور میں نلہ کنٹہ میں اپنی پناہ گاہ سے سیکلوں پر پرانے شہر کو جا رہے تھے کہ کاچیگوڑہ اسٹیشن کے چوراہے پر متعینہ کانسٹبل نے بلا قندیل سیکل چلانے کی پاداش میں ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ کوئی مخدوم کو پہچان نہ لے۔ انھوں نے سابق ریاست حیدر آباد میں رہنے والے ہندوؤں کا لباس پہن رکھا تھا تاہم اس بات کا

توی اندیشہ تھا کہ ان کی شناخت کر لی جائے۔ چنانچہ میں مخدوم کو پولیس اسٹیشن کے باہر کھڑا کر کے خود تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس اثناء میں مخدوم کانسٹبل کو منانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اتفاقاً اس رات چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ انھوں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کانسٹبل سے کہا۔ "سمجھی۔ چاندنی ہے اسی لیے تو قندیل نہیں لگائی گئی"۔ کانسٹبل اپنے بے ٹھاٹ لب و لہجہ میں چلّایا "مہاراج ۔۔۔ اندر چلو چاندنی کا مزہ آجائے گا"۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ مخدوم کو لے کر اندر داخل ہوا۔ میں ان کے آگے کھڑا ہو گیا تاکہ سب انسپکٹر میرے سایہ میں ان کے خدوخال کا جائزہ نہ لے سکے۔ صورتحال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اپنے جیب سے فوراً (۲۰) روپے نکال کر سب انسپکٹر صاحب کی میز پر بطور نذرانہ رکھ دیئے اور سب انسپکٹر صاحب نے ازراہِ رحم ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ جان چھوٹی لاکھوں پائے۔ ان دنوں تو مخدوم کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر ہزاروں روپے انعام کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ تھانہ سے نکل کر گھر واپس ہوئے تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کے غیر محتاط رویہ پر سخت تنقیدیں کیں۔ اس واقعہ کے چند دنوں بعد مخدوم بمبئی چلے گئے۔

روپوشی زندگی کے اس دور میں تلنگانہ کے کسانوں کی مسلح جدوجہد نے بڑی شدت اور وسعت اختیار کر لی تھی۔ مخدوم بھی ہمارے دوسرے ساتھیوں کی طرح سیاسی محاذ پر سرگرم عمل تھے۔ انھیں اتنی مہلت نہ ملتی تھی کہ وہ اس جدوجہد سے حاصل ہونے والے وجدان کو شعر کے قالب میں ڈھالیں۔ لیکن بمبئی کو روانگی اور اس شہر میں چند دنوں تک قیام نے ان کی شاعرانہ صلاحیت کو متحرک کیا اور اسی زمانے میں انھوں نے مشہور نظم "تلنگانہ" لکھی۔ یہ نظم جن ہنگامہ خیز دور کی پیداوار ہے اس کے پیش نظر اس کا قوی امکان تھا کہ مخدوم بھی کوری نعرہ بازی پر اتر آئیں۔ لیکن کسانوں کی تحریک سے تعلق رکھنے والی اس نظم کے بین السطور میں بھی مخدوم کے حسنِ جمال کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اندھیری رات کے سینے میں مشعلوں کی برات
امام تشنہ لباں خضرِ راہ آبِ حیات
مرا ثبات مری کائنات میری حیات
سلام تجھ پہ بغاوت سلام ماہ نجات

:.

اٹھے ہیں تیغ بکف یوں بعد ہزار جلال
وہ کوہ و دشت کے فرزند کھیتیوں کے لال
چمک رہی ہے درانتی اچھل رہے ہیں کدال
ہوا ہے قصر امارت شکستہ و پامال
پڑی ہے قصر مبارک پہ ضربت کاری
حضور آصف سابع پہ ہے غشی طاری

مخدوم کی نظم کے یہ تیور اس دور میں لکھی جانے والی عام سیاسی نظموں سے بالکل جداگانہ اور مختلف ہیں۔ محاذِ جنگ پر ڈٹے رہنے کے باوجود مخدوم کے اندر کا شاعر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ زندہ و سلامت تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ تحریک سے وجدان بھی حاصل کر رہا تھا۔

میں ادبی نقاد کی حیثیت سے مخدوم کے محاسن شعری پر تبصرہ کا مجاز نہیں ہوں لیکن میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اس

اس عام خیال کے برعکس کہ مخدوم کی عملی سیاست نے اردو سے اس کے ایک بلند قامت شاعر کو چھین لیا تھا۔ مخدوم کی ادبی صلاحیتیں تحریک ہی کی گود میں جلا پاتی رہیں۔ ایک باکردار انقلابی کی طرح انھوں نے مصیبتوں اور کشمکش کے اس دور کو بھی ایک شاعرانہ موضوع بنالیا تھا۔

یہی نہیں روپوشی کے دور میں جو واقعات بھی پیش آتے وہ انھیں انتہائی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے اور اس سے لطف اندوز بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مخدوم کو ہدایت دی گئی کہ وہ اپنے آپ کو کائستھ بتائیں۔ چنانچہ ایک موقع پر انھوں نے انھوں نے گرگ باراں دیدہ کائستھ سے ملاقات کے دوران اپنا نام کائستھوں جیسا بتایا۔ لیکن جب ہم کلام نے پوچھا کہ "آپ کا گوتر کیا ہے؟" تو مخدوم سٹ پٹائے اور ان کی زبان سے بے ساختہ "لاحول ولا قوۃ" نکل گیا۔ (گوتر سے کائستھوں میں آباو اجداد کا اندازہ لگایا جاتا ہے) مخدوم نے اس بے موقع اور بے محل لاحول کے مضمرات کو محسوس کر لیا اور بچ بچا کر اپنے ہم کلام کے "دائرۂ کلام" سے باہر نکل آئے۔ کچھ دنوں بعد مجھ سے بھی ایک ایسی ہی حماقت ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ میں کرم نگر کے امرت لال اور مخدوم نلہ کنٹہ کے ایک گھر میں پناہ گزین تھے۔ میں نے کسی ضرورت کے تحت ایک دن پہلے اپنے کمرہ کا دروازہ بند کیے بغیر بستر کھولا اور امرت لال کے چھوٹے سے لڑکے نے بستر کے اندر رکھی بندوقیں لپٹی دیکھ کر بندوق بندوق کے نعرے لگانے شروع کیے۔ ہم سبھوں نے خطرہ کو محسوس کر لیا۔ لیکن مخدوم کا تجربہ اس مرحلہ پر ہمارے کام آگیا۔ چنانچہ ان کے مشورے سے ایک آدمی کو بھیج کر ٹائے شاپ سے ایک ایئرگن منگا لی گئی۔ اور لڑکا اس غیر متوقع انداز میں اپنا من پسند کھلونا پا کر بستر میں لپٹی ہوئی حقیقی بندوقوں کو بھول گیا۔

کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانفرنس میں جو کلکتہ میں منعقد ہوئی تھی مخدوم نے روپوشی کے دور ہی میں شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس میں بی ٹی رندیوے کے زیر اثر پارٹی نے جو غلط سیاسی لائن اختیار کی تھی مخدوم نے اسے قبول کر لیا۔ اور ان کا شمار انتہاپسند قائدین میں ہونے لگا۔ اسی دور میں جو خوش بختی سے بہت مختصر سا رہا مخدوم سے بعض امور و مسائل میں اختلافات بھی پیدا ہو جایا کرتے تھے لیکن ان کی سیاسی انتہاپسندی ان کی ہمہ گیر انسانیت پر غالب نہ آسکی۔ اپنی شاعری کو بھی انھوں نے اس انتہاپسندی سے متاثر نہ ہونے دیا۔ اس کے ثبوت میں ان کا وہ قطعہ پیش کیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے ؎

اور کیا ہوگی کسی کی کائناتِ سال و سن
عشق کی دو چار راتیں حسن کے دو چار دن

مخدوم کے اس رومانی قطعہ نے ایک تنگ و تاریک پناہ گاہ میں جنم لیا تھا۔ اور مسٹر جواد رضوی نے اسے ادب کی انقلابی روایات کے منافی قرار دیتے ہوئے اس پر شدید تنقید بھی کی تھی۔ مخدوم ان کی تنقید پر برہم ہوگئے اور انھوں نے راج کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ شعر و ادب کو بھی اسی پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا جس پیمانہ سے سیاسی اصولوں کا ناپ تول کیا جاتا ہے۔ . . . .

توقع کے مطابق مخدوم نے جلد ہی پارٹی کے انتہاپسند قائدین کی پالیسی کے غلط ہونے کا اندازہ کر لیا۔ چنانچہ ان کے طریقۂ انقلاب اور ہتھیار بند لڑائی پر انھوں نے تنقید شروع کر دی اور اس دور کی انتہاپسند قیادت نے آزادانہ اظہار رائے کی پاداش میں انھیں

ان معمولی سہولتوں سے بھی محروم کر دیا جو روپوش ساتھیوں کو دی جاتی تھیں۔ ایسے نامساعد اور ناموافق حالات میں وہ پارٹی کے ایک ہمدرد کے مکان میں جو اڈکمیٹ میں تھا منتقل ہو گئے اور ۱۹۵۰ء میں اسی مکان میں گرفتار کر لیے گئے۔ جیل کی چار دیواری اور محبس کی دیواروں نے، پھر ایک بار ان کے اندر کے شاعر کو للکارا۔ طوق و سلاسل کے شور میں بھی، ان کے کان، عوام کے پیروں کی چاپ سنتے رہے ؎

رات ہے رات کی خاموشی ہے، تنہائی ہے
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے

چونک جاتا ہے دماغ
جھلملا جاتی ہے انفاس کی لو
جاگ جاتی ہے مری شمعِ شبستانِ خیال
زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے
شاہ راہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
ان کے مصروف قدم
سینکڑوں لاکھوں قدم، سینکڑوں لاکھوں عوام

"قید" میں مخدوم نے، اپنے حسن "داخلی کرب" کی نمایندگی کی ہے۔ وہ غمِ ذات سے کتنا بلند ہے۔ گھٹن، اور مایوسی کے اس ماحول میں بھی، مخدوم کو افسوس ہے کہ اس کا "گنجِ گراں مایہ عمر" "نذرِ آزادیِ زندانِ وطن" ہونے کے بجائے "نذرِ زندان" ہوا۔

پہلے عام چناؤ سے قبل، مخدوم، روی نارائن ریڈی، اور بدم یلا ریڈی کی رہائی عمل میں آئی۔ اور اسی شہر کے عوام نے، جو ایک عرصۂ دراز تک نظام کی مطلق العنان اور انگریزی سامراج کی دوہری غلامی کا ہدف بنے ہوئے تھے، ان مجاہدینِ حریت اور آزادی کا جس پیار اور جس جوش و خروش سے سواگت کیا، وہ، ہماری تحریک آزادی کی تاریخ میں، ایک نئے اور شاندار باب کا اضافہ کر گیا "مخدوم" اِن دنوں، تلنگانہ کے ہیرو بن گئے تھے۔ اس سانولے سلونے، شاعر، دانشور، اور رہنما کا نام، شہر کی ان پرانی ڈیوڑھیوں کے در و بام پر بھی جگمگانے لگا۔ جن کے بارے میں، خود انہوں نے کہا تھا

ع۔ مار و کژدم کا ٹھکانہ جن کی دیواروں کے چاک "شیرِ تلنگانہ مخدوم" "تلنگانہ کا نجات دہندہ مخدوم"...... کسانوں کا رہنما، مزدوروں کا قائد، غریبوں کا ترجمان، عوام نے نہ جانے مخدوم کو کیا کیا خطاب دے رکھے تھے، فضائیں، مخدوم زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونجتیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ چین کا انقلاب مکمل ہو چکا تھا۔ اور ایشیا میں بھی سرخ سویرا نمودار ہو گیا تھا۔ تاریخ کی اس نئی کروٹ سے، مخدوم کا متاثر ہونا بالکل فطری تھا۔ انہوں نے اس زمانے میں ایک چھوٹی سی نظم لکھی ؎

انسان کی آرزو نے، انساں کی جستجو نے
گرتی ہوئی زمین کو آکاش میں اچھالا
وہ موڑ آگیا ہے مشرق کی زندگی میں
ہر گام پر سویرا، ہر سو نیا اجالا

میں ان دنوں گلبرگہ جیل میں تھا۔ انتخابات کے چند دنوں بعد، مجھے مخدوم کا ایک مکتوب جیل میں وصول ہوا۔ لفافہ کے اندر انہوں نے اپنی تازہ نظمیں "قید" اور "نیا چین" بھی رکھ چھوڑی تھیں۔ قید تنہائی کا ایک سال گذرنے کے بعد مخدوم کے اس غیر متوقعہ تحفہ نے، مجھ پر، کچھ عجیب سی کیفیت طاری کردی۔ اور اپنے برقندازاور نگران کار کی موجودگی کا خیال کئے بغیر، میں، مخدوم کی نظمیں پڑھ کر، بے اختیار رونے لگا "قید" میں، مخدوم نے، جن بیڑیوں کی جھنکار کا ذکر کیا تھا، وہ میرے پیروں میں پڑی تھیں اور میں اسی عالم میں پورا ایک سال گذار چکا تھا۔ اپنی گرفتاری کے ابتدائی دنوں میں مجھے راج کی ایک مختصر سی چھٹی ملی تھی۔ اور اس کے پورے ایک سال بعد، میں، مخدوم کی نظموں کے ذریعہ جیل کے باہر کی دنیا سے متعارف ہو سکا تھا۔ ان کی نظم "نیا چین" نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے، اس کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا۔ گرتی ہوئی زمین کو آکاش میں اچھالے جانے، تصور نے مجھے کئی دنوں تک، مسحور رکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے، مخدوم کے اس مصرعہ کا ترجمہ، "Toss The world sky High" کیا تھا۔ اور آج اتنے برس بعد بھی، جب میں انقلاب چین کی کامیابی پر مخدوم کے اس شاعرانہ ردعمل و تاثر کے مضمرات پر غور کرتا ہوں، تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ مخدوم کتنے بڑے شاعر تھے۔ ایشیا کے ایک ایسے ملک میں، جسے سامراجی صدیوں تک افیون پلاتے رہے، سوشلسٹ انقلاب کی کامیابی، گرتی ہوئی زمین کا آکاش پر اچھالا جانا نہیں تو کیا ہے؟

مجھے میری اور مخدوم کی روپوشی کے دور کا ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ پولیس ایکشن ہو چکا تھا۔ اور نئے دستور کے تحت، ہندستان کے ایک جمہوریہ ہونے کا اعلان بھی کردیا گیا تھا لیکن توقع کے مطابق حکومت ہند نے سابق حکومت حیدرآباد کی جانب سے کمیونسٹ پارٹی پر عائد کردہ پابندیاں برخاست نہیں کی تھیں اور مخدوم "توپ کے سانچہ" پر واقع ایک لب سڑک مکان میں قیام پذیر تھے۔ اسی زمانہ میں بلے بلی، پاپی ریڈی نے ایک موقعہ پر جب کہ وہ پارٹی کی ایما پر حیدرآباد سے دیہات بھجوائے جارہے تھے، مخدوم کو ایک ریوالور بطور تحفہ دیا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا، مجھے پارٹی کی جانب سے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کے لئے ہتھیار سربراہ کروں۔ اس اعتبار سے، میرے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ میں ہر قسم کے ہتھیاروں کے کیل کانٹوں سے واقف ہوں۔ اور یہ کسی حد تک درست بھی تھا، لیکن میں جس واقعہ کا ذکر کررہا ہوں اس دن مجھ سے، ایک ایسی حرکت سرزد ہوئی کہ، میں نہ صرف ہتھیاروں سے ناواقف اور اناڑی قرار دیا جاسکتا ہوں، بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس منحوس دن، مخدوم ہلاک ہوجاتے۔ ہم ایک دوست کے گھر بیٹھے مختلف باتیں کررہے تھے، اور میں مخدوم کو تحفہ میں دیئے ہوئے ریوالور کے کیل کانٹوں کا معائنہ کررہا تھا، پاپی ریڈی نے مجھے بتایا تھا کہ ریوالور میں دو کارتوس ہیں۔ اور دونوں کارتوس

صاف طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن ایک تیسرا کارتوس میگزین میں لگا ہوا تھا، اور میں اس سے قطعی ناواقف تھا، جانچ پڑتال کے دوران جب میں نے لبلبی دبائی تو دھماکہ کے ساتھ اندر کا کارتوس پھٹ پڑا۔ میرے ہوش جاتے رہے اور میں سر سے پیر تک کانپتے اور لرزتے ہوئے مخدوم پر۔ دیکھنے کے لئے نظر ڈالی کہ اگر وہ اس غیر متوقع فائرنگ سے زخمی نہیں ہوئے بلکہ زخمی ہوئے ہیں تو انھیں طبی امداد بہم پہونچائی جائے۔ لیکن مخدوم تو اسی طرح ہنستے مسکراتے میرے بازو بیٹھے تھے۔ گولی سامنے کی دیوار میں پیوست ہوگئی تھی، مجھے اطمینان دلاتے ہوئے مخدوم نے کہا، جو ہوا سو ہوا۔ فائر کی آواز سڑک تک پہونچ چکی ہے۔ ہم کو فوراً اپنی پناہ گاہ بدل دینی چاہیئے۔ میں نے، ایک ہی لمحہ میں اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ گولی مخدوم کے پیر کے قریب سے گذری تھی۔ لیکن انہیں کوئی نقصان نہیں پہونچا تھا۔ اس واقعہ کا تصور آج بھی مجھے لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ لیکن جب یہ سوچتا ہوں کہ جس مخدوم کی زندگی، ہم سبھوں کے لیئے اسی عزیز تھی، اسی کو ایک دن اپنے ہاتھوں منوں مٹی میں دفن کرنا پڑا۔ تو میرے کانوں سے موت کے شیطانی اور طنزیہ قہقہوں کی کرخت اور ناگوار آواز ٹکرانے لگتی ہے۔ گولی کا وہ نشان ہمارے ہمدرد نے بطور یادگار اب تک جوں کا توں رکھ چھوڑا ہے۔ اور یہ واقعہ ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ لیکن، میں نے اس سنگین اور دل ہلا دینے والے سانحہ کے باوجود، مخدوم کے چہرے پر، اطمینان و سکون کے جو آثار پائے تھے، وہ آج تک بھلائے نہیں جا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ گولی کا وہ یادگار نشان مٹ جائے، لیکن مخدوم کی شخصیت نے مجھ پر ہی نہیں، مجھ جیسے کتنے ہی لوگوں پر اپنی عظمت کردار کے جو نقوش چھوڑے ہیں وقت اور زمانہ کی گرد انہیں دھندلا نہیں کر سکتی۔

آج جب کہ مخدوم ہم میں نہیں رہے ہیں، ان کی زندگی کے کتنے ہی چھوٹے بڑے واقعات میرے ذہن میں ابھرتے جا رہے ہیں۔ یہ واقعات اتنے متنوع ہیں کہ میں ان کو بیان کرتے ہوئے ترتیب و تسلسل کی صد کی پابندی نہیں کر سکتا۔ مخدوم دراصل لینن کی اس کسوٹی پر کہ، ہر کمیونسٹ انقلابی کو، اپنی شخصیت کی از سر نو تشکیل پر توجہ دینی چاہیئے تاکہ اسے پہلی بار دیکھنے والے بھی، تحسین و ستائش کے انداز میں یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ یہ صحیح معنوں میں کمیونسٹ ہے کھرے اترتے تھے۔ جن دنوں مخدوم دبجے واڑہ میں قیام پذیر تھے ان ہی دنوں کی بات ہے کہ، ایک دن وہ مجھے کوئی اطلاع دیئے بغیر ہی حیدرآباد پہونچ گئے۔ اور چونکہ انہیں میری ننھیال کے مکان کے سوا، میرا کوئی اور ٹھور ٹھکانہ معلوم نہ تھا، اس لیئے اسی مکان کا رخ کیا۔ میری ننھیال، بے حد قدامت پسند ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ میرے نانا اور ماموں، اکثر قسم کے مذہبی واقع ہوئے تھے۔ لیکن ان کی یہ مذہبیت کچھ عجیب و غریب سی تھی اور اس میں اسی تہذیب و تمدن کی جھلک نظر آتی تھی جسے گنگا جمنی حیدرآبادی تہذیب کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ نانا صاحب کو کسی مسلمان کے ساتھ کھان پان تو گوارا نہیں تھا لیکن اپنے کسی مسلمان دوست کو رمضان کے مہینہ میں ہر روز افطار کرانا وہ ضروری سمجھتے۔ حضرت غوث پاک کا جھنڈا، وہ بالالتزام چڑھاتے۔ لیکن ان کی اس وسیع النظری کا دایرہ اتنا وسیع نہ ہو سکا تھا کہ میرے ننھیال کے رسوئی گھر میں کوئی مسلمان داخل ہو جائے۔ لیکن جب میں نے پہلی بار کامریڈ جواد رضوی کو کٹر ہندوؤں کے اس رسوئی گھر میں کھانا کھلایا تو، ان کی جبین پر کوئی شکن نہ پڑی —— وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جواد مسلمان ہے۔ اور ان کے افراد خاندان نے ان سے پوچھا کہ ایک مسلمان کو رسوئی گھر میں کھانا کھلانے پر انہیں کوئی اعتراض کیوں نہیں۔ لیکن انہوں نے بزرگانہ اور شفقت بھرے انداز میں کہا، جو لوگ اس ریاست کے مظلوم عوام کو جن میں

دہرے ظلم کے شکار ہندو بھی شامل ہیں۔ آمریت، مطلق العنانی اور جبر و استبداد سے نجات دلانے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پہ لئے پھر رہے ہیں۔ ان کو دین دھرم کے روایتی ترازو میں تولنا مناسب نہیں ــــ نانا اور ماموں صاحب کے اس انداز فکر نے گھر کے ماحول میں تھوڑی سی فراخدلی تو پیدا کر دی تھی، لیکن ان دونوں سے ناواقف مخدوم صاحب کا اس طرح روپوشی کے دور میں یکایک ان کے گھر پہونچ جانا بہرحال خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ لیکن میرے غیاب میں مخدوم نہ صرف گھر کے اندر داخل ہوگئے بلکہ سیڑھیاں چڑھ کر اس کمرہ میں بھی پہونچ گئے، جہاں تک گھر کی خواتین بے روک ٹوک آیا جایا کرتی تھیں۔ یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ میرا گھرانہ کائستھ ہے اور کائستھوں کی خواتین، مسلم خواتین ہی کی طرح پردہ کرتی ہیں۔ پولیس ایکشن سے قبل کے اس دور میں تو، وہ بڑا گاڑھا پردہ کیا کرتی تھیں۔ لیکن اپنی جھلاہٹ اور شرافت پر بھروسہ کرکے مخدوم نے اس گھر کے زنان خانہ تک پہونچنے کی کوشش کی اور ایک کرسی پر بیٹھ بھی گئے۔ میرے ایک ماموں زاد بھائی نے جب ان سے پوچھا کہ ان کا نام کیا ہے اور وہ کس کے لئے آئے ہیں ــ تو انہوں نے اپنا نام مادھو بتایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ "لالہ" (میرے گھر کا نام) سے ملنے آئے ہیں۔ ماموں زاد بھائی نے اس اجنبی کی عبارت کا اندازہ کرتے ہوئے پہچان لیا کہ یہ حضرت مادھو تو نہیں ہوسکتے۔ پھر نہ جانے کیوں اسے یہ خیال آیا کہ جھوٹ موٹ کا مادھو مخدوم ہے۔ چنانچہ اس نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی کے انداز میں پوچھا "آپ مخدوم ہیں ــ نا؟" کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ایک ایسے مرحلہ پر جب کہ اس وقت کی حکومت نے اس کے سر کی قیمت ہزاروں روپے مقرر کی ہو بھاگ کھڑا ہوتا، لیکن مخدوم کو اپنی پارٹی اور اپنے ساتھیوں پر بھروسہ تھا، وہ محسوس کرتے تھے کہ کسی مخلص کمیونسٹ کے گھر والے، اس کے کسی ساتھی کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ اسی شریفانہ احساس کے تحت انہوں نے، میرے ماموں زاد بھائی، کی قیافہ شناسی کی توثیق کردی اور اسی کے توسط سے مجھے بلا بھیجا۔ یہ واقعہ مخدوم کی شرافت نفس کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کے خمیر میں رچے بسے اس عنصر کا ترجمان ہے، جس نے انہیں ایک بحر بیکراں بنا دیا تھا۔ ان کی نظر میں ہندو مسلم، امیر غریب چھوٹے بڑے کے سب امتیازات حقیر اور بے معنے سے تھے۔

اسی دوران میں مخدوم صاحب کو، جناب اختر حسن سابق اڈیٹر پیام کے گھر لے گیا۔ جہاں اس ناقابل فراموش خاندان کے ہر فرد نے، بڑے ہی پیار سے، ششش جہت کے اس اسیر "کا سواگت کیا۔ اختر صاحب اور ان کے گھرانہ نے نظام کی مطلق العنانی کے خلاف چلائی جانے والی تمام تحریکوں کی جس طرح راست اور بالواسطہ مدد کی ہے، اسے سابق ریاست حیدرآباد کا کوئی جمہوریت پسند بھلا نہیں سکتا۔ اسی گھر سے روپوش کمیونسٹوں کے لیے کپڑے سربراہ کئے جاتے تھے۔ ان کے منتشر اور پراگندہ افراد خاندان کو لاکر ان سے ملایا جاتا تھا۔ ان کی مالی امداد کا انتظام ہوتا۔ اسی امداد و اعانت کی پاداش میں اختر صاحب کے گھر پر رضاکاروں کے حملے بھی ہوئے، لیکن ان ساعد حالات میں بھی اختر اور ان کے افراد خاندان نے ترقی پسند ۔۔۔ جمہوریت پسند قائدین و کارکنوں کے لیے جن میں گوبند داس شراف اور ملیا کلو بھی شامل تھے، اپنے گھر کے دروازے بند نہیں کئے ــــ مخدوم" کی حفاظت اور روپوشی کے دور میں ان کی ہر طرح سے امداد و اعانت میں بھی اس گھرانے کا بلاشبہ بڑا دخل رہا ہے۔ ایک مخدوم پر ہی کیا موقوف ہے، راج، جواد اور خود میں بھی، امتحان و آزمائش کے اس دور میں اختر صاحب اور ان کے افراد خاندان

کی کرم فرمائیوں کے رہینِ منت رہے ہیں۔

پارٹی پر سے پابندی اُٹھ جانے کے بعد، مخدوم نے، انتخابی مہم کے دوران، تلنگانہ پر چھائے ہوئے اس خوف کو دور کرنے میں، نمایاں حصہ لیا، جو پولیس ایکشن اور اس کے بعد قائم ہونے والی فوجی حکومت کا ردِ عمل تھا۔ عوامی جمہوری محاذ کی تشکیل اور محاذ کی جانب سے، شہری آزادیوں کی بحالی کی مہم نے، عوام میں ایک نیا حوصلہ اور جوش پیدا کیا۔ محاذ کے انتخابی جلسوں میں، ہزاروں لوگ جمع ہوتے ہیں — اور سب کا نعرہ ایک ہی ہوتا "مخدوم زندہ باد" "عوامی جمہوری محاذ پائندہ باد"۔ بچے، جوان، بوڑھے، مرد، عورت، سبھی مخدوم کی شخصیت کی بے پناہ کشش سے متاثر تھے۔ مخدوم کی نظموں کے کئی کئی بند، لوگوں کی نوک زبان پر چڑھ گئے جلوسوں میں، اسی کی نظمیں رجز کا کام دیتیں۔ مشاعروں میں اسی کی آواز گونجتی، ادبی جلسہ ہو کہ سنگیت کی رات، وہ ہر محفل کی شمع بن گیا تھا۔

مخدوم عام چناؤ میں پہلے شہر سے اسمبلی کے امیدوار تھے۔ وہ پارلیمنٹ کی نشست کے لئے بھی کھڑے تھے۔ لیکن کانگریسی دھاندلی شاہی کی بنا پر انہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور ضلع نلگنڈہ کی ایک نشست کے ضمنی چناؤ میں ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ ایک پارلیمنٹیرین کی حیثیت سے بھی، مخدوم نے اتنا بلند مقام پیدا کر لیا تھا کہ وہ جب کسی مسئلہ پر بولنے کھڑے ہوتے، تو سارے ایوان پر خاموشی چھا جاتی۔ برسرِ اقتدار جماعت پر سخت سے سخت تنقید میں بھی مخدوم کی بالاتر ذہنی سطح کی جھلک نظر آتی تھی۔ اور پھر زبان و بیان کا چٹخارہ!

جس زمانہ میں مہاراج پھول چند، سابق ریاست حیدر آباد کے وزیرِ تعلیم تھے، ان دنوں وزارت تعلیم کے ضمنی اخراجات پر بحث کے دوران مخدوم نے ان کے نام کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنی تقریر کچھ اس طرح شروع کی تھی کہ "ہمارے وزیرِ تعلیم نے تعلیمات کا جو ضمنی بجٹ پیش کیا ہے۔ اس میں پھول چند اور کانٹے زیادہ ہیں۔ اس لطیف و برجستہ مزاح نے ایوان کی کارروائی میں ایک نئی جان ڈال دی — اور مخدوم کا یہ طنز اتنا مقبول ہوا کہ، پھول چند صاحب کو، سڑک سے گذرتا دیکھ کر لوگ، "پھول چند کانٹے زیادہ"، کا نعرہ بلند کرنے لگے۔

مخدوم دراصل سابق ریاستِ حیدر آباد میں ترقی پسند اور ٹریڈ یونین تحریکوں کے بانی تھے۔ اس دور میں جب کہ ٹریڈ یونین تحریک تو کجا، جمہوریت اور آزادی کا نام لینا بھی، خطرہ مول لینے کے مترادف تھا۔ اور حیدر آباد کے جاگیرداروں نے، نام نہاد مسلم قیادت کو آگے بڑھا کر، انا الملک کے پرفریب نعرہ سے ریاست کے مسلمان محنت کشوں کو، دیگر محنت کش طبقات سے الگ رکھنے کی مجرمانہ سازشیں شروع کر دی تھیں، مخدوم اور راج نے اپنی مساعی سے حیدر آباد کے بٹن ورکرس کی پہلی یونین بنائی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب کہ مغلپورہ کے پبلک پارک میں راج اور مخدوم بٹن مزدوروں کو جن کی غالب اکثریت، "بارہ آنے یومیہ اجرت" پر کام کرنے والے ۱۴ تا ۱۶ سال کے مسلم بچوں پر مشتمل تھی، مخاطب کرتے ہوئے، "ہم بادشاہ ہیں" کے اس فریب کا بھرم کھولا۔ اور انا الملک کا نعرہ لگانے والوں سے پوچھا کہ، کیا ان بدحال مسلم بچوں کو بھی وہ، ریاست کے تاجداروں میں شمار کرتے ہیں۔ میں ان دنوں بنگال سے نیا نیا آیا تھا اور اسی لئے

مجھے روانی سے اُردو میں تقریر کرنے کا محاورہ نہیں تھا۔ چنانچہ جب مجھ سے بھی کہا گیا کہ میں ہڑتالی مل مزدوروں کو مخاطب کروں تو میں نے کپڑے کے کارخانوں کا ذکر کرتے ہوئے، بنگالی لفظ "سوتاکل" استعمال کیا تھا۔" اور راج نے، میری کھچڑی اردو کا خوب مذاق اڑایا تھا۔ جلسہ گاہ کے قریب ہی اس وقت کے صدر اعظم ریاست حیدرآباد سر مرزا اسمٰعیل اور نواب علی یاور جنگ بھی کھڑے ہماری تقاریر سن رہے تھے۔ جلسہ کے اختتام پر مخدوم اور راج کسی جھجک اور تامل کے بغیر ان کے قریب پہنچ گئے اور انہیں مزدوروں کی شکایات اور مطالبات سے واقف کرا کے، یہ وعدہ لیا کہ وہ ان پر ہمدردانہ غور کریں گے۔ ریاست حیدرآباد کے اس دور کی جاگیردارانہ سیاست کے خدوخال، مخدوم کی نظم تلنگانہ میں ملتے ہیں۔ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ جاگیرداری کے اس قلعہ میں، پروان چڑھنے والی عوامی تحریکیں، مطلق العنانیت کے دور کو ختم کر کے رہیں گی۔ چنانچہ ان کی دوربین آنکھوں نے، حضور آصف سابع کو غشی کے عالم میں دیکھ لیا تھا۔

ان کی عوامی زندگی کے اس شاندار آغاز نے انہیں، ہندوستان کا ایک بہت بڑا ٹریڈ یونین لیڈر بنا دیا۔ انہوں نے اورن، پراگ میں، جو بین الاقوامی ٹریڈ یونین کانفرنسیں منعقد ہوئیں، ان میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی۔ دنیا کی امن تحریک اور عالمی ادبی اجتماعات میں شرکت کے لیے انہیں، سوویت یونین بھی جانا پڑا۔ عکرہ (افریقہ) کی امن کانفرنس میں بھی مخدوم شریک ہوئے تھے۔ انہیں قاہرہ جانے کا موقع بھی ملا۔ افریقہ کے تاثرات سفر بیان کرتے ہوئے جب انہوں نے مصر کے عوام کی فراعنہ مصر سے وابستگی کا ذکر، اردو ہال کے ایک جلسہ میں کیا تھا، تو بعض اصحاب نے اسے فراعنہ کی تعریف و توصیف سمجھتے ہوئے، کافی برہمی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن جب مخدوم نے بتایا کہ عرب نیشنلزم نے، فراعنہ مصر کو، مصری عوام کی شاندار روایات کا جزو بنا دیا ہے، تو ان کے معترضین کو مزید کچھ کہنے کی گنجائش پیدا نہ ہو سکی۔

بیرونی ممالک کے ان دوروں نے مخدوم کے شعور اور ان کی فکر کو صیقل کر دیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں مشرق و مغرب کی تہذیبوں کے خوشگوار امتزاج کی ترجمانی کرنے لگے تھے۔ چین کی مہم پسندی نے عالمی کمیونسٹ تحریک پر جو برا اثر ڈالا، مخدوم اس سے بھی بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ ان کی نظم "سب کا خواب"، ان کے اسی ردعمل کی نمائندہ ہے ؎

جب دھڑکتے تھے تو اک دل کی طرح
جب مچلتے تھے تو اک دل کی طرح
جب اچھلتے تھے تو اک دل کی طرح
جب مہک اٹھتے تو دنیا کا مہک اٹھتا تھا دل
وانگا کا، یانگسی کا، نیل کا، گنگا کا دل
آپ میں اک گرمیٔ احساس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی۔

مخدوم نے اسمبلی کے ایک رکن کی حیثیت سے خاتمہ زمینداری اور سابق والیان ریاست کے جیب خاص کی مسدودی اور مراعات

خصوصی کی منسوخی کے سلسلہ میں جو اہم رول ادا کیا۔ اور ان مسائل پر جو تقاریر کیں، وہ ان کی پارلیمانی ذہانت کی نمائندگی کرتی ہیں برسوں تک تلنگانہ کی مسلح جدوجہد چلانے والا، وہ مخدوم جس کا نام مفادات حاصلہ کے نمائندوں کو چونکا دیا کرتا تھا، اسمبلی میں بھی اپنی دراز قامتی کا لوہا منوانے میں کامیاب رہا۔ ۱۹۵۶ء میں، آندھرا پردیش کی تشکیل کے موقعہ پر، آندھرا اور سابق ریاست حیدر آباد کی ٹریڈ یونینوں کے انضمام، اور آندھرا پردیش ٹریڈ یونین کانگریس کے قیام میں بھی مخدوم نے نمایاں حصہ لیا اور وہی اے، پی، ٹی، یو سی کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

ہند پاک جنگ کے موقعہ پر جب مارکسٹ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں کو نظر بند کیا گیا، تو مخدوم نے مارکسٹ کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں کے ساتھ سکریٹریٹ کے سامنے بھوک ہڑتال بھی کی تھی۔ پارٹی میں پھوٹ پڑ جانے کے بعد بھی وہ محسوس کرتے تھے کہ ترقی پسند عناصر کے خلاف حکومت کے کسی بھی ناروا اقدام پر، احتجاج کرنا ضروری ہے۔

"مخدوم" ــ کا شمار ان "شہیدان آزادی" میں کیا جا سکتا ہے، جو ان ہی کے الفاظ میں، موم کی طرح جلتے اور پگھلتے رہے ہندوستان کی تحریک آزادی کے مختلف ادوار کی نمائندگی کرنے والی ان کی نظم "چاند تاروں کا بن" کو اردو کے سبھی نقادوں کی رائے میں، ایک زندہ جاوید نظم کی حیثیت رکھتی ہے۔ چاند تاروں کے بن کا خالق ہی، آج اس "بن" میں کھو گیا ہے۔ اور آج جب ہم، اس کے چھوڑے ہوئے ورثہ کا جائزہ لے رہے ہیں تو اندازہ ہو رہا ہے کہ ان کی رحلت نے جو خلاء پیدا کیا ہے وہ شاید برسوں تک پُر نہ ہو سکے گا۔ عمر کا وہ پیمانہ، جس سے عام لوگوں کے سن و سال کا تعین کیا جاتا ہے، مخدوم کے لیئے وہ ناموزوں ثابت ہوا۔ وہ تو سدا جوان، اور سدا رواں دواں تھے۔

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گذرے کہ اس "پیر جوان سال" نے چاول کے داموں کی بڑھوتی کے خلاف تیرہ دن کی بھوک ہڑتال کی تھی۔ وہ اتنے لمبے فاقہ کو ہنستے کھیلتے برداشت کر گیا۔ لیکن دلی میں قلب پر جو حملہ ہوا، وہ اس کی تاب نہ لا سکا اور اپنی لاتعداد یادیں چھوڑ کر چلتا بنا۔

نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

یارِ غمگسار کی بات

اشفاق حسین

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

مخدوم اس طرح اچانک رخصت ہو گیا کہ اس کے ہزاروں پرستار، دوست احباب اور اس کے عزیز و اقارب ششدر و دم بخود رہ گئے۔ اس کی ساحرانہ شخصیت نے ہزاروں کو مسحور کر رکھا تھا۔ اب وہ چل بسا ہے تو ایک زمانہ سوگوار ہے۔ مخدوم اور موت خیال کے کسی گوشے میں بھی اس امکان کی پرچھائیاں دور دور تک نظر نہ آتی تھیں وہ جیے گا اور بہت عرصہ جیے گا۔ یہی خوش خیالی تھی جو سب پر مسلط تھی۔ اب خوش خیالی کا یہ ایوان یک بیک منہدم ہو کر کھنڈر بن گیا ہے تو ہر طرف ایک المناک حیرانی ہے اور سناٹا ہی سناٹا۔ اب نہ کوئی رخسار ہی چمکے گا اور نہ تجلی ہی کرے گی کیا متاعِ عزیز ہم سے چھن گئی ہے۔ بار بار یہی خیال دماغ کی سطح سے ٹکراتا اور بے بسی اور اداسی کی ایک لہر سی چھوڑ کر فضاؤں میں پھیل جاتا ہے۔

مخدوم اور مجنوں میں قدرِ مشترک تھی وفاداری۔ وفاداری بہ شرطِ استواری صدیوں کے بعد بھی مجنوں کا عشق تابندہ ہے مخدوم بھی اسی طرح زندہ رہے گا۔ وہ زندہ رہے گا زمانے کی دھڑکنوں میں، تاریخ کے صفحوں پر اور اقلیمِ شاعری میں سرزمینِ نجد سے پھر کوئی قیس پیدا نہ ہو سکا اس سرزمین نے بھی ایک ہی مخدوم پیدا کیا جس نے ہزار تیز و تند ہواؤں میں بھی اپنا چراغ جلائے رکھا۔

مخدوم کے سفرِ زندگی کا سب سے بڑا زادِ راہ تھا دلِ زندہ کی تپش و حرارت اور کوہساروں کی استقامت جس نے اس کو مسکراتے ہوئے طوفانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ و سلیقہ بخشا مگر اسے یہ سلیقہ و حوصلہ یوں ہی نہیں مل گیا اس کے لیے اسے بڑے امتحانوں اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ زمانے کی بھٹی میں تپ تپ کر وہ شرر سے شعلہ اور پھر شعلہ سے آفتاب بنا۔ شرر سے شعلہ اور شعلہ سے آفتاب بننے کی یہ داستان ایک طویل عرصۂ حیات پر محیط ہے۔ اس داستان کا ہر ورق ایک ایسا نقش ہے جو اخلاص و صداقت، پیار و محبت اور تہذیب و شرافت کے رنگوں کی آمیزش سے روشن ہے

تاباں ہے۔

مخدوم کی موت ایک دور کی موت ہے جو عبارت تھا قدیم شائستگی و تہذیب اور عصر حاضر کے عرفان و آگہی کے دل نواز امتزاج سے ایک جذبہ کی موت ہے جو سرگرم کار تھا تکریم حیات اور احترام انسانیت کے لیے ایک عاشق کی موت ہے جو مجنوں اور لیلیٰ کی صداقت کا پرستار تھا اور اخلاص و محبت کا پجاری۔ ایک مرد جانباز و کج کلاہ کی موت ہے جو ہزار مصیبتوں میں بھی سربلند اور آن پر قائم رہا۔ ایک محبوب کی موت ہے جس کے جلوۂ صد رنگ پر سینکڑوں دل دھڑک اٹھتے تھے اور اپنا پیار اس پر نچھاور کرتے تھے، ایک شاعر اور دانشور کی موت ہے جس نے فکر و فن کی نئی راہوں کی نشان دہی کی اور ان راہوں پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔

یہ شہر جو اس کی جولانگاہ رہا اس کی موت پر بس درجہ اداس ہے۔ وہ اداس ہے کہ وہ نغمہ سنج اٹھ گیا جو فضاؤں میں راگ و رنگ کی بارش کر کے تشنہ لبوں کی پیاس بجھاتا تھا وہ اداس ہے کہ اس کا محرم اور راز داں نہ رہا اب وہ کس سے سرگوشیاں کرے اور کس کو اپنا درد دل دکھائے، وہ اداس ہے کہ "شہر میں ایک چراغ تھا نہ رہا"

اس شہر نے اس کی بھگار رنگ شخصیت کے سارے ہی پہلو بے نقاب دیکھے اس کی کوچہ گردی اور بے راہ روی بھی دیکھی اور اس کی فتوحات بھی، اسے تہی دامن بھی دیکھا اور گل بداماں بھی اس کی آشفتہ سری بھی دیکھی اور محبوبیت بھی اور اس شہر نے آخر میں بہ چشم نم وہ منظر بھی دیکھا، آخری سفر کا منظر جو ہزاروں سوگواروں کے آنسوؤں میں شروع ہوا، ہزاروں دلوں کی دھڑکنوں نے اس کا آخری دیدار کیا اور وہ شرر جو شعلہ بنا اور پھر آفتاب بن کر ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

اس کی موت سے پندرہ دن پہلے عمر خاں کے باغ میں صحبت یاراں میسر آئی۔ دوستوں سے ملنے کا اس کا وہی انداز تھا بے محابا اخلاص کا انداز، مسکراہٹوں کو قہقہوں میں بدلنے کا انداز۔ یاران دیرینہ سے مل کر وہ کھل اٹھتا تھا۔ جب بھی اپنی معروف زندگی سے کچھ دیر کے لیے چھٹکارا ملتا تو قدیم دوستوں سے ملنے کے لیے بے چین رہتا۔ اس شام بھی وہ وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی میر حسن کے ساتھ قادر باغ آ پہنچا۔

محفل میں شروع شروع میں وہ خاموش سا تھا۔ میں ہی بولے جا رہا تھا، اسے اکسا رہا تھا کہ وہ بھی طلوع ہو اپنی ساری قہقہہ بدوش جگمگاہٹوں کے ساتھ آہستہ آہستہ ابنوسی شمع روشن ہونے لگی۔ مسکراہٹوں کا رنگ و نور پھیلا اور اس کی بذلہ سنجی کی پھولجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔

لطیفے کے بعد اس کا یہ انداز کہ کندھوں کو ایک خاص انداز سے جنبش دے کر قریب بیٹھے دوست ہاتھ ملاتا جیسے لطیفہ دلوں پر نقش ہو گیا ہے اور یہ نقش وہ لمحہ لطف و انبساط چھوڑ گیا ہے جو اس لطیفہ کا حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ہمیشہ یہی شعار رہا کہ اپنی بذلہ سنجیوں سے اس طرح کے لمحات لطف و انبساط دوستوں کو بخشتا جاتا۔ زندگی نے جب بھی مہلت دی وہ اس طرح دوسروں کو نہال کرتا رہا اور کہتا رہا کہ یارو ہنستے رہو اور ہاتھ ملاتے رہو کہ فرصت دلداگی غنیمت ہے یہ قہقہے ہی تو زندگی کے اندھیروں کبھی کبھی دم شعلہ ساز کا کام دے جاتے ہیں۔ اندھیروں میں اس طرح اجالا کرنا اس کا

محبوب ترین مشغلہ تھا۔ چاہے یہ اجالا قہقہوں سے ہو یا جنونِ عشق کے سوز و گداز سے۔ قہقہے کچھ دھیمے پڑے تو وہ پھر خاموش ہو گیا۔

محفل میں اس کی بار بار خاموشی کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ کیا اسے اپنی ہنگامہ پرور زندگی کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ کیا اسے اپنا بچپن یاد آ رہا تھا جو مذہبی ماحول میں گزرا تھا۔ بچپن میں اسے جذباتی آسودگی نہ ملی جو والدین کی شفقت و محبت ہی میں میسر آ سکتی ہے۔ بچپن ہی میں اسے چند تلخ حقیقتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جوانی آئی تو کچھ رنگینیاں بھی ساتھ لائی۔ دل و نظر کی شادابی کا بھی کچھ سامان بہم ہوا۔ کالج میں پہنچ کر جب اس کی بذلہ سنجیاں عام ہوئیں تو وہ سب کا منظورِ نظر بن گیا۔ دل کی کسک نے اسے ماضی کے رنگین لمحوں کی یاد دلائی تو شاعری نے اپنے معبد کے دروازے اس پر کھول دیے۔ ظرافت اور شاعری ان ہی دونوں جہتوں میں اس کی صلاحیتیں پروان چڑھنے لگیں۔ اس کی مقبولیت بڑھتی گئی اس کے چاہنے والے بڑھتے گئے۔ دوستوں اور پرستاروں کے ہجوم میں اسے زندگی آسان نظر آنے لگی۔ زندگی جو اتنی آسان نظر آئی تو زندگی کے تقاضے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مگر جلد ہی ایک منزل ایسی بھی آئی کہ اس کے اندر کا غور و فکر کرنے والا انسان کروٹیں بدلنے لگا۔ یونیورسٹی سے نکلتے نکلتے اس میں ایک انحراف کا انداز پیدا ہو چلا تھا۔ عام روشِ زندگی سے انحراف، روایتوں سے انحراف، سطحی اخلاق و آداب سے انحراف جب عملی زندگی سے سامنا ہوا تو اس کے خواب حقیقتوں کے سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرائے۔ آلامِ حیات کی کٹھن راہوں سے گزرنا پڑا۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر اس کی تخلیق جاری رہی وہ شعر میں اپنے خوابوں اپنی امنگوں اور آرزوؤں اور اپنے فکر و خیال کو متشکل کرتا رہا۔ آخر وہ ساعت بھی آ گئی جب اس نے اپنی زندگی کا نصب العین متعین کر لیا۔ اور بڑے خلوص سے اس راہ پر چل پڑا۔ کیا اسے زندگی کا وہ موڑ بھی یاد آ رہا تھا جہاں راہ میں اسے ایک اجنبی جانِ غزل مل گیا اور اس کی زندگی میں اپنے شفق رنگ جلوؤں سے رنگینیاں بھر دیں اور ان رنگینیوں نے اس کے سفرِ حیات کی کٹھنائیوں کو کچھ آسان کر دیا۔ کیا اسے یہ سب کچھ یاد آ رہا تھا۔

باغ کا منظر بدلنے لگا۔ بات بڑھتی آ رہی تھی۔ تارے روشن اور تابدار ہوتے گئے۔ درختوں میں کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ آخر مخدوم کی خاموشی ٹوٹی۔ اس کے اندر کے ظریف انسان نے شاعر کے لیے جگہ خالی کر دی۔ شعر کے نزول کے وقت تخلیق کا جو کرب شاعر کو سہنا پڑتا ہے اس کی کچھ تلافی اس وقت ہو جاتی ہے جب شعر نغمہ بن کر سننے والوں کے دلوں میں اترتا جاتا ہے۔ دھیمی دھیمی لے میں خوش آہنگ آواز کے ساز پر اس کا ایک ایک لفظ نغمگی میں ڈوب کر دلوں میں پیوست ہونے لگا۔ جادوگر اپنا منتر پھونک رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح سننے والوں کو مسحور کرنے کا یہ عمل تو وہ زندگی بھر دہراتا رہا۔ قادر باغ کے بوڑھے پیڑ بھی اس عمل کی زد پر تھے۔ ان پر بھی ایک رقت آمیز خاموشی طاری تھی وہ یہ منظر پہلے بھی بارہا دیکھ چکے تھے وہی قہقہوں سے محفل شروع ہوتی پھر آواز کے جادو سے فضا سرمست اور سرشار ہو جاتی اور جب رات ڈھلنے لگتی تو محفل برخاست ہونے لگتی۔ یہ درخت برسوں سے اس طرح کے مناظر کے خاموش تماشائی تھے جو کبھی کبھی

ان کی زندگی میں ایک طلسم کی طرح ابھر آتا تھا۔ پر اس رات کیا ان کا ذوقِ تماشہ بینی کسی احساس درون سے بے تاب اور مضطرب تھا۔

شاعر کی آواز نے وقت کے سینے پر ایک طلسم سا باندھ دیا۔ جادوگر اپنی جھولی میں سے سرور و کیف کا قطرہ قطرہ نچوڑ کر لمحہ بہ لمحہ محفل پر پھینک رہا تھا جیسے ساری زندگی ان ہی لمحوں میں سمٹ آئی ہو۔ مخدوم نے آخر میں سہاگ مٹی سنانی شروع کی جب سننے والوں پر ایک الوہی کیفیت طاری ہوگئی تو نہ جانے عمر کے دل میں کیا آئی کہ مخدوم کے زانو سے لپٹ کر رونے لگا۔ کیا اس کے دل کی گہرائیاں اس آنے والے المناک سانحہ کی پرچھائیں دیکھ رہی تھیں جو پردہ خفا میں منتظر ظہور تھا۔ مخدوم کی آواز میں ذراسی تھرتھراہٹ پیدا ہوئی مگر اس نے نظم اسی انداز میں ختم کی۔ ہمیشہ کے سے خود اعتمادی کے انداز میں نظم ختم ہوئی تو جیسے طلسم ٹوٹ سا گیا۔ ہوش و حواس ٹھکانے ہوئے تو محفل برخواست ہونے لگی۔ تینگے رخصت ہونے لگے۔ درختوں کی خاموشی گہری ہوگئی۔ مخدوم کو رخصت ہوتے دیکھ کر ان گہرائیوں کی دل کی دھڑکنیں تیز سی ہوگئیں۔ کیا وہ شاعر کے دل کی اس آواز کو سن پا رہی تھیں جو اس کے ذہن کی گہرائیوں میں شاید اس طرح اظہار کے لیے بے چین تھی۔

حسن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا
پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

الحاج مرزا شکور بیگ

مخدوم محی الدین

اصل میں خادم تھا لیکن نام کا مخدوم تھا

مخدوم کی جدائی کا غم تازہ ہے ایسے میں کچھ لکھنا آسان نہیں لکھوں بھی تو اس میں ربط کہاں سے لاؤں۔ مخدوم کے انتقال کی خبر ریڈیو سے سنی۔ سکتہ طاری ہوگیا آنکھوں میں آنسو بھر آئے ایسی حالت ہوئی کہ بیان سے باہر۔ مخدوم اتنا قریب تھا، رچا ہوا تھا مجھے خود اس کی خبر نہ تھی۔ پچھلی زندگی کا ایک ایک واقعہ یاد آنے لگا ایک دو دن، برس دو برس کی تو ملاقات نہ تھی کہ یہ سلسلہ جلد ختم ہو جاتا۔ چالیس سال کی دوستی اور دوستی بھی ایسی کہ ہر ملاقات میں اس کا رنگ گہرا ہوتا گیا۔ خلوص میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان بیتے دنوں کی یاد ختم ہونے والی نہ تھی۔ اس کا سلسلہ چلتا رہا۔ نیند کا سوال ہی کیا تھا ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی مگر جی میں رہ رہ کر ایک عجیب آرزو ابھرتی تھی کاش ریڈیو سے تردید ہو جائے کہ مخدوم کے انتقال کی خبر غلط تھی۔ مخدوم زندہ ہے۔

صبح صبح اخبارات آ گئے۔ مخدوم سے متعلق جو خبریں اس میں ملیں ان سے اور بے چینی بڑھی۔ مخدوم کے ہزاروں جلوس نکل چکے تھے، نکلتے رہتے تھے مگر اب آخری جلوس نکلنے والا ہے۔ وہ اس کی میت کا جلوس ہوگا۔

جب شام کے پانچ بجے تو دل میں عجیب سی بے چینی شروع ہوئی۔ گھر سے باہر نکل پڑا اور اپنے خیالات میں گم آہستہ آہستہ نمائش میدان کی طرف چل پڑا۔ یہیں تو مخدوم کی میت کا جلوس آنے والا تھا۔ نمائش کلب کے بڑے ہال میں اس کی میت کو آخری دیدار کے لیے رکھنا طے پایا تھا۔ نمائش میدان کے قریب اور نمائش میدان کے اندر پولیس کا غیر معمولی انتظام تھا۔ مخدوم کو دیکھنے والوں کی تعداد میں دم بہ دم اضافہ ہو رہا تھا۔ نمائش میدان کے درمیانی باب الداخلہ کے دو جانب سڑک پر لوگ کھڑے میت کا انتظار کر رہے تھے۔ نمائش میدان کے اندر باہر سے کہیں زیادہ لوگ موجود تھے۔ نوجوان، جوان اور ادھیڑ عمر والے اور بوڑھے۔ شاعر اور ادیب پروفیسر اور طالب علم، مزدور اور ملازم، لیڈر، غریب اور امیر غرض ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے ہزاروں لوگ جمع تھے۔ مگر سب کے چہروں سے خوشی غائب تھی۔ میں سوچنے لگا کہ خدا کی یہ مخلوق کیوں جمع ہوئی ہے۔ خبریں آنے لگیں کہ اب جلوس قریب آگیا ہے۔ نعرہ وں کی

آوازیں بھی آنے لگیں۔ مخدوم امر ہے، مخدوم امر ہے، جو لوگ ادھر ادھر بیٹھے آرام لے رہے تھے وہ بھی جہاں جگہ ملی جمع ہو گئے نمائش سلب کے سامنے کا وسیع میدان لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ اب مخدوم کی ایک ایک خوبی میرے سامنے آنے لگی۔ اس کی ساٹھ سالہ زندگی ایک کھلی کتاب تھی خصوصاً کالج کے زمانہ سے تو اس کے مرنے تک کا دور ہم سب کی نظروں کے سامنے تھا۔ ایسی طویل پبلک لائف کا بے داغ رہنا معمولی بات نہیں ہے۔ آج کوئی ہے جو یہ کہے کہ مخدوم نے مجھے دھوکا دیا۔ میرے پیسے کھا گیا۔ ہے آج کوئی یہ کہے کہ عالمگیر شہرت کا حامل ہونے کے بعد مخدوم کا دماغ خراب ہو گیا تھا، اس میں غرور پیدا ہو گیا تھا، اس کے ملنے ملانے کے طریقے بدل گئے تھے کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ مخدوم کسی کی غیبت کرتا تھا، کسی کو برا بھلا کہتا تھا۔ کبھی اس نے جھوٹ کہا یا وہ بات منہ سے نکالی جو اس کے دل میں نہ تھی۔ اس کا دل اور زبان دونوں ایک تھے مصلحت وقت نے کبھی اسے وہ بات کہنے سے باز نہ رکھا جسے وہ سچ سمجھتا تھا۔ نہ وہ اوروں کے عیب تلاش کرتا تھا نہ اسے کسی سے بغض تھا۔ مخدوم ہر بیچارے کا چارہ تھا، وہ ہر بے کس کا کس تھا اور بے سہارے کا سہارا تھا۔ وہ لوگ جنہیں دوسرے منہ لگانا بھی پسند نہ کرتے تھے مخدوم ان سے مصافحہ کرتا تھا۔ ان کی روداد غم توجہ سے سنتا تھا ان کی تکالیف کو دور کرنے کی فکر کرتا تھا۔ غرض ان کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوتا تھا۔ اسے دھن تو یہی اور فکر تھی تو یہی کہ دبے ہوئے کچلے ہوئے ابھریں محروموں کا ان کا حق ملے، مظلوم نہ پیں، ظالم کیفر کردار کو پہنچیں۔ مخدوم چاہتا تو عیش و آرام کی زندگی بسر کر سکتا تھا کسی یونیورسٹی کا پروفیسر بن جاتا ایسی زندگی گزارتا جس پر دوسرے رشک کرتے۔ مگر اس نے اپنے اوپر آرام کو حرام کر لیا تھا۔ لیڈر بنا تو ایسا کہ لیڈر بھی اس کے مقلد ہو گئے۔ شاعری کی تو ایسی کہ ایک نئی روح پھونک دی۔ جس آگ میں جلتا رہا وہ آگ اس نے دوسروں کے سینے میں بھی لگا دی اس نے کسی کا حق نہیں دبایا، کسی سے بد معاملگی نہیں کی وہ کسی کی برائی میں نہ تھا۔ وہ ہر ایک کا بھلا چاہتا تھا اس کے کام میں نہ دکھاوا تھا نہ ریا وہ دھن کا پکا اور زبان کا سچا تھا۔ اس نے برائی بھی کی تو چھپا کر نہیں کی۔ اختلاف اس کے عقیدے سے کیا جا سکتا ہے مگر اس کا خلوص مسلمہ تھا اس کی لگن، اس کی تڑپ اس کے نصب العین سے سب واقف تھے۔ وہ جو سمجھتا تھا وہی کہتا تھا اور جو کہتا تھا اسی پر عمل کرتا تھا اس نے بڑے کٹھن دور سے لیڈری شروع کی بیکسوں بیچاروں اور غریبوں کی موافقت میں آواز اٹھانا بغاوت سے کم نہ تھا۔ اس نے جان کی بازی لگا کر یہ کام شروع کیا۔ اس نے کامیاب لیڈری کی۔ مگر لیڈری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ لالچ اس میں نام کو نہ تھی۔ اتنی لیڈری کی طویل مدت میں اس نے اپنے لیے موٹر، موٹر سیکل تو کجا ایک سیکل بھی نہیں خریدی۔ اس کا تو رہنے کے لیے کوئی ذاتی گھر بھی نہ تھا۔ آج یہی مسئلہ اس کے پسماندگان کے سامنے آ رہا ہے کہ اسمبلی کوارٹرز سے تخلیہ کے بعد سر چھپانے کا ٹھکانہ کہاں تلاش کیا جائے۔ ایسے ایثار و قربانی کی مثال کون پیش کر سکتا ہے مخلوق خدا کی خدمت بے لوث خدمت سچی خدمت اور پرخلوص خدمت ہی نے اسے مخدوم بنا دیا تھا۔ وہ اخلاقی خوبیاں تھیں جو غیر معمولی ہیں۔ ان ہی خوبیوں اور خدمات کی وجہ سے لاکھوں دلوں میں مخدوم کی جگہ تھی۔ اس کے سیاسی حریف بھی مخدوم کے خلوص اور اخلاق کے معترف تھے وہ بڑا پیارا انسان تھا۔ اس کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی وہ خود ایک انجمن تھا

امیر و غریب، شاعر اور غیر شاعر، آجر اور مزدور سب مخدوم کے گرویدہ تھے ایسے متضاد طبقوں میں مخدوم کی مقبولیت اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ خیالات کا یہ لامتناہی سلسلہ میرے دماغ میں چلتا رہا میں سوچنے لگا کہ ایک شخص جس نے حقوق العباد یا انسانی حقوق کی ادائی اس بہتر طریقہ پر کی ہو بڑا کیسے ہو سکتا ہے۔ زبان خلق کو نقارۂ خدا کہتے ہیں۔ آج کوئی نہیں جو مخدوم کو برا کہے۔ اس کا ذکر برائی سے کرے۔ سب کی زبان پر اس کی تعریف ہے اس کی توصیف ہے۔ ہر ایک یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کا سچا دوست بچھڑ گیا۔ بیمار سمجھتے ہیں کہ ان کا تیمار دار چلا گیا۔ غریب و بے کس سمجھتے ہیں کہ ان کا ہمدرد و ہمی خواہ اٹھ گیا۔ میت جدھر سے گزرنے والی تھی اس کے دونوں جانب غریب اور ضعیف بھی بہت سے جمع تھے جو مخدوم کے آخری دیدار کی حسرت نکالنا چاہتے تھے۔ مرتے سب ہیں اور مناسب کوچ مگر ایسی موت جس پر عوام تڑپ اٹھیں مخدوم کے نصیب میں تھی جسم کے جائے جس حصہ میں درد ہو، تکلیف ہو آنسو آنکھ ہی سے گرتے ہیں۔ آج جسم کی وہی ہمدرد آنکھ بند ہو گئی ہے جو دوسروں پر رحم کرتا ہے اس پر رحم کیا بھی جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا تھا کہ زمین والوں پر رحم کرو تا کہ آسمان والا تم پر رحم کرے۔ مخدوم نے اس پر عمل کیا۔ اس عمل کا نتیجہ تو نکلنا تھا چنانچہ نکلا اور بیسیوں نے دیکھا کہ چادر گھاٹ کے قبرستان سے جہاں مخدوم کی تدفین کا اخباری اعلان ہوا تھا۔ وہ جگہ یکایک بدل دی گئی اور حیدرآباد کے ایک مشہور بزرگ حضرت شاہ خاموش رح کی درگاہ شریف کے احاطہ میں مخدوم کو جگہ دی گئی اور سینکڑوں لوگ متاثر و ملول اس کی تدفین میں شریک تھے۔ اب وہ حضرت شاہ خاموش رح کے احاطہ میں اپنے قدیم دوست شاہد صدیقی کے بازو خاموش پڑا آرام کر رہا ہے۔ نہ معلوم دوسروں کا کیا تاثر تھا مگر میری زبان سے تو یہی نکلا: "رحمت حق بہانہ می جوید"

رات کے دس بجے کے بعد گھر واپس ہوا راستہ میں یہ اشعار موزوں ہوئے ؎

خورد و کلاں کو اپنا بنا کر چلا گیا — اک آگ سی دلوں میں لگا کر چلا گیا
ہیتوں میں تھا خلوص تو بھولوں میں تھی وفا — ایسی بہار سب کو دکھا کر چلا گیا

—:—

خوبیاں وہ تھیں کہ خاص و عام کا مخدوم تھا — اصل میں خادم تھا لیکن نام کا مخدوم تھا
نام کے مخدوم یوں تو اور بھی ہوں گے مگر — اپنا جو مخدوم تھا۔ وہ کام کا مخدوم تھا

—:—

ہر دل کو داغ دار بنا کر چلا گیا
محفل کو سوگوار بنا کر چلا گیا
پروردۂ خزاں کو بھی اپنے کلام سے
دلدادۂ بہار بنا کر چلا گیا

یحییٰ صدیقی

اقامت خانہ کی زندگی

جناب یحییٰ صدیقی کا شمار جامعہ عثمانیہ کے ممتاز طلبا میں کیا جاتا ہے۔ موصوف شعبۂ دینیات کے طالب علم تھے لیکن انگریزی، اردو اور فارسی علم و ادب سے دلچسپی شعبۂ فنون کے دوسرے طلبا کے مقابلے میں کچھ کم نہ تھی۔ یحییٰ صاحب مخدوم کے خاص دوستوں میں تھے۔ فرحت منزل" اور نظامت منزل کے اقامت خانہ میں مخدوم، یحییٰ اور میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ یحییٰ صاحب حیدرآباد سول سروس۔ ایس میں تھے۔ کئی سال قبل ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے وہاں کے رسائل میں ان کے مضامین علمی اور ادبی موضوعات پر شائع ہوئے ہیں۔ موصوف نے دو سماجی ناول بھی لکھے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے اقامت خانوں کے ماحول میں مخدوم کی شخصیت کی ابتدائی تشکیل ہوئی تھی۔ اس فضا کا کچھ اندازہ یحییٰ صاحب کے اس مضمون سے ہوتا ہے جو انھوں نے جامعہ کی گولڈن جوبلی کے لیے لکھا تھا۔ (ادارہ)

جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں جامعہ کے طلبا کے لیے چار مختلف عمارتوں میں اقامت خانے قائم تھے۔ ایک اقامت خانہ طیلسانیین کے لیے مخصوص تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں رہتے تھے۔ اس کا نام نظامت منزل تھا۔ اس اقامت خانہ میں غیر طیلسانیین بھی قیام کر سکتے تھے۔ ایک اقامت خانہ ہندو طلبا کے لیے مخصوص تھا اور دو اقامت خانے غیر طیلسانیین مسلمان طلبا کے لیے تھے۔ ان کے نام فرحت منزل اور مسرت منزل تھے۔ ان میں طیلسانیین کو قیام کی اجازت نہیں تھی۔

مسرت منزل شہر کی سب سے زیادہ معروف سڑک پر جامعہ کی عمارتوں سے قریب تھی اور فرحت منزل شہر کے نسبتاً پرسکون حصہ میں تھی۔ اس کے شمال میں لنگر کوٹھی سارک تھی جس کی توسیعی عمارتیں مغرب کی سمت میں تھیں مشرقی جانب سڑک اور سڑک کی دوسری طرف نلس پادشاہ کی قیامگاہ اندن گارڈن تھی۔ جہاں وہ اپنے دونوں صاحبزادگان اعظم جاہ

اور معظم جاہ کے ساتھ سکونت پذیر تھیں۔

میں مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ گلبرگہ شریف سے میٹرک کامیاب کرنے کے بعد جب حیدرآباد پہنچا تو وہاں میری ملاقات اسکول کے دو پرانے ساتھیوں سے ہو گئی وہ دونوں فرحت منزل میں قیام پذیر تھے اور ان ہی کے مشورہ کی بناء پر میں بھی وہیں پہنچ گیا اور آج بھی میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ میں نے فرحت منزل میں قیام کا فیصلہ کیا۔

چونکہ میرا قیام فرحت منزل میں اور بی اے کے بعد نظامت منزل میں رہا تھا اس لیے میں جو کچھ عرض کروں گا وہ ان ہی اقامت خانوں کی زندگی سے متعلق ہوگا۔ دوسرے اقامت خانوں کے بارے میں چوں کہ میری معلومات زیادہ نہ سماعی ہیں اس لیے ان کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اقامت خانہ میں قیام سے طالب علم کو بہت سے ایسے تجربات بھی حاصل ہوئے ہیں جو گھر کے ماحول حاصل نہیں ہو سکتے۔ اقامت خانوں میں رہنے والے طالب علموں کا تعلق مختلف علاقوں سے ہوتا ہے، ان کی ذہنی صلاحیتوں میں اختلاف ہوتا ہے ان کی سماجی حیثیتیں مختلف ہوتی ہیں ان کے رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے ملنے جلنے کھانے پینے کے طور طریقے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ لیکن اقامت خانے میں وہ سب ایک سطح پر ہوتے ہیں ان کا ماحول ایک ہو جاتا ہے ان کے عادات ایک ہو جاتے ہیں اس لیے رفتہ رفتہ ان کے مشاغل میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے وہ اپنی پسند ناپسند کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں ان میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا سیکھ جاتے ہیں مختلف طبائع کے ساتھ زندگی کا گر سیکھ جاتے ہیں حسن سلوک کی عادت پڑتی ہے تلخ و شیریں کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے رواداری پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کے سامنے آنے کی وجہ سے مردم شناسی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا آجاتا ہے۔

اس تربیت کی وجہ سے کردار میں ایسی پختگی آجاتی ہے کہ عملی زندگی میں ہر صورتحال کا کامیابی سے مقابلہ کرنا ممکن ہو جاتا ہے، ناکامی کی صورت میں یاسیت کا شکار نہیں ہوتے، ہمت نہیں ہارتے آسانی سے شکست تسلیم نہیں کرتے۔

گھر کے جانے پہچانے ماحول میں طالب علم کو مواقع میسر نہیں آتے، اس کی تربیت کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے وہ اتنا جہاں دیدہ اور سرد گرم چشیدہ نہیں ہوتا جتنا اقامت خانہ میں رہا ہوا طالب علم ہوتا ہے، اسی لیے اس میں جرأت بیباکی اور نڈرپن بھی اتنا نہیں ہوتا، ان میں سے بیشتر بہت جلد ہراساں ہو جاتے ہیں۔ معمولی سی ناکامی ان میں شکست خوردگی کا احساس پیدا کر دیتی ہے وہ یاسیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔

اقامت خانے کی زندگی کا ایک تاریک پہلو بھی ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

عام طور پر گھروں میں پابندیاں زیادہ ہوتی ہیں، یہ مت کرو، وہ مت کرو، یہاں مت جاؤ، وہاں مت جاؤ، اس سے مت ملو، اس سے مت ملو، اس سے بات مت کرو، کیا کھیل میں وقت ضائع کر رہے ہو پڑھو — وغیرہ وغیرہ، اقامت خانے

میں یہ پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں، ہر قسم کی آزادی حاصل ہوتی ہے، اگر ایسے زمانے میں اچھا ماحول نہ ملے، صحیح رہبری نہ ہو تو طالب علم کا خدا ہی حافظ ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے اقامت خانوں کا ماحول عام طور پر بہت اچھا ہوتا تھا۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہم کو جناب عبدالرحمٰن خاں صاحب جیسے پرنسپل کی سرپرستی حاصل تھی۔ ہر اقامت خانے کے لیے بطور خاص ایسے اساتذہ کو بحیثیت مودب مقیم منتخب فرماتے تھے جو ہمدرد، مشفق ہونے کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط برقرار رکھنے کی خاص اہلیت رکھتے تھے۔

جامعہ کے اقامت خانوں میں فرحت منزل کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ ادبی جیسی متنوع مشاغل سے دلچسپی رکھنے والے طلبا اس اقامت خانہ میں تھے ویسے کسی اور اقامت خانہ میں نہیں تھے اس کو تعلّی نہ سمجھا جائے بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فرحت منزل کو جامعہ کے بعض مایہ ناز فرزندوں کو اپنی آغوش میں پالنے کا فخر حاصل رہا ہے۔

اندرون ملک اور بیرون ملک مادر جامعہ کا نام روشن کرنے والے کئی ڈاکٹر اور انجینئر اسی اقامت خانہ میں رہے تھے۔ بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے والا تیراک شفیع اسی اقامت خانہ میں مقیم تھا اور یہیں کی چھوٹی سی باؤلی میں تیراکی کی مشق کیا کرتا تھا، کل ہند شہرت والے موسیقار رؤف کی تانیں اسی اقامت خانے میں گونجی تھیں، کل ہند شہرت والا فٹبال کا کھلاڑی عفیف احمد قریشی، مشہور شاعر سکندر علی وجد اور ان کے علاوہ ان گنت معروف اور غیر معروف کھلاڑی، شاعر، فنکار اسی اقامت خانہ کے رہنے والے تھے۔

دکن کے مایہ ناز فرزند اور مادر جامعہ کے سپوت مخدوم محی الدین نے جس نے محنت کش طبقہ کو ان کا جائز حق دلانے کے لیے ان کو سرمایہ داری کی چیرہ دستیوں سے بچانے کے لیے ان کو دیسکھوں کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے اپنا عیش و آرام تج دیا، اپنے اوپر زندگی کی ساری آسائشیں حرام کر لیں جس نے سماج میں ان کا صحیح مقام دلانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی جس نے ان کے مسائل حل کرنے کے لیے اپنا دن کا چین قربان کر دیا، راتوں کی نیند حرام کر لی جس نے ان کی خاطر اپنی زندگی کے کئی بہترین سال جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں گزار دیے۔ اس مطرب انقلاب نے اس صبح نو کے پیغامبر نے جس کے نغموں سے سرمایہ داری کے بلند و بالا ایوان لرزنے لگتے ہیں اور روندے ہوئے کچلے ہوئے محنت کشوں میں کچھ کر گزرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے جس کے نغموں میں شعلوں کی لپک بھی ہے اور شبنم کی ٹھنڈک بھی، وہ ادیب جس کی تحریریں زندگی سے بھرپور ہیں وہ فنکار جس کا لوہا اس کے سارے ہم عصر مانتے ہیں وہ جس سے دنیا کے ہر خطہ کے محنت کش اتنی ہی اچھی طرح واقف ہیں جتنی اچھی طرح تلنگانہ کے مزدور اور کسان واقف ہیں، اپنا پہلا نغمہ اسی اقامت خانہ میں گایا تھا۔

جب میں اپنے ارد گرد ان دلچسپ شخصیتوں کو دیکھتا ہوں تو خود کو ذرا حقیر محسوس کرتا ہوں پھر بھی میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے کہ میں بھی اس کارواں میں شامل تھا میں نے اپنے ہمعصر دوستوں اور ہم جماعتوں سے بہت کچھ سیکھا۔

یہ اقامت خانہ جو چار سال تک میرا گھر رہا دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ میں مودب مقیم رہتے تھے اور دوسرا مقیمین کے لیے مختص تھا جس عمارت میں ہم لوگ ... ... تھے ... دو گیٹ تھے ایک ہمیشہ مقفل رہتا تھا اور دوسرے پر

ایک چوکیدار تعینات تھا۔ دن کو یہ چوکیدار بڑا معصوم، بے زبان اور اطاعت گزار نظر آتا تھا۔ لیکن رات کے نو بجتے ہی انتہائی سخت گیر میر پرست بن جاتا تھا اس کی آنکھ بچا کر اندر آنا اور اس کے سامنے سے بغیر ڈانٹ کھائے گزرنا ناممکن تھا اور اگر کہیں زیادہ دیر ہو جاتی تو صبح کو موذب مقیم صاحب کے سامنے پیشی ہوتی اس پیشی میں کیا ہوتا تھا یہ نہ پوچھیے۔

عمارت کے مردانے صحن میں ایک چھوٹا سا چمن تھا جس کے وسط میں حوض بنا ہوا تھا۔ ارد گرد پھولوں کی کیاریاں تھیں ادھر ادھر لاتعداد آم اور جام کے درخت لگے ہوئے تھے۔ امتحانات کے زمانہ میں دن کو ان درختوں کے نیچے اور رات کو حوض کے ارد گرد بیٹھ کر ہم لوگ انفرادی اور اجتماعی طور پر امتحان کی تیاری کرتے تھے۔ بغلی صحن جس کی لمبائی چوڑائی تیس تیس فٹ ہوگی ہمارا کرکٹ کا میدان تھا جہاں چھٹی کے دن بہت پابندی سے کرکٹ میچ کھیلے جاتے تھے۔

ایک صحن زنانہ حصہ میں بھی تھا اس میں تین جام کے درخت تھے اور ایک نیم کا درخت تھا۔ اس صحن میں بھی کبھی کبھی کرکٹ کھیلی جاتی تھی۔ لالہ امرناتھ بھی اس صحن میں ہمارے ساتھ کرکٹ کھیل چکا ہے۔

موذب صاحب والے حصہ میں والی بال اور ٹینس کورٹ تھے۔ اسی حصہ میں کھیلوں کے سالانہ مقابلے بھی ہوتے تھے۔

تحریک ترک موالات کے زمانہ میں علی گڑھ سے نکلے ہوئے بعض طلبا جب جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوئے تو ان میں سے چند نے فرحت منزل میں قیام کیا اور علی گڑھ کی بعض روایات کو وہاں رائج کیا۔ ان کے جانشینوں نے بھی ان روایات کو باقی رکھا تا آنکہ سب اقامت خانے اڈیکمیٹ منتقل ہوگئے اور ان کی انفرادیت ختم ہوگئی۔

اقامت خانہ میں ہر طالب علم کو سونے کے لیے ایک تخت اور لکھنے پڑھنے کے لیے ایک ایک میز اور ایک ایک کرسی ملتی تھی۔ جب جامعہ کی مستقل عمارتیں تیار ہوگئیں تو فرنیچر نہ صرف بڑھا دیا گیا بلکہ بہتر بھی کر دیا گیا۔ طالب علموں کو ان کی سینیارٹی کے لحاظ سے ایک دو تین اور چار پلنگ والے کمروں میں رکھا جاتا تھا۔ رہائش کا انتظام حکومت کی طرف سے مفت تھا۔ طالب علموں سے کرایہ نہیں لیا جاتا تھا۔ ہم کو ماہانہ ساڑھے سترہ روپے ادا کرنے پڑتے تھے۔ پندرہ روپے کھانے کے اور ڈھائی روپے میں دھوبی، حجام، کھیل، انجمن کا چندہ سبھی کچھ شامل تھا۔ دھوبی اور حجام پرانے ہونے کی وجہ سے جونیر طلبا پر دھونس جمایا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میں نے حجام سے کہا تھا:

"تم کیسی ڈاڑھی بناتے ہو کہ کھونٹیاں جوں کی توں رہ جاتی ہیں۔"

کہنے لگا: "آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں آپ کی ڈاڑھی تو استرے کی بھاپ سے نکل جاتی ہے کھونٹیاں کہاں باقی رہیں گی۔"

بیشتر مقیمین کا تعلق متوسط گھرانوں سے تھا، ان کے سرپرست فیاضی کے ساتھ جیب خرچ نہیں دے سکتے تھے عام طور سے بیس سے پچیس روپے تک گھر سے ملتے تھے جن میں سے اقامت خانہ کے مطالبات ادا کرنے کے بعد ڈھائی روپیہ سے لے کر ساڑھے سات روپیہ تک بچ جاتے تھے، اس میں چائے سگریٹ، پان سینما احباب کی خاطر داری اور بھی کچھ ہو جاتا تھا۔ سستے زمانے تھے، ہر چیز کی ہائے ہائے نہیں تھی۔ دو پیسہ میں پان مل جاتا تھا بہترین مزیدار پان تین پیسے میں سگریٹ کی ڈبیا، ایک پیسہ میں ماچس، ایک آنہ میں بالائی دار چائے کی پیالی اور سینما کا ٹکٹ چار آنے، ہم سات آٹھ رپول

میں شاہزادوں کی سی زندگی گزارتے تھے۔

جو زندگی ہم نے اقامت خانہ میں گزاری اس کے لیے ہمارے ساتھی عمر بھر ساری عمر ترستے ہی رہے بعض کو اس کی عشر عشیر آسائشیں بھی میسر نہ آ سکیں۔

اقامت خانہ میں ہم مذاق طلبا کی ٹولیاں بن جاتی ہیں۔ ان کی عام سی تقسیم یوں کی جا سکتی ہے (۱) رٹو (۲) کھلنڈرے (۳) مذہبی اور (۴) ہمہ صفت۔

اقامت خانہ کی ساری رونق، ساری گہما گہمی ساری رنگ آرائیاں کھلنڈرے اور ہمہ صفت طلبا کے دم سے تھیں ان دونوں پارٹیوں کے مشترکہ لیڈر ایک صاحب شاہ خاں نامی تھے۔

باوجود اس کے کہ میں اقامت خانہ کی سب سے بااثر پارٹی کا رکن تھا، اقامت خانہ کی روایات کا پورا پورا احترام کرتا تھا، اپنی انتہائی دلکش، رسیلی اور وجد آفرین آواز میں گانا بھی سنا چکا تھا اس کے بعد بھی ایکٹوٹی سے نہیں بچ سکا۔ اور ایک رات (خدا کا شکر ہے کہ وہ کوئی سرد رات نہیں تھی) جب میں گہری نیند سو رہا تھا مجھ پر پانی پھینکا گیا۔

گانے کی روایت اسی سال شروع کی گئی تھی جس سال میں پھنسا۔ ہوا یہ کہ کسی نے افواہ اڑا دی کہ نوواردوں میں سے ایک صاحب گانا بہت اچھا گاتے ہیں۔ ان کا پتہ چلانے کا آسان طریقہ یہ تھا کہ روایت کا سہارا لیا جائے۔ چنانچہ اس طرح ہر ایک کا گانا سن لیا گیا۔

اس موقع پر میں اپنے چند ہم عصروں کا تعارف کرانا ضرور سمجھتا ہوں۔ ان میں سے بیشتر نے نہ تو جامعہ میں کوئی مقام حاصل کیا نہ بعد کی عملی زندگی میں لیکن اقامت خانہ کے قیام کے دوران ان کا شمار دلچسپ شخصیتوں میں کیا جاتا تھا۔

(۱) زیدی صاحب (معاف فرمائیے ان کا پورا نام یاد نہیں رہا) اقامت خانہ کی انجمن کے صدر تھے۔ بڑے طور طریقے کے نوجوان۔ کم سخن کم آمیز اس لیے زیادہ تر کمرے میں گھسے رہتے تھے حتیٰ کہ کھانا بھی کمرہ میں کھاتے تھے اور کھاتے وقت آئینہ سامنے رکھ لیتے تھے تاکہ نوالہ چبانے وقت منہ کے حسین زاویے بنانے کی مشق کر سکیں۔ ان کی اس حرکت کا دوست احباب مذاق بھی اڑاتے تھے مگر یہ کوئی نوٹس نہیں لیتے تھے۔ جب تک اقامت خانے میں رہے اپنی مشق جاری رکھی۔

(۲) عبدالرزاق خاں صاحب صولت تھے پٹھان مگر ایسے دھان پان کہ زور سے ہوا چلے تو اڑ جائیں ان کو اپنی اس کمزوری کا شدید احساس تھا (اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ کبھی ان کی پٹائی ہو گئی ہو اس لیے کہ اپنے ساتھیوں کو تنگ کرنے میں ان کو خاص لطف آتا تھا) یہ اپنی جسمانی طاقت بڑھانے کے لیے جام کے درخت کی ایک نیچی شاخ پر لٹک کر صبح شام ورزش کیا کرتے اور ہر ایک کو اپنے بازو دکھا کر کہتے دیکھو پٹھے کیسے فولادی ہو گئے ہیں مچھلیاں کیسی ابھر آئی ہیں (کئی سال بعد جب میں نے ان کو دیکھا تو خاصے فربہ اور تنومند ہو چکے تھے)

(۳) ڈاکٹر وحید الزماں (کہیں یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ سچ مچ ڈاکٹر تھے، جی نہیں ان کے والد ڈاکٹر تھے اس لیے یہ اور ان کے سب بھائی ڈاکٹر کہلاتے تھے) بڑی پابندی سے کالج جاتے تھے مگر خالی ہاتھ اس لیے کہ نہ تو کاپیاں کتابیں

خرید نے کے قائل تھے نہ نوٹ لینے کی زحمت گوارا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بہت سے الّو کے پٹھے جو پڑھنے لکھنے خاک نہیں لیکن ڈھیروں کاپیاں خرید لیتے ہیں اور اساتذہ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ نوٹ کر لیتے ہیں ان کا آخر مصرف کیا ہے۔ امتحان کے قریب ان سے لے کر پڑھ لوں گا۔ جب پکا پکایا مل سکتا ہے تو پکانے کی زحمت کیوں کی جائے اور لطف کی بات یہ ہے کہ کسی امتحان میں فیل نہیں ہوئے ان کو کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، پیدل چلنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ شام کی چائے پیتے ہی ٹہلنے نکل جاتے اور حسین ساگر کے کٹے کا چکر لگا کر رات کے کھانے کے وقت تک لوٹ آتے رات کے کھانے کے بعد خدا جانے کب تک دار المطالعہ کی میز پر جوان کے پلنگ کا بھی کام دیتا تھا بیٹھ کر سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے سے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی ملتے رہتے تھے۔ یہ کب سوتے تھے اور کب اٹھ جاتے تھے یہ کوئی نہ جان سکا اس لیے کہ ان کو ہر وقت جاگتا ہی پایا گیا۔ مذہب سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ یار لوگ گھیر گھار کر ان کو جمعہ کی نماز کے لیے لے گئے جب امام پہلی رکعت کے بعد رکوع میں گیا تو "لاحول ولا قوۃ کیا لغویت ہے" کہتے ہوئے صف سے باہر آ گئے اور اقامت خانہ پہنچ کر ہی دم لیا۔

(۴) یہ صاحب جو جام کے درخت کے نیچے کھڑے بال سنوارتے نظر آتے تھے ڈاکٹر وحید الزماں کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر رفیع الزماں تھے۔ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح کم آمیز تھے اور ساتھ ہی ساتھ کم سخن بھی تھے جیسے بیچارے کے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ انتہائی گہرے دوستوں سے بھی جن کی تعداد یہی کوئی تین چار تھی ان کی بات چیت کم ہی ہوتی تھی (اب تو ماشاء اللہ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے اور خوب باتیں کرنے لگے ہیں) رفیع کو کھیلوں سے دلچسپی تھی، ہاکی، کرکٹ اور ٹینس ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔ لیکن ان کا سب سے محبوب مشغلہ یا تو جام کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر بال سنوارنا یا درخت پر چڑھ کر جام توڑنا تھا۔

(۵) عبد القادر صاحب بی اے میں بڑی پابندی سے فیل ہوتے تھے کب سے فیل ہو رہے تھے یہ معلوم نہ ہو سکا اس لیے کہ یہ اقامت خانہ کے سب سے سینیر طالب علم تھے۔ آدمی وضع دار تھے کالج کھلتے ہی اپنے نام جہام یعنی پاندان خاصدان اور اگالدان کے ساتھ تشریف لے آتے اور اقامت خانہ کے سب سے بڑے کمرے میں پڑ جاتے (اس کمرہ میں گنجائش تو چھ آدمیوں کی تھی لیکن وہ اکیلے ہی رہتے تھے)

نہ کسی سے ملتے نہ اقامت خانے کے ہنگاموں میں کوئی دلچسپی لیتے تھے ہر وقت اپنے کمرے میں گھسے رہتے تھے دوست احباب کے معاملہ میں بھی زیادہ خوش نصیب نہیں معلوم ہوتے تھے۔

(۶) غلام دستگیر رشید صاحب شاعر کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے مذہبی آدمی تھے ان کی اپنی ایک چھوٹی سی جماعت تھی جو بشمول ان کے چار افراد پر مشتمل تھی چاروں مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب، مولانا عبد الباری صاحب اور جناب الیاس برنی صاحب کے حلقہ بگوشوں میں تھے۔ مذہب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ خود بھی شرعی احکام کی پابندی کرتے تھے اور دوسروں سے بھی پابندی کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے اس اصلاحی جذبے کی وجہ سے ایک مرتبہ بیچارے کو

بڑی ندامت اٹھانا پڑی۔ مخدوم اقامت خانہ میں نیا نیا آیا تھا وہ بظاہر تو بڑا معصوم نظر آتا تھا مگر دراصل تھا "بڑا الیوٹ" اس کی باتوں سے شاعر صاحب کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ وہ بھی بڑا مذہبی قسم کا جوان صالح ہے انھوں نے اس کو فجر کی نماز کے لیے اٹھانا شروع کیا، دو چار دن تو مخدوم تکلفاً خاموش رہا لیکن آخر تابہ کے، مجبور ہو کر اس نے شاعر صاحب سے کہا" شاعر صاحب میں رات کو دیر سے سونے کا عادی ہوں صبح جلدی نہیں اٹھ سکتا آپ مجھے فجر کی نماز کے لیے نہ اٹھایا کیجیے" مگر شاعر صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ انھوں نے سلسلہ جاری رکھا آخر ایک دن مخدوم نے ان کو آخری نوٹس دیا۔" دیکھیے شاعر صاحب اگر آپ نے صبح اٹھانے کا سلسلہ ختم نہ کیا تو اچھا نہ ہوگا" شاعر صاحب بڑے مرد مجاہد ان پر ان دھمکیوں کا کیا اثر ہوتا، انھوں نے حسب معمول مخدوم کو اٹھانے کی کوشش کی۔ مخدوم کی آنکھ کھل گئی اور وہ کسمسانے لگا، شاعر صاحب نے اس کے جسم پر سے شال ایک جھٹکے کے ساتھ گھسیٹ لی اور فوراً وہاں سے لاحول پڑھتے ہوئے بھاگے، اس لیے کہ مخدوم مادرزاد برہنہ لیٹا ہوا تھا، اس کے بعد پھر کبھی انھوں نے مخدوم کو اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔

(۷) عفیف احمد قریشی میڈیکل کالج کا طالب علم تھا، پڑھتا کم تھا، کھیلتا زیادہ تھا، غضب کا کھلنڈرا تھا، نام تو اس نے صرف فٹبال میں پیدا کیا لیکن ہر کھیل میں ماہر تھا، اور ہر کھیل میں شریک رہتا تھا۔ ہم میں سے بعض لوگ امرود کے تیسرے درخت پر قبضہ کیے ہوئے تھے اور زور سے چھلانگ لگا کر اس کی ایک نیچی شاخ کو پکڑ کر جھولا کرتے تھے عفیف وہاں بھی موجود ہوتا تھا۔ ایک دن اس نے چھلانگ لگا کر شاخ پکڑنا چاہی مگر چوک گیا اور ہاتھ توڑ بیٹھا۔ اس دن سے کھیل ختم ہوگیا اور بیچارہ جام کا درخت یتیم ہوگیا۔

(۸) اقامت خانہ کی سب سے محبوب اور دلچسپ شخصیت مہدی کی تھی ان کا ذکر سب سے آخر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ ان کو میں اقامت خانہ کا اپنے زمانہ کا سب سے اہم آدمی سمجھتا ہوں۔ اور اسی لیے تعارف بھی زیادہ تفصیل سے کرانا چاہتا ہوں۔ عفیف کی طرح یہ بھی ہر کھیل یکساں مہارت کے ساتھ کھیلتے تھے اور فٹبال ان کا بھی محبوب کھیل تھا۔ اقامت خانہ میں کوئی ایکٹیوٹی ان کے علم و اطلاع اور ان کے مشورہ کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی خطرہ کی صورت میں یہ سب سے آگے ہوتے تھے۔ اگر کسی سرکش قسم کے مقیم کو سزا دینی ہوتی تو یہ خوشگوار فریضہ وہ تنہا انجام دیتے تھے۔

ایک سال ایک صاحب علی گڑھ سے آئے سال سوم کے طالب علم تھے، بیرون ملک جانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ فرحت منزل کی شہرت سن کر عارضی قیام کے لیے وہاں آگئے۔ ان کو یہ گھمنڈ تھا کہ وہ علی گڑھ سے آئے تھے وہاں کے بڑے بڑے جغادریوں کو بھگت چکے تھے۔ خود بھی بڑے بڑے معرکے سر کر چکے تھے۔ بڑے بڑے سرکشوں کو نیچا دکھا چکے تھے بیچارے فرحت منزل والے کیا اور ان کی حیثیت کیا، چنانچہ اپنی برتری منوانے کے لیے انھوں نے اقامت خانہ کی روایات کا احترام کرنے سے انکار کر دیا، انھوں نے جان بوجھ کر فرحت منزل والوں کی توہین کی تھی ان کی غیرت کو للکارا تھا اس لیے ان کو نوٹس دے دیا گیا کہ اس گستاخی کی سزا بھگتنے کے لیے تیار رہو۔ انھوں نے بات ہنسی میں ٹالنی چاہی لیکن دو ہی دن میں ان کو اندازہ ہوگیا کہ خطرناک حریف سے پالا پڑا ہے اور بات ہنسی دل لگی سے بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ انھوں

نے قلعہ بند ہو کر حریف کے مقابلہ کا فیصلہ کیا حریف کو بھی معلوم تھا کہ فصیل میں کہاں کہاں رخنے ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ایک کمزور رخ سے حملہ کا منصوبہ بنایا گیا، تمام انتظامات مکمل تھے اور ان کی ایسی گت بنتی کہ ساری عمر یاد رکھتے لیکن ذرا سی بھول کی وجہ سے منصوبہ ناکام ہو گیا۔ ہوا یہ کہ جس کمرہ میں وہ صاحب قیام پذیر تھے اس میں ایک دروازہ ایسا بھی تھا جس کے متعلق ان صاحب کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ چنا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ کھانے کے کمرہ سے ملحق کمرہ میں جس میں برتن رکھے جاتے تھے کھلتا تھا طعام خانہ کے ملازمین کو یہ ہدایت کرنے کا خیال نہیں رہا کہ رات کے کھانے کے بعد اس دروازہ کے قریب برتن نہ رکھے جائیں بلکہ دوسری طرف رکھے جائیں۔ نوکروں نے معمول کے مطابق برتن ڈھیر کرائے۔ مہدی گندگی سے بھری بالٹی لے کر پہنچے شکار پر پھینکنے کے لیے اس کو دونوں ہاتھوں پر تولا اور پھینکنے کے لیے پیر ذرا آگے بڑھایا تو وہ برتنوں پر پڑا برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سن کر ان صاحب نے چیتے کی طرح جست لگائی مگر مہدی تو چھلاوہ تھا چھلاوہ، وہ کہاں ان کے ہاتھ آتا، صبح کو ان صاحب نے بستر لپیٹا اور اقامت خانے سے رخصت ہو گئے، معافی تو انھوں نے نہیں مانگی مگر یہ تسلیم کر لیا کہ فرحت منزل والوں کے بارے میں انھوں نے غلط رائے قائم کی تھی، فرحت منزل والوں کی محض ہوا ہی نہیں بندھی تھی وہ تھے بھی خطرناک اس لیے ان کا اقامت خانہ سے چلا جانا ہی بہتر تھا۔

مہدی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ میڈیکل کالج میں داخلہ ضرور لیں چاہے ایک سال کے لیے ہی کیوں نہ ہو مگر ان کے معاملہ میں ممتحن بڑے بے رحم تھے۔ باوجود اس کے کہ بسم اللہ سے لے کر تمت تک پوری کتاب یاد کرنے میں ان کو مہارت حاصل تھی کئی سال بیچارے ایف۔ ایس۔ سی میں فیل ہوئے۔ لیکن آخر کار ممتحن بھی تھک گئے اور وہ ایف ایس سی میں پاس ہو گئے اس وقت ان کی رائے بدل گئی اور انھوں نے بی ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ مگر کچھ اچاٹ اچاٹ سے رہے اسی لیے بی ایس سی میں فیل ہونے کے بعد تمام احباب کے سمجھانے کے باوجود کہ وہ پہلے بی۔ ایس سی کی تکمیل کر لیں انھوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا، ایک سال وہاں کی زندگی کا لطف اٹھایا اور حسب معمول فیل ہونے کے بعد سمجھداری سے کام لے کر میڈیکل کالج کو سلام کیا اور فزیکل ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا۔

مہدی منتظم، مستعد اور سمجھدار ہونے کے ساتھ بدحواسیوں میں بھی مہارت رکھتے تھے اور اگر ان سے کوئی بدحواسی سرزد ہو رہی ہو اور ان کو ٹوک دیا جائے تو نا طرتوڑ کئی بدحواسیاں سرزد ہو جاتی تھیں۔

ان کو گنگنانے کا بھی بڑا شوق تھا، ہر وقت گنگناتے رہتے تھے، ایک شام وہ ذرا بلند آواز میں الاپ رہے تھے [illegible] اتفاق سے میں سن رہا تھا میں نے ٹوکا مہدی یہ بادہ و ساغر کیا بات ہوئی کہنے لگے کیوں ٹھیک تو ہے "ہمیں بادہ و ساغر کے دینے میں" ـــ "ہمیں بادہ و ساغر کے دینے میں کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب" میں نے کہا مہدی خدا کے لیے تم نے مصرعہ کی گت بنا کر رکھ دی بیچارے بہادر شاہ ظفر کی روح قبر میں بے قرار ہو گی۔ میرے ٹوکنے سے وہ اور بگڑ گئے کہنے لگے، ہمیں بادہ و ساغر کے دینے میں کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب دیر جو ساقی تو ہائے غضب وہ عہد نشاط یہ دور طرب نہ رہے گا سدا میں جہاں نہ رہا۔

ان کا گانا سن کر سبھی جمع ہو گئے تھے ان کے کمرہ میں مجمع لگ گیا تھا۔ سب ہنس بھی رہے تھے اور وہ الاپے چلے جا رہے تھے، نہ رہے گا سدا میں جہاں نہ رہا، سدا میں جہاں نہ رہا۔

تعلیمی سال کے دوران اقامت خانہ کی زندگی کے تین دور ہوتے تھے، پہلا دور کالج کھلتے ہی شروع ہوتا تھا اس زمانہ میں سب سے زیادہ چہل پہل رہتی تھی۔ سب سے پہلا مرحلہ نو واردان کو برادری میں شامل کرنے کا ہوتا تھا، عام طریقہ یہ تھا کہ سینیر مقیم ٹولی کی صورت میں نکلتے باری باری نو وارد کے کمرہ میں جاتے اس سے گانا سنتے اور مٹھائی کے لیے روپیہ وصول کرتے بعض تو فوراً ہی گانا بھی سنا دیتے اور پیسے بھی دے دیتے۔ بعض شرماتے، بعض ضد کرتے لیکن آخر کار سبھی کو روایت کے مطابق عمل کرنا پڑتا۔ گانے کا پروگرام سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا، فن سے واقف تو شاذ ہی کوئی ہوتا، البتہ خوش گلو کبھی ہوتے وہ اپنی آواز کا جادو جگاتے لیکن بھدی آواز والے جب بڑی سنجیدگی تان لگاتے تو بس مزا آ جاتا۔ بھکڑ قسم کے بدآواز اپنے بھکڑپن سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے۔

جب سب سے رقم وصول ہو جاتی تو دعوت کا اہتمام ہوتا، چھینا جھپٹی ہوتی، دھینگا مشتی ہوتی اور اس طرح برادری میں شامل کرنے کی رسم بڑے خوشگوار ماحول میں پایۂ تکمیل کو پہنچتی۔ اس دوران میں ایکٹوٹی کا سلسلہ بھی چلتا رہتا بہت ہی عام ایکٹوٹی سوتے ہوئے آدمی پر پانی پھینکنے کی تھی، کم ہمت والے چیخ چیخ کر اودھم مچا کر سارے اقامت خانہ کو جمع کر لیتے اور سب کو ہنسنے کا موقع فراہم کرتے، ہمت والے خاموشی سے اٹھتے، کپڑے بدلتے اور چپ چاپ سو جاتے، سوائے ایکٹوٹی کرنے والے کے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ ایکٹوٹی ہوئی تھی، صبح کو کچھ لوگ اظہار ہمدردی کرتے اور بات ختم ہو جاتی۔

دوسرے قسم کی کوئی ایکٹوٹی اس صورت میں کی جاتی جب سزا دینا مقصود ہوتا۔ چنانچہ اس قسم کی ایک ایکٹوٹی کے بعد مخدوم نے اپنی مقبول ترین نظم "پیلا دوشالہ" کہی تھی اور بحیثیت شاعر متعارف ہوا۔

ہوا یوں کہ ایک نو وارد نے کسی سینیر کے ساتھ بدتمیزی کی، سزا کے طور پر اس کا بستر چھپا دیا گیا۔ کچھ لڑکوں نے اظہار ہمدردی کیا تو اس نے بڑے دکھی لہجہ میں کہا کہ اس کو بستر کا کوئی غم نہیں تھا لیکن اس میں ایک دوشالہ تھا وہ اس کو بہت عزیز تھا اگر دوشالہ مل جاتا تو باقی بستر سے وہ بخوشی دستبردار ہونے کو تیار تھا۔ بات پھیل گئی اور مرحوم دوشالہ کی یاد میں مجلسیں منعقد کی گئیں، تعزیتی قراردادیں پاس ہوئیں، مرثیے کہے گئے۔ مخدوم نے بھی مرثیہ کہا جس کا عنوان پیلا دوشالہ تھا۔

ایک صاحب اچھے کھاتے پیتے شریف گھرانے کے لڑکے تھے لیکن شاید صحبت اچھی نہیں ملی تھی اسی وجہ سے چوری کرنے کی عادت پڑ گئی تھی، ان کے آنے کے بعد سے چھوٹی چھوٹی چیزیں غائب ہونے لگیں۔ سب حیران تھے کہ یا اللہ کون چور آ گیا ہے کہ روز کسی نہ کسی کی کوئی نہ کوئی چیز غائب ہو جاتی ہے۔ ملازمین سب کے سب پرانے اور آزمودہ تھے لیکن اس کے باوجود شبہ ان ہی پر تھا۔ اصل چور کا پتہ اورنگ آباد کے تفریحی سفر کے دوران چلا۔ جب ایک رات انھوں نے مخدوم کا پرس اڑا لیا اور مخدوم نے "ہٹاؤ یار سمجھ گیا" کا داؤں چل کر پرس واپس لے لیا۔

سفر سے واپسی کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ان صاحب کو اقامت خانہ سے نکال دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے

لیے انتظام یہ کیا گیا کہ کسی رات جب وہ پیشاب کرنے اقامت خانہ کے ایک دور افتادہ کونے میں جائیں جہاں کبھی پیشاب کرنے جایا کرتے تھے تو ان کو دو شعلے سے نظر آئیں چنانچہ اس منصوبے پر عمل کیا گیا اور جب ان صاحب نے ڈر کر ایک اور صاحب کو مدد کے لیے بلایا تو بجائے مدد کرنے کے انھوں نے ان کو اور زیادہ ڈرایا۔ اسی رات کوئی دو بجے کے قریب اقامت خانہ کی بلند ترین چھت سے ان پر پانی پھینکا گیا۔ ان کی چیخیں سن کر جب سارا اقامت خانہ اکٹھا ہوا تو پتہ چلا کہ وہ بخار میں پھنک رہے تھے۔ سب کو صحیح معنوں میں ان سے ہمدردی ہو گئی۔ ان کے لیے فوراً ہی ایک آرام دہ بستر کا انتظام کیا گیا۔ صبح کو وہ بخار کی حالت ہی میں اقامت خانہ سے رخصت ہو گئے۔ جاتے وقت ان کے سامان کی تلاشی لی گئی تو لاتعداد گم شدہ چیزیں مل گئیں۔

ایک صاحب صورت شکل چال ڈھال اور عادات و اطوار کے لحاظ سے بڑے معقول آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن جب وہ نوکر کو آواز دیتے تھے تو یہ گمان ہوتا تھا کہ اب وہ تالی بجا کر ناک پر انگلی رکھیں گے۔ ہم لوگوں نے کوشش کی کہ وہ اپنا انداز بدلیں اور معقول طریقے پر آواز دیں۔ اتفاق سے وہ صاحب میرے ساتھ ابتدائی جماعتوں میں اسکول میں پڑھ چکے تھے اس لیے مجھ کو ان کے ساتھ زیادہ ہمدردی تھی۔ میں نے بہت واضح الفاظ میں ان کو سمجھایا مگر یا تو انھوں نے کوشش نہیں کی یا اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ آخر کار مقیمین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انھوں نے ان کے علاج کا یہ طریقہ نکالا کہ ہر ایک نے اسی لہجہ اور اسی انداز میں نوکروں کو پکارنا شروع کیا ان کی اصلاح تو نہ ہو سکی البتہ وہ اقامت خانہ چھوڑ بھاگے۔

اقامت خانہ کا انتظام مقیمین خود کرتے تھے۔ انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے مودب مقیم عہدیدار نامزد کر دیا کرتے تھے۔ سب سے اہم عہدہ عریف مکان کا تھا جس کے لیے اقامت خانہ کا سب سے سینیئر مقیم نامزد ہوتا تھا، اس کے علاوہ عریف طعام، عریف کھیل اور عریف نماز بھی ہوتے تھے۔ عریف طعام کو امداد کے لیے مددگار بھی دیے جاتے تھے۔

اقامت خانہ کی ایک انجمن بھی تھی جس کے عہدیدار کا انتخاب مقیم کرتے تھے۔ صدر عام طور پر ایک سینیئر منتخب کیا جاتا تھا جو مقرر بھی ہو، معتمد بھی عام طور پر مقرر ہوتا تھا لیکن اس کے لیے سینیئر ہونا ضروری نہیں تھا۔ لائبریرین اور اراکین کا انتخاب مقیمین کی پسند ناپسند پر منحصر ہوتا تھا۔

انتخابات سے پہلے تقریری مقابلے ہوتے تھے اور انتخابات کے بعد ہی کابینہ کا جلسۂ کرسی نشینی بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ اس موقع پر تقریری مقابلوں اور کھیلوں میں کامیاب ہونے والوں کو انعامات تقسیم کیے جاتے تھے۔ سوشل گیدرنگ کا اہتمام کیا جاتا اور سالانہ ڈنر ہوتا، آرائش کی ذمہ داری بشیر محی الدین اور نذیر محی الدین برادران پر ہوتی۔ دونوں بھائی پودوں کی تازہ پتیوں سے جامعہ کا مونوگرام بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سب مل کر پھول پتیاں بناتے، جھنڈیاں تیار کرتے اور اقامت خانہ کو دلہن کی طرح سجا دیتے۔

سوشل گیدرنگ کے خاص فنکار، مشہور ستار نواز رؤف کی وجہ سے گانے کے شوقین دور دور سے جوق در جوق

آتے۔ مہمانوں کی تواضع چائے سے کی جاتی۔ باضابطہ مقابلہ ہوتا کہ کون زیادہ چائے پیتا ہے۔

ایک صاحب میرے سامنے کوئی پندرہ پیالی چائے پی چکے تھے اس کے بعد بھی جب ان سے دریافت کیا گیا "آپ کو چائے ملی" تو بڑے خشک لہجہ میں کہا "کہاں ملی، کیسا خراب زمانہ آگیا ہے۔ پرانے مقیموں کی کوئی قدر ہی نہیں رہی" میں نے کہا آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ اتنی چائے تو پی چکے ہیں اور پھر بھی یہ شکایت ہے کہ کوئی پوچھتا نہیں، کہنے لگے کہاں پی ابھی تو صرف تیس پیالیاں ہوئی تھیں۔

ایک دور ایسا بھی آیا جب جامعہ میں اردو اسٹیج کا احیاء ہوا۔ اس کی ابتداء جامعہ میں عزیز احمد کے ڈرامہ "کالج کے دن" سے ہوئی۔ فرحت منزل والے بھلا کیسے پیچھے رہتے۔ انھوں نے بھی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا لکھا ہوا ڈرامہ "ہمزاد" گرام اسکول کے جمنازیم ہال میں اسٹیج کر ڈالا۔

یہ ڈرامہ میں نے پیش کیا تھا اس لیے کہ میں اس سال انجمن کا صدر تھا اس ڈرامے میں میرے ساتھ مخدوم محی الدین مرزا ظفر الحسن اور سید نقی علی نے اہم کردار ادا کیے تھے۔

دوسرے سال جامعہ میں فاسٹ اسٹیج ہوا اور فرحت منزل والوں نے ڈاکٹر عابد حسین کا ڈرامہ "پردۂ غفلت" پھر ایک بار گرام اسکول کے جمنازیم ہال میں اسٹیج کیا۔ اس ڈرامہ کے اداکاروں میں میرے علاوہ مخدوم محی الدین، عباس علی خاں صمد رضوی سازؔ، سید نقی علی اور نذیر محی الدین شامل تھے۔

اقامت خانہ جات میں یہ فخر صرف فرحت منزل کو حاصل رہا کہ وہاں کے مقیمین نے پبلک اسٹیج پر ڈرامے پیش کر کے عوام سے خراج تحسین حاصل کیا۔

ڈنر کے مہمان خصوصی پرنسپل صاحب ہوا کرتے تھے۔ میرے بعض احباب نے مجھے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ اگر کبھی پرنسپل صاحب سے ملاقات ہو جائے تو ان پر یہ ہرگز مت ظاہر ہونے دینا کہ اردو سے کوئی تعلق رکھتے ہو۔ اس لیے کہ وہ بڑے کٹر اور متعصب ملکی ہیں اور اردو سے تعلق رکھنے والوں سے ان کو بغض للہی ہے۔ اب یہ محض اتفاق ہی تھا کہ مجھے اسی سال ڈنر کے موقعہ پر نہ صرف ان سے ملاقات ہوئی بلکہ کھانے کی میز پر ان کے بالکل سامنے بیٹھنے کی عزت حاصل ہوئی باتیں شروع ہوئیں اور جلد ہی میری ذات موضوع گفتگو بن گئی۔ موصوف نے جو کچھ دریافت فرمایا میں نے بتا دیا۔

جب ڈنر ختم ہو گیا اور محفل برخواست ہو گئی تو میرے کئی خیر خواہ مشیر مجھ پر برس پڑے، میری صاف گوئی پر مجھ کو خوب پھٹکارا اور میرے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ عبدالرحمٰن خاں صاحب مجھے ضرور کوئی نہ کوئی نقصان پہنچائیں گے۔ میں نے کہا میں جھوٹ نہیں بول سکتا تھا، جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن بہت دنوں تک ڈرا سہما رہا کہ خدا جانے کب کون سی آفت آ جائے، حالانکہ کچھ بھی نہ ہوا — مگر نہیں شاید میں غلط کہہ رہا ہوں جو کچھ ہوا اس کے متعلق بعد کو ضرور عرض کروں گا۔

چونکہ پرنسپل صاحب اور مودب صاحب ڈنر میں شامل ہوتے تھے اس لیے کسی قسم کی چھینا جھپٹی، آپا دھاپی

ممکن نہیں ہوتی تھی۔ سب لوگ بڑی شرافت سے بیٹھے رہتے اور جو کچھ مل جاتا صبر و شکر کے ساتھ کھا لیتے۔ اسی لیے سمجھدار لوگ منتظمین میں شامل ہو جاتے۔ اس لیے کہ اول تو خوب کھانے کو ملتا دوسرے ہر قسم کی بیہودگی کا موقع رہتا۔ ہمارے ساتھیوں میں ایک صاحب بڑے خوش خوراک تھے (ماشاءاللہ آج بھی اتنے ہی خوش خوراک ہیں) کھانا کھانے میں پیش پیش رہتے اور ہاتھوں کے ساتھ ساتھ منہ بھی چلاتے رہتے اور ربع کو معمول سے کچھ زیادہ ہی کھا کر پیٹ کا دوزخ بھرتے۔ میرے علم کی حد تک انیس لقمیاں، ایک مرغ مسلم اور ایک قاب پلاؤ جو کم از کم چار آدمیوں کے لیے کافی ہوتا اور غالباً بارہ میٹھے کی طشتریاں ان کا ریکارڈ تھا۔

انجمن کی طرف سے تفریحی سفر کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ چونکہ اس سفر کے اخراجات کا معتد بہ حصہ انجمن کی طرف سے ادا ہوتا تھا اس لیے ہر ایک بہت آسانی کے ساتھ کم خرچ میں مشہور تاریخی اور تفریحی مقامات کی سیر کر سکتا تھا۔

اس تفریحی سفر سے واپسی کے ساتھ ہی پہلا دور ختم ہو جاتا تھا اور تھوڑی بہت پڑھائی شروع کر دی جاتی تھی اس دور کے معمولات بہت عام قسم کے ہوتے تھے کھیل کود، پڑھنا، لکھنا، تفریح، شرارتیں، گپ بازی، انجمن آرائی، سینما بینی، ہوٹل بازی، گھومنا پھرنا، ملنا ملانا وغیرہ وغیرہ۔

اقامت خانہ میں رہنے کی وجہ سے ہر طالب علم پابندی سے کالج ضرور جاتا اور ہر درس میں شریک ہوتا تھوڑی بہت دلچسپی کھیلوں میں بھی لینا پڑتی اور ریاضتوں میں بھی شریک رہنا پڑتا، اس طرح کھلنڈرے کچھ نہ کچھ پڑھ لیتے اور تھوڑی بہت ورزش کر لیتے۔

پڑھائی کا انحصار ہر شخص کے ذوق اور استطاعت پر تھا۔ بعض صرف نوٹس پڑھ لینا کافی سمجھتے، بعض درسی کتب بھی پڑھ لیتے اور چند ایسے بھی ہوتے جو ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے، میرے ایک دوست نے جو سالِ چہارم کے طالب علم تھے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا۔

میں دیکھتا ہوں کہ تم ہمیشہ نہ جانے کیا الم غلم پڑھتے رہتے ہو، مجھے تو کتابوں سے الجھن ہوتی ہے، قسم لے لو جو درسی کتاب کے علاوہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا ہو! ایسے بھی ایک طالب علم تھے جنھوں نے مخدوم کو ؎

یہ کہہ کے میں رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

گنگناتے سن کر کہا تھا "اقبال کا شعر ہے نا" اور مخدوم نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تھا "جی ہاں بالکل اقبال کا ہے" ان صاحب نے اپنی علمیت پر خود کو داد دیتے ہوئے کہا تھا "وہ تو رنگ بتا رہا تھا" اور بے چارا مخدوم ماتم کرتا رہ گیا تھا۔

اس زمانہ میں جو شرارتیں کی جاتی تھیں ان میں تفریحی عنصر زیادہ ہوتا تھا ان کا نشانہ جونیئر بھی ہو سکتا تھا اور سینیئر بھی چنانچہ ایک مرتبہ ایک جونیئر نے ایک سینیئر کو گوبر کھلا دیا۔

وہ صاحب ذرا دبلے پتلے کمزور قسم کے تھے اور اپنی صحت بنانے کے لیے خالص گھی کا استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کا تعلق بیدر سے تھا ان کے گھر سے خالص گھی آجاتا تھا، ان کے ساتھی نے بھانڈا پھوڑ دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر گھی آیا ادھر غائب بیچارے پریشان تھے، آخرکار انھوں نے چور کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ جانتے تھے کہ چور کون ہے، اس نے ان کو کھچڑی والے دن ناشتہ کی دعوت دی اور بڑا اہتمام کیا۔ دسترخوان پر گھی کا لبالب بھرا ہوا مرتبان مہمان کے سامنے رکھ دیا، بیدر کے خالص گھی کی خوشبو نے مہمان کو بے صبر بنا دیا اور انھوں نے چاروں انگلیوں سے جما ہوا گھی نکالا اور بغیر دیکھے منہ میں ڈال لیا اور دوسرے ہی لمحہ جو اخ تھو اخ تھو کرتے بھاگے تو سارا اقامت خانہ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا۔

ان صاحب نے مرتبان میں گوبر بھر کر اوپر ایک ہلکی سی تہہ گھی کی جما دی تھی اور وہ صاحب گھی کے دھوکہ میں گوبر کھا گئے۔

مخدوم بعض لوگوں کی چھینا جھپٹی سے بڑا عاجز تھا اور ان کو سبق دینا چاہتا تھا ایک مرتبہ ایک صاحب کو پھانس کر ان سے مٹھائی کے لیے کچھ روپے وصول کیے گئے اور مخدوم کو مٹھائی لانے کے لیے بھیجا گیا۔ مخدوم کو اس سے بہتر موقع کونسا مل سکتا تھا اس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

جب وہ بازار سے واپس آیا تو اس کے پاس دو ٹوکریاں تھیں ایک میں مٹھائی تھی اور دوسری میں بقول اس کے دال سیو تھے۔ مٹھائی کی ٹوکری تو اس نے منتظمین کے حوالے کر دی لیکن باوجود سب کے اصرار کے دال سیو کی ٹوکری اپنے ہی پاس رکھی اور جب مٹھائی ختم ہو چکی تو اس نے وہ ٹوکری بڑے اہتمام سے کھولی اور ایسی جگہ رکھی کہ عادی جھپٹا بازوں کا ہاتھ اس پر سب سے پہلے پڑے چنانچہ انھوں نے توقع کے مطابق جھپٹا مارا اور منہ میں بھر لیا، اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا آپ بہتر تصور کر سکتے ہیں ان لوگوں نے بھی دال سیو کے دھوکے میں گوبر پھانکا تھا۔

بعض اوقات اس قسم کی شرارتوں کو کامیاب بنانے کے لیے بے انتہا محنت کرنی پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب چھٹیاں ختم ہونے کے بعد واپس آئے تو اپنے ساتھ امروہہ کے آم بھی لائے، ہماری تیز قوت شامہ نے آموں کی موجودگی کا تو سراغ پالیا مگر بار بار سامان کی تلاشی لینے کے باوجود آم نہیں ملے۔ آخری کوشش کے طور پر ان کے صندوقوں کا پورا سامان باہر نکالا گیا تو آموں تک رسائی ہوئی۔ انھوں نے صندوقوں میں پہلے آموں کی تہہ بچھائی تھی اس پر رسائل و اخبارات اور کتابوں کی تہہ اور اس کے اوپر کپڑے تھے۔

پہلے تو آموں کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ تھا اس لیے کہ آم زیادہ تھے اور کھانے والے کم۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح سارے آم کھائے گئے۔ پھر گٹھلیوں کو چھلکوں کے اندر واپس رکھ کر ان کو ان کی اصلی حالت پر لایا گیا اور پہلے کی طرح ہر چیز جمائی گئی، سب کام اس خوش اسلوبی کے ساتھ کیا گیا تھا کہ تیسری مرتبہ کی جانچ میں ان کو گڑبڑ کا شبہ ہوا اور انھوں نے زیادہ احتیاط سے جانچ پڑتال کی تو راز فاش ہوا۔ پھر آم کھانے والوں کو جو بے نقط انھوں نے سنائی ہیں کہ ان کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔ ان کو سب سے بڑا دکھ اس وجہ سے تھا کہ آم وہ کسی صاحب کو تحفتاً دینے

کے لیے لائے تھے۔

تفریح کے لیے ہم لوگ زیادہ تر کنداسوامی مارکٹ جاتے تھے۔ اس علاقے میں عام طور پر ہندوستانی عیسائی رہتے تھے، عیسائی لڑکیاں بے محابانہ گھومتی رہتی تھیں۔ ان میں شکل سے ایک فیصد گوارا شکل وصورت کی ہوتی تھیں لیکن جوانی خود بڑا حسن ہے اور جوانی دیوانی بھی ہوتی ہے اس عمر میں ہر چیز حسین نظر آتی ہے، اس لیے نظارہ بازی کی ہوس بہرحال پوری ہو جاتی تھی۔

اس علاقے میں دو سینما گھر بھی تھے ان کی کشش بھی لے جاتی تھی۔ سینما نہ بھی دیکھنا ہو تو تصویریں دیکھ کر آنکھیں سینک لیتے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد بھی اس بازار کا رخ کرتے چائے پینے والے چائے پیتے، پان کھاتے، سگریٹ پیتے سینما کے چکر لگاتے اور سر زد خانہ ہمسایہ کے بجائے سر زد سینما و حسن رہ گزرے کا لطف لینے کے بعد اقامت خانہ لوٹ آتے اور اپنے مشاغل میں لگ جاتے، کچھ پڑھنے میں منہمک ہو جاتے کچھ خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتے، کہیں تاش کی بازی لگتی، کسی کمرہ میں محفل مشاعرہ منعقد ہوتی جہاں کبھی طرحی اشعار کہنے کے بھی مقابلے ہوتے کسی محفل میں لطیفے سنائے جاتے بازار میں جو لڑکیاں دکھائی دی تھیں ان پر اظہار خیال کیا جاتا، نئی نئی شرارتوں کے پروگرام بنتے اور جب رات زیادہ بیت جاتی، نیند سے آنکھیں بوجھل ہونے لگتیں جمائیوں پر جمائیاں آنے لگتیں تو محفل برخواست ہو جاتی۔

کچھ لوگ تفریح کے لیے حسین ساگر کے کٹہ بھی جاتے تھے اور کچھ عابد روڈ کو تفریح کے لیے ترجیح دیتے تھے۔

جوں جوں امتحان کا زمانہ قریب آتا جاتا اقامت خانہ کی گہما گہمی کم ہوتی جاتی، کھیل کود، ہاؤ ہو میں کمی آجاتی، پڑھائی کا چرچہ زیادہ ہونے لگتا، رات کے کھانے کے بعد والی تفریح کا بھی وقت کم کر دیا جاتا، خوش گپیاں زمانہ مابعد امتحان کے لیے ملتوی کر دی جاتیں۔ دن کو درختوں کے نیچے اور رات کو کھلے صحن میں تنہا اور ٹولیوں میں مقیمین پڑھائی میں مصروف نظر آتے۔ امتحان جیسا جیسا قریب آتا ویسے ویسے دن بڑے ہوتے جاتے، راتیں چھوٹی ہوتی جاتیں۔ اس ماحول میں کھلنڈرے سے کھلنڈرا طالب علم بھی امتحان کی تیاری پر مجبور ہو جاتا اور اس سارے بار دمے کی محنت کا اس کو بھی صلہ مل جاتا۔

امتحان کے بعد سب گھر جانے کی تیاریوں میں لگ جاتے۔ مصروفیات میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا، خوب اودھم مچتا خوب غل غپاڑہ ہوتا، آخر کار ایک ایک کر کے لوگ رخصت ہو جاتے اقامت خانہ ویران ہو جاتا، وہاں قبرستان کی سی خاموشی چھا جاتی۔

ہم ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے، بوجھل دل اور پرنم آنکھوں سے رخصت کرتے، اس خیال سے ہمارا دل بھر آتا ان میں سے بعض اب واپس نہیں آئیں گے، ان کی مجبوریاں ان کے قدم پکڑ لیں گی، ان کی ذمہ داریاں ان کا دامن تھام لیں گی یہاں سے ان کی زندگی کا نیا موڑ شروع ہوگا، وہ ہمارے ساتھ آگے نہ چل سکیں گے بلکہ موڑ پر مڑ کر زندگی کی آزمائشوں سے نبرد آزما ہو جائیں گے۔ ہم دلی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ ان کو رخصت کرتے،

خدا کرے کامیابیاں ان کے قدم چومیں مسرتیں ان کا مقدر ہوں خوشیوں سے ان کا دامن بھرا رہے۔

بی اے کا امتحان دے کر جانے والے اس یقین کے ساتھ رخصت ہوتے کہ اب ان کو واپس آنا نہیں تھا اور اگر وہ واپس بھی آتے تو فرحت منزل کے دروازے ان پر بند ہوں گے، وہ آغوش جو چار سال تک ان کے لیے کھلی رہتی تھی شجر ممنوعہ بن جائے گی، وہ فرحت منزل کو خدا حافظ کہتے۔

خدا حافظ فرحت منزل ــــ خدا حافظ، تو نے ہم کو بہت کچھ دیا، ہم کو بہت کچھ سکھایا، جو کچھ ہم تجھ سے لے کر تجھ سے سیکھ کر جا رہے ہیں وہ ہماری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہوگا جو کچھ تو نے ہم کو عطا کیا ہے اس کے سہارے ہم زندگی کی کشمکش کا مقابلہ جرأت اور اولوالعزمی کے ساتھ کر سکیں گے۔

مجھے یہ اعتراف کرنے پر بڑا فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں نے فرحت منزل میں رہ کر بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ حاصل کیا۔ میں جو اسکول کے زمانے میں صرف پتنگ اڑانا اور تاش کھیلنا جانتا تھا اقامت خانہ کے ماحول میں اچھا خاصا کھلاڑی بن گیا، شاید ہی کوئی دورانِ خانہ یا بیرونِ خانہ کھیل ایسا ہو جو میں نے نہ کھیلا ہو اور ایک دو میں تو اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اقامت خانہ کے ماحول نے مجھے مقرر بنا دیا، مجھے بات کرنے کا سلیقہ سکھا دیا، مجھے مجلسی آدمی بنا دیا، مجھے ثقافتی مشاغل سے نہ صرف دلچسپی پیدا ہوئی بلکہ میں عملی طور پر ان میں حصہ لینے لگا اور آج جو میں دو چار حرف لکھ لیتا ہوں یہ بھی اسی ماحول کا طفیل ہے جو مجھے اقامت خانہ میں میسر آیا۔ یہ ساری چیزیں زندگی کے ہر مرحلہ پر میرے کام آئیں مجھے اپنے ان ہی مشاغل کی وجہ سے بعض کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

اقامت خانہ میں رہنے کی وجہ سے مجھے بعض استادوں کی خصوصی شفقت اور سرپرستی کا شرف بھی حاصل ہوا، ان میں سرفہرست عبدالرحمٰن خاں صاحب پرنسپل جامعہ عثمانیہ کا نام آتا ہے۔

میں اوپر اپنی اور ان کی ملاقات کا ذکر کر چکا ہوں اس کے بعد سال میں ایک آدھ بار کسی تقریب میں ملاقات ہو جاتی تھی اور بس اس لیے میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ ان کی نظر میں میری حیثیت بھی جامعہ کے ان سینکڑوں طالب علموں میں سے ایک کی ہے لیکن یہ میری بھول تھی۔

یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ خاں صاحب کی نظر کیمیا اثر کب مجھ پر پڑی لیکن اتنا جانتا ہوں کہ جب میں ایم۔ اے کے پہلے سال میں تھا اس وقت تک وہ مجھ سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، اس کا علم مجھے اپنے بعض احباب سے ہوا انھوں نے بتایا کہ اگر کبھی کسی سلسلہ میں تمہارا نام آ جاتا ہے تو خاں صاحب جو تک چڑھے ہیں اور کہتے ہیں کون یحییٰ اچھا شعبۂ دینیات کا وہ طالب علم جو داڑھی مونچھ منڈاتا ہے۔

بعد کو مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ سول سروس کے انتخاب کے لیے راز میں جو سفارشات بھیجی گئی تھیں ان میں سب سے زیادہ پرزور سفارش میرے لیے تھی اور یہ کہ شاید خاں صاحب نے ان الفاظ میں کبھی کسی کی سفارش نہیں کی، دراصل خاں صاحب جانتے تھے کہ مقتدر طبقہ شعبہ دینیات کے طلبا کے بارے میں عجیب تصور رکھتا ہے۔ ان کے خیال میں وہ

صرف فقہ، حدیث اور تفسیر کا سطحی علم رکھتے تھے، انگریزی ان کو بہت معمولی آتی تھی، حالات حاضرہ سے وہ بالکل ناواقف ہوتے تھے اس لیے انتظامیہ کے عہدوں کے لیے قطعاً نااہل ہوتے تھے۔ اس لیے خاں صاحب نے پرزور سفارش کی تھی تاکہ مقابلہ کے امتحان میں شرکت کے لیے میرے انتخاب میں کوئی دشواری نہ ہو۔

خاں صاحب کی سفارش رائیگاں نہیں گئی، باوجود اس کے کہ میرا کوئی مربی و سرپرست نہیں تھا، میرا انتخاب ہو گیا۔ اتفاق سے مقابلہ کا امتحان گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران ہونے والا تھا اس لیے میں نے خاں صاحب سے درخواست کی (خاں صاحب سے اپنے ذاتی کام کے سلسلے میں یہ میری پہلی ملاقات تھی) کہ چھٹیوں میں مجھے اقامت خانہ میں ٹھہرنے کی اجازت دی جائے۔ خاں صاحب نے نہ صرف منظوری دے دی بلکہ یہ بھی فرمایا کہ میں جس اقامت خانہ میں رہنا چاہوں گا وہاں انتظام کر دیا جائے گا۔ میں نے سہولت کے پیش نظر مسرت منزل میں قیام کا فیصلہ کیا میرے بعض احباب نے بھی موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور قیام کی اجازت مانگی پہلے تو خاں صاحب اس وجہ سے انکار کرتے رہے کہ وہ لوگ اقامت خانہ میں رہ کر مجھ کو پڑھنے نہیں دیں گے لیکن آخر کار بڑی منت سماجت کے بعد اس شرط پر اجازت دے دی کہ وہ میرے مطالعہ میں حارج نہیں ہوں گے۔

امتحانات شروع ہوئے اور جب میں پہلا پرچہ کر کے واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خاں صاحب میرے منتظر تھے انھوں نے مجھے دیکھتے ہی دریافت فرمایا۔

پرچہ کیسا ہوا؟

میں نے عرض کیا کہ آپ کی دعا سے بہت اچھا ہوا ہے۔

بہت خوش ہوئے ان کے کھلے ہوئے چہرے سے ان کی خوشی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا مجھے شاباش دی اور گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

یہ میرے لیے بالکل نیا تجربہ تھا، جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا کسی نے اتنی شفقت، اتنی محبت اور اتنے تعلق خاطر سے نہیں پوچھا تھا کہ پرچہ کیسا رہا میری اس وقت کی حالت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے، فخر، غرور اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے پرنسپل کو میری کتنی فکر تھی۔ ان کو میرا کتنا خیال تھا۔ باپ بھی بیٹے کے لیے اتنا ہی فکرمند ہو سکتا تھا باپ بھی بیٹے کو اتنی ہی شفقت دے سکتا تھا باپ بھی بیٹے کی اتنی ہی ہمت افزائی کر سکتا تھا میرے اس روحانی باپ نے کتنے احسن طریقے سے اپنا فرض ادا کیا تھا۔

اس کے بعد روز کا یہ معمول تھا کہ میں پرچہ ختم کر کے اقامت خانہ پہنچتا تو خاں صاحب یا تو موجود ہوتے یا دو چار منٹ بعد تشریف لے آتے اور دریافت فرماتے۔

پرچہ کیسا ہوا۔

آپ کی دعا سے اچھا ہوا۔

شاباش۔

اور وہ واپس تشریف لے جاتے۔

خانصاحب خود بھی زبانی امتحان لینے والوں میں سے ایک تھے اس لیے امتحان ختم ہونے کے بعد تشریف لائے اور آتے ہی فرمایا "شاباش یحییٰ آج میں بہت خوش ہوں تم نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ تمھارے جوابات سن کر ممتحن انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شعبۂ دینیات کا کوئی طالب علم حالات حاضرہ سے اتنا واقف ہو سکتا ہے اور سیاسی و معاشی مسائل میں اس کی سوجھ بوجھ اتنی واضح ہو سکتی ہے۔

یہ ان جوابات کی تعریف تھی جن کے مجھے سو میں اننالیس نمبر ملے۔ خاں صاحب اس نتیجہ سے واقف تھے مگر وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں مایوس ہو جاؤں یا ہمت ہار جاؤں وہ میرے ذہن میں یہ بٹھانا چاہتے تھے کہ میرے ساتھ ناانصافی کی گئی تھی ورنہ میں اننالائق، اس قدر قابل اور ایسا ہمہ دان تھا کہ خود ریسپل اس کے معترف تھے اور یقیناً خاں صاحب کا یہ نفسیاتی حربہ کامیاب رہا۔ میں نے دوسرے سال بھی پوری مستعدی، تن دہی اور جوش و خروش سے محنت کی اور خداوند تعالیٰ نے مجھے کامیابی عطا فرمائی۔

خاں صاحب اس وقت تک ریٹائر ہو چکے تھے میں یہ خوشخبری لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ ایک تقریب میں ملاقات ہو گئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی انھوں نے اس انداز میں مبارک دی کہ ساری نظریں ہماری طرف اٹھ گئیں۔

انھوں نے فرمایا "میں جانتا تھا کہ تم ایسی ہی کامیابی حاصل کرو گے۔ مجھے تم پر پورا پورا اعتماد تھا۔ شکریہ کہ تم نے میری توقعات پوری کر دیں میرے اعتماد کا بھرم رکھ لیا۔ پھر وہ مجھے نصیحتیں فرماتے رہے۔ اسی طرح جس طرح باپ بیٹے کو عملی زندگی کی طرف رخصت کرتے ہوئے کرتا ہے۔

میری طرح کے نہ جانے کتنے ذروں کو خاں صاحب نے آفتاب بنا دیا، کتنوں کو زمین کی پستیوں سے نکال کر ثریا کی رفعتوں پر پہنچا دیا، کتنوں کو ان کی نظر کیمیا اثر نے کندن بنا دیا۔ ان کی محبت، شفقت اور ہمدردی نے کتنوں کی مایوس زندگی میں امیدوں کے دیے روشن کر دیے۔

ان کا کردار بہت بلند تھا، وہ تعصب سے کوسوں دور تھے، ملکی غیر ملکی تحریکوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا وہ صرف استاد تھے سراپا شفقت، سراپا خلوص ان کا مسلک ہر ایک کو بلا لحاظ طبقت بے لوثی کے ساتھ تعلیم و تربیت دینا تھا، ان کا فیض عام تھا میں کبھی کبھی یہ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ وہ کیسے لوگ تھے جن کو خاں صاحب جیسی شخصیت کر ستم کرنے ان پر کیچڑ اچھالنے اور ان کو بدنام کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔

بی اے کے بعد لوٹ آنے والوں کے لیے ایک نئی آغوش منتظر ہوتی تھی یہ آغوش نظامت منزل کی تھی۔ یہاں کے ماحول میں بڑی سنجیدگی تھی، رکھ رکھاؤ تھا، وہاں فرحت منزل کے ہنگامے نہیں تھے دنیا جو کڑی نہیں تھی وہاں

رکٹ نہیں کھیلی جاتی تھی وہاں کوئی . . . ہام کے درخت پر جھولتا ہوا نظر نہیں آتا تھا نہ یہاں کسی پر پانی نہیں سی کا بستر نہیں چھپایا جاتا تھا دہاں "بادر دساغر" کی تان نہیں سنائی دیتی تھی۔ جیسے زندگی سہمی ہوئی ہو. را چانک بڑھاپا آگیا ہو۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بیشتر مقیمین ملازمت اور تعلیم کے مشاغل ساتھ رکھے ہوئے تھے اس لیے ان کے بوڑھے ماں باپ کے لیے اپنی بیوہ بہن کے لیے روٹی کا انتظام کرنا تھا اپنی کے لیے جہیز کا انتظام کرنا تھا اپنے ننھے سے بھائیوں کو تعلیم دلانا تھا۔ ان کی بے فکری کا زمانہ ختم ہو چکا تھا ستوں کی محنت کی کمائی پر عیش نہیں کر سکتے تھے ان کو اپنی کمائی سے دوسروں کے زندہ رہنے کا انتظام ے برائے نام طالب علم تھے ذمہ داری کا عفریت پیر تسمہ پا کی طرح ان کی گردنوں پر سوار ہو گیا تھا وہ اس کے بوجھ رہے تھے ان کے قہقہوں میں بے ساختگی نہیں رہتی تھی ان کی مسکراہٹوں میں تلخیاں بھر گئی تھیں۔

ری نہیں کرتے تھے وہ بھی ملازمتوں کے لیے کوشش کرتے رہتے تھے، کوئی کسی مقابلہ کی تیاری میں لگا ہوا نٹرویو کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ کبھی عملی زندگی کی چوکھٹ پر کھڑے ہم و رجا کے عالم میں اس کشمکش ، اس چھین ، لوٹ کھسوٹ اس آپا دھاپی کو دیکھ رہے تھے جو چوکھٹ کی دوسری طرف دیکھ رہے تھے۔

اخر میں جامعہ اور اقامت خانے اڈیکمٹ کی نو تعمیر عمارتوں میں منتقل کر دیے گئے۔ پرانا ماحول بدل گیا، پرانا گیا۔ دلچسپیاں بدل گئیں، مشاغل بدل گئے روایات بدل گئیں۔ نئی روایات کی داغ بیل پڑی نئے مشاغل

دیکھنا ہوتا تو حیدرآباد جاتے یا سکندرآباد۔ آنکھیں سینکنا ہوتا تو سکندرآباد جاتے، چائے پینا ہوتا تو ماسٹر جو اس نے ایک جھونپڑی میں مزدوروں کے لیے کھول رکھا تھا۔ چاندنی رات میں سیر کرنا ہوتا تو ٹرالی میں ن ریلوے لائن پر دور تک چلے جاتے۔

ٹ کے عارضی اقامت خانہ میں بھی مجھے ایک سال رہنے کا موقع ملا، وہاں عمارت کے مختلف بازوؤں دیے گئے تھے۔ فرحت منزل، نظامت منزل، مسرت منزل اور ہند ہاسٹل کے نام بھی منتقل ہو گئے تھے بہت سے پرانے ساتھی مل گئے۔ شہر میں رہنے والے بعض احباب بھی اقامت خانہ میں منتقل ہو گئے ہوا کہ ہم جیسے کھلنڈرے طیلسانین کی سنجیدگی ختم ہو گئی، ہم پھر اپنے اصلی روپ میں آ گئے۔ شدید ر بے پرواہ۔

ے ساتھیوں سے مخدوم، میر حسن، ظفر، شہریار اور علی احمد نظامت منزل میں تھے، شباب، رفیق، سکندر رحت منزل میں رہتے تھے، غوث، شوکت اور عزت مسرت منزل میں رہتے تھے جو احباب اقامت خانہ میں ھی کلاس ختم ہونے کے بعد اقامت خانہ آ جاتے۔ بالخصوص جمیل، نور الہدیٰ اور نذر محمد خاں اقامت خانہ ہی تھے۔ اجتماع عام طور پر نظامت منزل کے کمرہ نمبر ۱ میں جہاں مخدوم اور میر حسن رہتے تھے ہوتا تھا، بحثیں

ہوتیں، دھما چوکڑی مچتی اتنا شور و غل ہوتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ ہماری شرارتوں سے سبھی عاجز تھے، مگر ہم سینئر لوگ تھے کس کی مجال تھی کہ ہم کو ٹوکتا یا ہم کو ہنگاموں سے باز رکھنے کی کوشش کرتا۔ ایک آدھ بار مہذب صاحب کے پاس شکایتیں بھی گئیں مگر مہذب صاحب نے سنا ان سنا کر دیا۔

اس اقامت خانہ کے قیام کے دوران یوں تو صبح سے شام تک کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا لیکن میں صرف ایک تقریب کا ذکر کر کے اس داستان کو ختم کر دوں گا۔ یہ تقریب چادر چڑھانے کی تھی۔

نظامت منزل کے مقیمین میں سے ایک صاحب کے بستر کی چادر انتہائی گندی ہو گئی تھی، اس پر دھبے ہی دھبے پڑے ہوئے تھے مگر وہ اس کو بدلنے کا نام ہی نہ لیتے تھے، ان سے لاکھ کہا، ان کو لاکھ سمجھایا مگر وہ اس کان سے سنتے اس کان سے اڑا دیتے۔ مجبوراً چادر فنڈ کھولا گیا، دو دو چار چار پیسے کر کے رقم جمع کی گئی اور چادر خریدی گئی پھر چادر کا جلوس نکال کر پورے اقامت خانہ کا گشت لگایا گیا۔ چادر کا قران پلنگ کے مالک خود اٹھائے ہوئے تھے ٹین کے ڈبوں سے تاشوں کا کام لیا گیا۔ گشت ختم ہونے کے بعد چادر پلنگ پر بچھا دی گئی اور مرحوم چادر کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

سال ختم ہو گیا، ایک منزل اور آ گئی، زندگی کا ایک موڑ آ گیا، شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اپنا سفر جاری رکھ سکے یہاں سے سب کے راستے جدا جدا ہو جائیں گے سب اپنی اپنی راہ چل پڑیں گے۔

پھر ایک مرتبہ ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا، ان گنت تلخیوں، ملاقاتوں، لذتوں اور بے کیفیوں لڑائیوں اور صلحوں کو سینے سے لگائے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ ہم میں سے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ ہم میں سے بعض کی راہیں متعین ہو چکی تھیں اور بعض جانتے تھے کہ ان کو کن راہوں سے گزرنا ہوگا کیسے کیسے موڑ ان کے راستوں میں آئیں گے۔ ان کی منزل کہاں ہوگی۔

ہم نے ایک دوسرے سے کہا "دوستو یہ دنیا بڑی مختصر ہے الگ الگ راہوں پر گامزن ہونے کے باوجود کئی موڑ ایسے آئیں گے جہاں ہم ایک دوسرے سے ملیں گے، یہ الگ بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پہچان نہ سکیں یا پہچان تو لیں مگر انجان بن جائیں یا یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اپنے مسائل میں اتنے الجھے ہوئے ہوں کہ ادھر ادھر دیکھنے کا ہوش ہی نہ ہو اور ہم ایک دوسرے کو دیکھے بغیر گزر جائیں۔

ہم نے ایک دوسرے کو یقین دلایا کہ ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں وہ زندگی کامیاب و بامراد رہیں کامیابیاں ان کے قدم چومیں مسرتوں سے ان کا دامن بھرا رہے، ہماری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں خداوند کریم ان کو حق و صداقت کی راہ پر چلنے کی بے لوثی کے ساتھ ملک و قوم اور بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

خدا حافظ رفیقو، دوستو ساتھیو خدا حافظ

ہم نے مادر جامعہ کو بھی خدا حافظ کہا، ہم نے جذبات کو اپنے احساسات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے

قاصر تھے، ہم کس کس چیز کا شکریہ ادا کرتے۔ ہم جاہل تھے مادر جامعہ نے ہمیں علم کی دولت عطا کی، ہم غیر مہذب تھے ہم کو تہذیب سکھائی، ہم کو انسان بنایا، ہمارا سماج میں کوئی مقام نہیں تھا ہمیں ایک مقام عطا کیا ہم بے مایہ تھے ہم کو مالا مال کیا، ہم کو اس قابل بنایا کہ ہم زمانہ سے نبرد آزما ہو سکیں حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرسکیں، کٹھن سے کٹھن مراحل سے ہنستے کھیلتے گزر جائیں، ہم نے مادر جامعہ کو اس کی مہربانیوں کا اس کے احسانات کا کوئی معاوضہ دینے کے قابل نہیں تھے، البتہ ہم مادر جامعہ کا نام روشن کرنے کی کوشش کرسکتے تھے۔ اس کی سربلندی کے لیے تن من دھن کی قربانی دے سکتے تھے، ایسے اعمال سے اجتناب کرسکتے تھے جو اس کی بدنامی کا سبب بنیں جس سے اس کے نیک نام پر حرف آئے، یہی کچھ ہمارے بس میں تھا اور اس کا ہم نے اپنی مہربان ماں سے عہد کیا، ہم نے اس عہد کو کہاں تک پورا کیا زمانہ اس کا فیصلہ کرے گا۔

جی۔ ایم۔ عمر خاں

دھڑکا ہے دلِ زار ترے ذکر سے پہلے

جی ایم عمر خاں جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ایک صاحب ذوق، صاحب دل، دوست پرست اور دوست نواز انسان ہیں۔ سعادت علی خاں مرحوم ان کے قریبی دوست تھے سعادت اور مخدوم ایک دوسرے کے چہیتے تھے۔ سعادت کے توسط سے عمر خاں بھی اس دائرۂ خلوص میں داخل ہوگئے۔ مخدوم کو عمر سے اس درجہ خلوص ہوگیا تھا کہ ان کے مشہور مصرعے "کتنی راتیں ہیں جو میرے نام سے مشہور رہیں" سے متعلق چند دل نواز یاد رہ جانے والی راتیں عمر خاں کے باغ سے متعلق رہی چکی ہیں

(ادارہ)

۱۹۳۶ء کی بات ہے میں مدرسہ عالیہ کی آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا مگر میرے کان: ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا' 'لو صبح ہوئی بس گئے ساگر کے کنارے' رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے'، ان رسیلی، الوکھی اور نغمہ سوز نظموں سے آشنا ہو چکے تھے میں اور میرے بعض ساتھی ان نظموں کو لہک لہک کر ترنم سے پڑھتے اور سمجھتے کہ ان نظموں کا خالق بڑا نباض ہے اور ہمارے دلوں کی بات کہہ رہا ہے اور کبھی تو یوں محسوس ہونے لگتا جیسے اس نے کہا اور میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا۔

منیر حسین صاحب جب میرے استاد نے نوبورڈنگ ہوز میں کسی نے کہا دیکھو مخدوم محی الدین شاعر یہی ہے۔ پہلی بار میں نے دیکھا ایک چھریرے بدن کا نوجوان سنہری مائل گندمی رنگ ستواں ناک چمک دار آنکھیں مسکراتے لب اور گھنی دار بڑے بڑے بال جو اس کی گردن پر آکے ایسے رک گئے تھے جیسے زلفوں کو تراش دیا گیا ہو۔ یہی ہے وہ شاعر جو ہماری آرزوں کو بے نقاب کرتا ہے۔

کئی روز بعد کافی ہوز میں مخدوم سے بات کرنے کا موقع ملا۔ مگر میں کچھ زیادہ خوش نہیں ہوا میں نے اپنے ساتھی سے کہا یہ تو دہریا ہے، مذہب کا مذاق اڑاتا ہے اور یہی خیال دل میں پختہ ہوتا گیا کہ مخدوم ایک لامذہب آدمی ہے۔

ول بعد جب کمیونسٹ پارٹی پر سے BAN برخواست ہوا اور ناخوشگوار سیاسی بادلوں کو چیرتا ہوا
تی حیدرآباد پر چمکا تو سارا شہر اس کے دیدار کا دیوانہ تھا۔ جدھر دیکھو مخدوم ہی کی بات ہو رہی تھی اسی کے
سے تھے، اسی کے پیار کے قصے اسی کے پیار کی باتیں۔ ان ہی دنوں جب وہ اپنے گاؤں پہنچا تو خواتین اس
کا استقبال کر رہی تھیں: "رنگ ڈال انگلیوں میں آیا رے نیا"۔

ادت مرحوم کے ہاں مخدوم سے دوسری ملاقات ہوئی، اور پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ مخدوم کے اندر
تھا وہ آشکار ہوتا گیا اور میری سمجھ میں آنے لگا کہ مخدوم لامذہب نہیں مخدوم محض شاعر نہیں ہے، مخدوم
ہیں ہے، مخدوم مخدوم ہی نہیں بلکہ وہ ایک بانگ درا ہے سوتوں کو جگانے کے لیے ایک نغمہ ہے، روتوں کو
لیے ایک تلوار ہے، مظلوموں کو سہارا دینے کے لیے ایک شعلہ ہے ظلم کو مٹانے کے لیے ایک آہنی عزم ہے
نے کے لیے ایک انسان ہے، ہر زندگی سے پیار کرنے کے لیے ایک آنسو ہے جو زندگی کی پلکوں پر چمکتا ہے
ن ایک عاشق ہے جو گریباں چاک نہیں کرتا بلکہ انتہائے عالم جنوں میں بھی گریباں کی حفاظت کرتا ہے
نہ کو وجود دینے کے لیے ایک نئے مزاج کی داغ بیل ڈالنے کے لیے ایک نئے انسان کو پیدا کرنے کے لیے
ب العین کو اپنایا تھا اور ان کا یقین چٹان کی طرح مضبوط تھا اور وہ اس درجہ بے پناہ ہو گئے تھے
ے انھیں خرید نہیں سکتی تھی کسی موقع پر میں نے کہا تھا کہ ہندوستان کی دو محبوب شخصیتیں جنھیں کسی قیمت پر
ا سکتا، ایک پنڈت جواہرلال نہرو دوسرے مخدوم محی الدین!۔

لی قطب شاہ سے واپس ہوتے ہوئے مخدوم مل گئے۔ سعادت مرحوم نے انھیں پکڑ لیا، گھر پہنچے تو تازہ نظم
مخدوم نے سنائی میں مدہوش ہو گیا۔ جانے کیا بات تھی اس نظم نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے کہا کاش
ہوتا کہ اس نظم کو چار مینار پر کندہ کروا دیتا۔ مخدوم یہ سن کر مسکرائے اور مجھ سے لپٹ گئے اور کہا "تونے
جی بھی یہی چاہتا ہے۔

کی کرشمہ سازیوں نے مخدوم کو غزل گوئی پر مجبور کیا اور وہ غزل کہتے اور اشفاق حسین کے منتظر رہتے تاکہ انھیں صحیح
سکے۔ ان کی ہر غزل عشق کی شعلہ خیز لے میں ایک دیپک ہوتی جس سے دلوں کے چراغ جل اٹھتے رنگ تغزل کی فراوانی
سے امتزاج پاکر طبیعتوں کے جوار بھاٹے میں ایک طوفان بپا کر دیتی۔ مثلاً ان کا یہ شعر:

ہجوم بادہ و گل میں ہجوم یاراں میں　　　کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

تصور نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جو ان پر گزر چکی ہے۔ بہ ہر حال گلدستۂ فطرت کا یہ پھول حیدرآباد کے چمن میں مہکا اور اس کی
تک پھیلتی رہی خوشبو فضائے بسیط میں تحلیل ہو سکتی ہے مگر فنا نہیں ہوتی اسی لیے میں کہتا ہوں کہ مخدوم قلب انسانی
یا ہے وہ فنا نہیں ہو سکتا شاعر کی فکر موجود ہے لیڈر کا عمل باقی ہے، مخدوم کا پیار زندہ ہے پھر میں کیسے باور کر لوں کہ
مخدوم نہیں مر سکتا۔ "پیار باقی ہے محبت کا نشاں باقی ہے"۔

مرزا حمید حسین
(لندن)

یادِ یاراں میں ایک جامِ غم اور دو

پیار سے آنکھ بھر آتی ہے کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ ترا نام وفا آتا ہے

بڑی مدت سے میں مخدوم کی شاعری اور شخصیت دونوں کا پرستار رہا ہوں۔ جب مخدوم نے شعر لکھنا شروع کیا اس وقت ان سے میری دوستی نہیں تھی۔ پہلے پہل میں نے "نگار" (لکھنؤ) اور "ایوان" (گورکھپور) میں ان کی نظمیں پڑھی تھیں۔ وہ حیدرآباد کے مشاعروں اور طالب علموں کی تلنگوں میں اپنی نظمیں اپنے مخصوص ترنم میں سناتے تھے۔ میں ان مشاعروں اور تلنگوں میں شریک ہوتا۔ ان کی نظمیں سنتا اور ان کی داد دیتا تھا۔ ان کی رومانی نظموں میں رعنائی خیال اور ندرت بیان کا امتزاج ہوتا تھا۔ ان کی سیاسی نظمیں ترقی پسند اور انقلاب پرور نوجوانوں کے احساسات کی ترجمانی کرتی تھیں۔ خاص طور پر حیدرآباد کی گھٹی ہوئی تنگ و تار جاگیرداری اور جمہوریت دشمن فضا میں کوندے کی لپک بن کر چمکتی تھیں۔

مخدوم سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں سٹی کالج میں پڑھتا تھا۔ میں کالج کی کلاسوں میں پڑھتا تھا اور وہ ہائی اسکول کی کلاسوں کو اردو پڑھاتے تھے۔ ایک دن میرے ایک ہم جماعت زین العابدین نازش نے تجویز پیش کی کہ مخدوم سے ملنا چاہیے۔ میں نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ان کی تجویز کی تائید کی اور ایک روز ان کی رہنمائی میں مخدوم سے ملنے کے لیے اسٹاف کامن روم میں پہنچ گیا۔ اس وقت مخدوم ٹیبل ٹینس کھیل رہے تھے۔ نازش نے ان سے کہا کہ ہم دونوں آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ تھوڑی دیر کے لیے آپ قریب کی کرسیوں پر بیٹھ جائیں۔ میں ابھی کھیل ختم کر کے آپ کے یہاں آجاتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آگئے۔ ہم نے اپنا رسمی تعارف کرایا اور پھر پندرہ منٹ تک شعر و ادب کے موضوع پر بات چیت ہوئی۔

اس واقعے کے بیس سال کے بعد حیدرآباد میں شہاب اور رنگین مادھو نے مخدوم کی پچاسویں سالگرہ کی تقریب میں ایک ڈنر پارٹی کا انتظام کیا جس میں مخدوم کے خاص خاص دوستوں کو دعوت دی گئی۔ ڈنر کا خرچ ادا کرنے کے لیے

ان سے چندہ پہلے ہی وصول کر لیا گیا تھا۔ میں بھی اس ڈنر میں شریک تھا۔ اس دلچسپ تقریب کا خاتمہ مخدوم کی ایک غیر رسمی تقریر پر ہوا جس میں انھوں نے اس ڈنر میں شریک ہونے والے ہر آدمی کے بارے میں بتایا کہ جہاں تک انھیں یاد تھا، وہ اس سے پہلی بار کب اور کہاں ملے۔ جب میری باری آئی تو سٹی کالج میں ہماری پہلی ملاقات کو یاد کیا۔ ان کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ وہ سرسری ملاقات بھی انھیں برابر یاد رہی۔

ہماری پہلی ملاقات کے کوئی ایک سال بعد کامریڈ ایسوسی ایشن کی بنیاد پڑی اور اس طرح حیدرآباد میں اشتراکی خیالات رکھنے والے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ سید ابراہیم، عالم خوندمیری، احسن علی مرزا، مانک لال گپتا، روی نارائن ریڈی، مخدوم محی الدین، بدم ملا ریڈی، ڈاکٹر جے سوریا نائیڈو، راج بہادر گوڑ، جواد رضوی، اونکار پرشاد، اور سری نیواس لاہوٹی اس ایسوسی ایشن سے وابستہ تھے۔

کامریڈ ایسوسی ایشن کے عام ممبروں کی سالانہ میٹنگ سلطان بازار میں ہونے والی تھی۔ اس کے ایک دن پہلے ایسوسی ایشن کے خاص خاص ممبروں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں ریاست کے مختلف مسئلوں پر ریزولوشن تیار کیے گئے۔

اس میٹنگ میں روی نارائن ریڈی اور مخدوم محی الدین بھی موجود تھے۔ سب سے اہم ریزولوشن کھیتی باڑی اور کسانوں کے مسئلے پر تھا۔ جسے روی نارائن ریڈی نے انگریزی میں لکھا تھا لیکن طے کیا گیا کہ اس ریزولوشن کو اردو میں پیش کیا جائے۔ ترجمہ کے لیے کسی نے مخدوم کا نام پیش کیا لیکن ابراہیم اور عالم نے میرا نام تجویز کیا، اور اسی پر اصرار کیا۔ روی نارائن ریڈی کچھ حیران سے تھے کہ مخدوم کے مقابلے میں ایک نامعلوم آدمی کا نام کیوں رکھا جا رہا ہے۔ اکثریت میرے نام کی تائید میں تھی اس لیے ترجمے کی خدمت میرے سپرد کی گئی۔ میں نے تھوڑی دیر میں ترجمہ کر دیا۔ اور جب یہ پڑھا گیا تو روی نارائن ریڈی اور مخدوم دونوں نے بہت پسند کیا۔ اس کے بعد مخدوم سے میری دوستی ہوگئی۔ اور پھر ہم ایک دوسرے کے رفیق و ہمدم بن گئے بزم میں بھی اور رزم میں بھی۔

پھر تو دن رات ملاقاتیں ہوتی تھیں اور ان ملاقاتوں میں کتنی صبحوں کا اجالا کتنی شاموں کا سرور رخصت ہوتا تھا۔ سیاسی میٹنگوں میں شریک ہوتے تھے۔ شام میں کافی ہاوس یا اورینٹ ہوٹل میں بیٹھے کافی پیالے پیتے اور بحثیں کرتے جب ذرا شام ڈھلتی تو مخدوم کی شعلہ نوائیوں سے ایک سماں بندھ جاتا تھا۔

سیاسی سرگرمیوں نے ہمیں ایک دوسرے سے ملایا اور جدا بھی کیا۔ ۱۹۴۶ء میں سر مرزا اسماعیل ریاست حیدرآباد میں وزیراعظم تھے۔ انھوں نے کمیونسٹ تحریک کو کچل ڈالنے کی کوشش کی اور پہلا وار کر دیا۔ کئی ساتھی گرفتار کر لیے گئے اور بہتوں نے روپوش ہو کر جنگ آزادی جاری رکھی۔ روپوش ہو جانے والوں میں ایک مخدوم بھی تھے، اور پکڑے جانے والوں میں ایک میں بھی تھا۔ میں نے سنگا ریڈی جیل، گلبرگہ سنٹرل جیل اور حیدرآباد سنٹرل جیل میں نظر بندی کے دو سال بتائے۔ پولیس ایکشن سے کچھ عرصہ پہلے مجھے رہا کر دیا گیا۔ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ میں بمبئی جا کر مرکزی کمیٹی کے ہفتہ وار عوامی دور میں کام کروں۔

اس زمانے میں مخدوم روپوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور کچھ مہینے بمبئی میں گزار کر حیدرآباد لوٹے تھے۔

انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ پارٹی نے ہماری ملاقات کا انتظام اختر حسن ایڈیٹر پیام کے گھر پر کیا۔ جب رات میں ملاقات ہوئی تو وہ میرے متعلق بمبئی جا کر عوامی دور میں کام کرنے کے فیصلے سے بہت خوش تھے۔ بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ اس وقت تلنگانہ کی مسلح جدوجہد زوروں پر چل رہی تھی جس کے لیے مخدوم اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھے

میں پانچ سال بمبئی میں گزارنے کے بعد حیدرآباد لوٹا اور مخدوم میرے وہاں پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ورلڈ ٹریڈ یونین کانگریس کے مرکزی دفتر میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے ویانا گئے۔ ویانا کے دو سال کے قیام کا ان پر بڑا اثر پڑا۔ وہ اس شہر نگاراں کو بہت سراہتے تھے اور مجھ سے کہا کرتے تھے کچھ مدت یورپ کے ملکوں میں بسر کرنے سے قلب و نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ وہ ایک الگ ہی دنیا ہے جس کا کچھ نہ کچھ تجربہ ہر شخص کو ضرور کرنا چاہیے۔ ایک طرح سے انھوں نے میرے بہت ہی پرانے جہاں گردی کے سوئے ہوئے شوق کو پھر سے جگا دیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ کچھ عرصہ کے لیے آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے مرکزی دفتر میں کام کرتے رہے۔ جب وہ دلی سے لوٹے تو چند سال ہم دونوں حیدرآباد میں رہے۔ میں غم روزگار کی الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا اور انھیں غم سیاست سے تھوڑی سی فرصت کبھی نصیب ہوتی تو شاعری کی نذر ہو جاتی تھی۔ ہمارے ایک مالدار دوست راجیا کے یہاں خصوصی محفلیں ہوتی تھیں جہاں ہم دونوں شریک ہوتے تھے یا پھر کبھی کبھار ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی کٹیا میں بیٹھکیں ہوتی تھیں جہاں ہم ملتے تھے۔

انھوں نے اس زمانے میں غزل کا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اس شعری اقدام کا خیر مقدم نہیں کیا۔ اس وقت روزنامہ سیاست میں میرا ایک ریویو چھپا تھا جس میں میں نے لکھا تھا کہ اردو شعر و ادب میں مخدوم کو مقام ان کی غزل گوئی کی وجہ سے نہیں بلکہ نظم نگاری کی وجہ سے ملے گا۔ کیونکہ غزل کی زمین اس قدر فرسودہ اور پامال ہو چکی ہے کہ اب اس میں نئی بات پیدا کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔

مخدوم کو مجھ سے تھوڑی سی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک روز وہ رات کے بارہ بجے میرے یہاں آئے اور مجھے ایک سیکڈے میں لے گئے۔ انھوں نے شراب منگوائی اور جب ہم نے تھوڑی سی پی لی تو انھوں نے کہا کہ آخر تم ان حالات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جن کی وجہ سے میں غزل لکھ رہا ہوں اور یہ کہ غزل گوئی میں میرا اپنا CONTRIBUTION ہے جسے تم دیکھ نہیں رہے ہو۔

غالباً دو سال ہم حیدرآباد میں رہے۔ اس کے بعد میں نے دلی کی راہ لی۔ وہاں کچھ ہم صورت محمد مہدی، منیش نارائن سکسینہ، دوعار، ضیاء الحسن اور رضا علی پہلے ہی سے موجود تھے جنھوں نے دلی میں مجھے ذرا سی اجنبیت کبھی محسوس ہونے نہیں دی۔ مرحوم ٹی۔ بی۔ وٹھل راؤ (جو اس وقت لوک سبھا کے ممبر تھے) اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (جو اس وقت راجیہ سبھا کے ممبر تھے) کے مشترک کمرے میں میرے رہنے کا انتظام ہو گیا۔ یہ کمرہ چھوٹا سا حیدرآباد ہاؤس تھا۔ ان دونوں صاحبوں کے دوستوں اور رفیقوں میں سے جو بھی حیدرآباد سے دلی آتا وہ اسی کمرے میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ اس عرصے میں مخدوم کا دو تین بار اپنے سیاسی اور ٹریڈ یونین کام کے لیے دلی آنا پڑا۔ وہ بھی جب دلی آتے تو اسی کمرے میں ٹھہرتے تھے۔ میری ان سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی

جب وہ افرو ایشیائی سلامتی کونسل کی کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے حیدرآباد کے ڈیلی گیشن کے ساتھ دلّی آئے تھے۔ ڈیلی گیشن کے کچھ ممبر تو اصلی حیدرآباد ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔ لیکن مخدوم معمول کے مطابق اسی کمرے میں ٹھہرے جہاں میں رہتا تھا۔ کانفرنس ختم ہوئی اور دوسرے دن صبح میں ڈیلی گیشن کے ممبروں سے ملنے کے لیے وہ حیدرآباد ہاؤس گئے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب مجھے فون کیا اور بتایا کہ میں ان کا انتظار نہ کروں۔ میں نے جواب میں کہا تھا کہ سب ٹھیک ہی ہوا کیونکہ دوپہر میں میرے لیے بھی کچھ مصروفیت پیدا ہو گئی ہے۔ انھوں نے پوچھا کیا مصروفیت؟ میں نے جواب میں کہا کہ کچھ دیر پہلے شانتا گاندھی نے ٹیلی فون پر مجھ سے کہا ہے کہ وہ ادھر سے گزرنے والی ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے ملنے کے لیے آجائیں گی۔ انھوں نے فوراً کہا شانتا سے ملے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا میں بھی ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس لیے ابھی سیدھے تمہارے یہاں پہنچ رہا ہوں۔

تھوڑی دیر کے بعد مخدوم آئے اور ان کے آنے کے کچھ دیر بعد شانتا بھی اپنی ایک آرٹسٹ دوست مس ہوانی کے ساتھ آگئیں۔ ادھر ادھر کی بات چیت ہوتی رہی۔ جانے سے پہلے شانتا نے مخدوم سے شعر سنانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے اپنے مخصوص ترنم میں ایک قطعہ سنایا جو میرے لیے بھی نیا تھا۔

یہ رقص، رقصِ شرر ہی سہی مگر اے دوست
دلوں کے ساز پہ رقصِ شرر غنیمت ہے
قریب آؤ ذرا، اور بھی قریب آؤ
کہ روح کا سفرِ مختصر غنیمت ہے

انھوں نے شانتا اور مس ہوانی کو اس قطعے کا مفہوم انگریزی میں سمجھایا۔ میں نے مخدوم سے کہا کہ تمھارا قطعہ واقعی بہت دلکش ہے لیکن اس میں سارتر کا فلسفہ وجودیت پیش ہو گیا ہے۔ جب میں نے اس فلسفے کی وضاحت کی تو وہ چونک پڑے اور غالباً انھیں اپنے مارکسٹ ہونے کا خیال آگیا۔ انھوں نے کہا "مجھے تمھارے خیال سے اتفاق نہیں ہے"۔ میں نے کہا "تمھیں اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن خیال تو بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ قطعہ میں موجود ہے"۔ اس بات پر وہ نہیں نہیں کہتے ہوئے ہنس پڑے۔

وہ حیدرآباد لوٹ گئے اور اس کے کچھ مہینے بعد میں نے جون ۱۹۶۱ء میں ہندوستانی سائل کو خیر باد کہا اور یورپ کے کوچہ و بازار میں رسوا ہونے کے لیے لندن پہنچ گیا۔ یہاں آٹھ برس بتا چکا ہوں۔ اس دوران میں مخدوم سے میری رسمی خط و کتابت نہیں رہی۔ ہم دونوں کے ایک بہت ہی پرانے رفیق اور ان کے فیملی ڈاکٹر بی۔ ایس۔ پرانجپے سے میری مستقل خط و کتابت رہی ہے۔ وہ ہمیشہ مجھے مخدوم کی خیریت سے باخبر رکھتے تھے۔ وہ کبھی کبھی مخدوم ان کی نئی نظم لکھوا کر میرے یہاں بھیج دیا کرتے کبھی کوئی دوست حیدرآباد سے لندن آتا تو مخدوم سے ان کی نئی نظمیں لکھوا کر لاتا تھا۔ جب کبھی وہ میرے لیے اپنی نظمیں لکھتے تو اس کے ساتھ کوئی شعر یا کچھ الفاظ ایسے لکھ دیتے جن سے ان کے دیرینہ خلوص و محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ میں سالِ نو کے موقع پر یورپ کے مختلف ملکوں کی سیاحت کے دوران میں ان کے نام تہنیتی کارڈ بھیج کر انھیں یاد کر لیا کرتا تھا اور انھیں

اپنی یاد دلایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار انگریزی میں کوئی مجموعۂ شعر بھی ان کے یہاں تحفے کے طور پر بھیج دیا کرتا تھا۔ غالباً انھیں میری آخری تحریر ان کے پوسٹ کارڈ کی صورت میں ملی ہوگی جو پچھلی مئی میں ان کے خوابوں کے شہر دنیا سے بھیجی گئی۔ میں نے اس میں لکھا تھا دنیا کو اتنی ہی دلکش اور خوبصورت پایا جس قدر کہ وہ مجھ سے بیان کرتے تھے۔

۲ ستمبر کو پوسٹ آفس میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ۱۲ بجے کے قریب ٹیلیفون پر میرے دوست لکھنؤ کے آلِ حسن (جو یہاں بی بی سی میں کام کرتے ہیں) نے اردو بلٹز سے ایک خبر پڑھ کر سنائی کہ مخدوم کا ۲۵ اگست کو انتقال ہوگیا۔ خبر سن کر میں نے محسوس کیا "عجب اک سانحہ سا ہوگیا" پھر آفس میں کام کرنا مشکل ہوگیا۔ میں گھر چلا آیا۔ شام میں آلِ حسن میرے یہاں آگئے اور اپنے ساتھ بلٹز کا وہ پرچہ بھی لے آئے جس میں یہ خبر چھپی تھی۔ میں نے اختر کا وہ ماتمی نوحہ "سوگیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے" پڑھا جو بڑی خوبصورت الفاظ میں اور گہرے تاثر کے ساتھ مخدوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ اسے پڑھ کر میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ آلِ حسن اور میں نے مل کر اپنے رنج و اندوہ کو "غرقِ مے" کرنے کی کوشش کی۔ معمول سے کچھ زیادہ ہی جام خالی ہوئے اور بار بار زبان پر مخدوم کا یہ شعر تھا:

یادِ یاراں میں آئے جو غم اور درد
رات کی چاندنی سوز گاتی رہے

جب کبھی میں ان کی زندگی اور شاعری پر غور کرتا ہوں تو وہ (زندگی اور شاعری دونوں) مجھے دو الگ خانوں میں بٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی زندگی (اور ان کی شاعری) کا ایک خانے میں خالص سیاست، بغاوت، انقلاب اور اشتراکیت ہیں اور اس میں ذرا سی تحریک اور شبہ برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان کی زندگی اور (اسی طرح شاعری) کے دوسرے خانے میں ان کی دو مستیاں، ان کا عشق، جام، مے و رندی اور دنیا مصالحت و مفاہمت سب ہی آجاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف انھوں نے لکھا:

عزمِ آزادی سلامت زندگی پائندہ باد
سرخ پرچم اور اونچا ہو بغاوت زندہ باد

اسی شاعر سے حیرت ہوتی ہے کہ دوسری طرف یہ بھی لکھ سکتا تھا:

تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو بزمِ مے گسار کی بات

کبھی غمِ روزگار نے فرصت دی تو میں اپنے اسی بیان کی روشنی میں ان کی شاعری پر مضمون لکھوں گا۔ اس وقت میں ان کی زندگی کا ایک پہلو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ "اگر وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے" تو مخدوم سے زیادہ ایمان دار آدمی مشکل سے ملے گا۔ اپنی پارٹی کی جو بھی سیاسی لائن ہوتی وہ اس پر وہ ایمانِ کامل رکھتے تھے۔ جب پارٹی کی

لائن بدلتی تو وہ نئی سیاسی لائن پر اسی شد و مد کے ساتھ ایمان لے آتے اور بے جگری کے ساتھ سیاسی جدوجہد جاری رکھتے۔ وہ اس معاملے میں CONFIRMIST تھے۔ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ اگر ان کی زندگی میں پارٹی نہ ہوتی تو ڈسپلن بھی نہیں ہوتا اور وہ بھی کبھی کے سعادت حسن منٹو کی طرح بے وقت موت کا شکار ہو گئے ہوتے۔ چونکہ وہ بنیادی اعتبار سے ایک آرٹسٹ تھے۔ اس لیے بے انتہا جذباتی (EMOTIONAL) آدمی تھے۔ انھیں اپنی پارٹی مزدور طبقے اور سیاسی عقیدے سے گہری جذباتی وابستگی تھی۔

وہ اپنی غیر سیاسی نجی زندگی میں ایک دوسرے ہی شخص بن جاتے تھے۔ اس بارے میں وہ ایک NON-CONFIRMIST تھے۔ انھوں نے روایات کی بہت سی زنجیروں کو توڑ ڈالا۔ بہت سی لایعنی قدروں کو پامال کیا اور شعر و زبان کی فنی پابندیوں کو ٹھکرایا۔ ان کے دوستوں کے حلقے میں ہر ٹائپ کا آدمی شامل ہوتا۔ جاہل اور دانشور، مزدور، کسان، سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے کے لوگ، ترقی پسند اور ترقی دشمن، ادیب و شاعر سبھی ان کے دوست ہوتے تھے۔ سیاسی جماعت بندی کا اس میں نام و نشان بھی نہیں ہوتا تھا۔ دوستانہ تعلقات میں سیاست، طبقہ، مذہب اور جنس کے تمام امتیازات ختم ہو جاتے تھے۔ دوستانہ معاملات میں بڑی لچک ہوتی تھی۔

جب انھیں اپنے کام سے فرصت ملتی تو یک گونہ بیخودی کا اہتمام کر لیتے۔ اکثر ان کے اداشناسوں میں سے کوئی نہ کوئی ان کی تشنگی بجھا دیا کرتا تھا۔ اس معاملے میں انھوں نے دامنِ اعتدال کو کبھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کبھی کسی نے انھیں بدمستی کے عالم میں نہیں دیکھا۔ کبھی کسی بزمِ مے میں وہ محسوس کرتے کہ اب ہوش و حواس کے حدود سے آگے بڑھ جانے کا خطرہ ہے تو وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر چپکے سے محفل سے اٹھ جاتے اور اپنے گھر کی راہ لیتے۔ وہ شراب بہت لطف لے کر پیتے تھے لیکن شراب کو کبھی اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیا۔ جب پیمانہ و صہبا ان کے سامنے آ جاتے تو پھر ان کا اندازِ گل افشانیِ گفتار دیکھنے کے لائق ہوتا تھا۔

وہ جنسی مزاج کے نہیں بلکہ آزاد محبت کے قائل تھے۔ عورت کے معاملے میں ان کا مشرب بہت وسیع تھا۔ مزدور کسان کی بیٹی ہو یا کوئی راج کماری ہو یا مالوے کی من موہنے والی سرزمین کی دوشیزہ ہو۔ اگر وہ ان کے سازِ دل کے تاروں کو چھیڑ دیتی اور انھیں اس کی کوئی ادا بھا جاتی تو پھر وہ ان کی آنکھوں کا تارا، ان کے سجدوں کی مسجود اور جانِ غزل بن جاتی تھی لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان کی محبت میں جنسی تعلقات بھی شامل ہوں۔

مخدوم کو شہر حیدرآباد سے بڑی محبت تھی جس کا اظہار ان کی نظم "بھاگ متی" سے ہوتا ہے۔ اسی شہر کی فضاؤں میں ان کی شاعری پیدا ہوئی، اور پروان چڑھی۔ ان کی فکر نے پختگی حاصل کی اور رزم کے میدانوں میں انھوں نے بہت سی لڑائیاں لڑیں۔

حیدرآباد کی سیاسی ادبی اور کلچرل زندگی پر مخدوم کی شخصیت کی زبردست چھاپ ہے۔ حیدرآبادیوں نے بھی ہر دور میں اپنے محبوب شاعر کو دل کھول کر داد دی۔ جب وہ کسی مشاعرے یا میٹنگ میں اپنی

نظم سنانے کے لیے کھڑے ہو جاتے تو ایک سناٹا سا طاری ہو جاتا تھا اور جب نظم ختم ہوتی تو داد تحسین کا شور اٹھنے لگتا۔ یہی وجہ ہے کہ نظام کے استبدادی دور میں بھی ان کی انقلابی نظمیں بڑی عقیدت کے ساتھ سنی گئیں اور انھیں سراہا گیا۔

مخدوم کی موت کے بعد جب حیدرآباد کا خیال آتا ہے تو مجھے حالی کا یہ مصرع بے اختیارانہ طور سے یاد آجاتا ہے: "شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا"۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

رائے محبوب نارائن

دلّی نے دل پر وار کیا

(یہ مضمون بزمِ محبانِ ادب گرلی پورہ کے یومِ مخدوم کے لیے لکھا گیا)

ایک بوسیدہ حویلی، ایک فرسودہ سماج کو ڈھا کر "آزادی کا پرچم" کھولنے والا، باغی مخدوم فنون شکن قدیم شاعری کے قواعد و ضوابط کا کب پابند ہو سکتا ہے۔ اس کی شاعری کے لہلہاتے صحنِ چمن میں بلند خیالات کے لہلہاتے ہوئے پھول کھلتے ہیں رنگ و بو ڈھونڈتے رہ جائیں شاید نقاد کچھ نہ پائیں۔ مخدوم کی شاعری نے سماج کے جو تانے بانے جس رنگ میں بنے ہیں شاید معمولی نظر نہ دیکھ سکے۔ مخدوم جس دور کی پیداوار رہیں عہدِ آصفی کا شاہی دور ہے جو ہندوستان میں سب سے زیادہ منظم اور طاقتور سلطنت تھی جس کی عنانِ حکومت ایک بیدار مغز بادشاہ کے ہاتھ میں تھی جس کے وزرا برطانوی شہنشاہیت سازِ سیاست و مدبروں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ وقت کے نئے تقاضوں سے واقف، مگر مفاد طلب محنت کش مظلوموں کے تصادم سے بچنے کے لیے مذہب کی آڑ اور خدا کی پناہ چاہتے۔ اس دور میں کتنے ان گنت تعمیری کام ہوئے مگر شخصی اقتدار کی مُہر اس پر ثبت تھی۔ "خاک پہ جس رات اترا مَیں عقیق" رہیں مخدوم کی دوربیں نظروں نے یہ بھی دیکھا کہ "خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں"۔ "ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں"۔ مخدوم اسی تعمیری دور کی دھارا کو شخصی مفاد سے روک ایسے رخ موڑنا چاہتے تھے جس میں سماج کا بھلا ہو جمہور کا راج ہو۔

مخدوم شاعری کیا کرتا تھا عبادت کرتا تھا۔ خالق کی خوشنودی مخلوق کی خوشحالی میں پاتا ہے۔ اس کے مصرعوں کے ترنم میں "خیر العلاج خیر الفلاح" کی اذان ہے۔ مخدوم کی شاعری کوئی خطِ مستقیم نہیں کہ سیدھا کھنچتا چلا جائے۔ وہ ایک حساس لرزتی ہوئی کرن ہے جس میں گرمی ہے، حرارت ہے، نور ہے روشنی ہے حرکت ہے قوتِ تحمل ہے، برداشت ہے۔ مخدوم کی شاعری کا مواد جذبِ خاطر سے کسب ہے۔ اس کا مطالعہ اپنے ماحول کا گہرا مشاہدہ ہے اور صحت مند تجزیہ بھی ایک مقدس سنجیدگی ایک مجذوب دیوانگی مخدوم کے ہر شعر میں ملے گی۔ تخلیقی ادب کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ براہِ راست زندگی کے شعور کو ظاہر کرے۔ نیند کے ماتے کو جھنجھوڑ کر جگائے۔

مخدوم انقلاب کا شاعر ہے مگر خون سے ہولی نہیں کھیلتا۔ وہ اندمالِ زخم کے لیے گنگناتا ہے۔ اس کے کلام میں نئے خون کا ترنم رقص کرتا ہے جہاں اس نے "ہر صبح مے تلخیٔ ایام بھی پی ہے" وہیں ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن" انسان دوستی اور اس کی وسعت کے ساتھ سمٹا ہوا جمالیاتی اثر "قدر مشترک میں کیا کلام"۔ "الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو" "کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل" "چھٹ گئیں بدلیاں کھل گئے پیچ و خم" "جرم کیا، جرم غم مکانات کیا"
"منزلیں پیار کی منزلیں دار، دلدار کی"

قید ہے قید کی میعاد نہیں۔ مخدوم محبس کی سنگین فصیلوں کے پیچھے سے انسانی بیڑے کے ماتھے پر تردد کے شکن دیکھ سکتے ہیں مخدوم کے کانوں میں طوق و زنجیر جھنکار کا شور، زیست کی سوزش کا پتہ دیتا ہے۔ مخدوم جرم گھٹنے سے ناداں تماشائی کو پاس بلاتا ہے۔ پھر جو کچھ وہ خود دیکھتا ہے تماشائی کو دکھلاتا ہے۔" خدا سویا ہوا ہے جل رہی ہے شمع سلطانی"۔

مخدوم نوجوانوں میں مقبول شاعر ہیں وہ جس مشاعرے میں ہوتے لوگ پھر کسی کو سننا پسند نہ کرتے۔ وہ احباب میں محبوب اور محبوب نواز بھی۔

حیدرآباد کی سیاسی تحریک کے زمانے میں جب وہ روپوش تھے پولیس کو تلاش تھی مجھے ان کو چھپائے رکھنے کا گمان تھا مجھ پر ایک انسپکٹر صاحب نگراں ہوئے مجھ سے خوب پینگیں بڑھائیں ایک روز مجھ سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتے ہوں گے میں نے کہا میں جانتا ہوں مگر آپ انھیں پا سکو گے میں کچھ لکھ رہا تھا لکھتے لکھتے کہا مجھے پتہ ہے۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں سمجھے کہ اب دھر لیا۔ لپک کر فوری میز پر جھک گئے۔ کہا میرے اچھے محبوب کہو تو کہاں میں نے آہستہ سے کہا۔
"دل میں رہتے ہیں" پوچھا "دلی میں کہاں" میں نے کہا آپ اونچی کرسی پر بیٹھ کر اونچا سننے لگے ہیں۔
دلی میں نہیں اللہ کے بندے دل میں وہ عوام کے دل میں بس گئے ہیں۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرو پا جاؤ گے۔ آپ کو آپ کا دل بتا دے گا۔ دوسرا اپنا دل چیر کر کس طرح دکھا سکے گا۔ اس روز کیا پتہ تھا کہ دلی اف ری دلی . . . . مخدوم کے کلام کا مطالعہ مخدوم کو پا جانے بس ہے مخدوم کے کلام کے مطالعہ سے اور اس پر بحث و مباحثہ سے وہ مخدوم کے قائل بن گئے تھے مخدوم کے مداح بن گئے تھے۔ مگر اس کو بھی پولیس کی چال ہی سمجھتا رہا۔ اب وہ بھی مرحوم ہو گئے، اور مخدوم بھی۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور محبوب کو معاف کرے۔

"کتنے افسانے ہیں سنتے ہیں جو دیوانوں سے" کہ محفلِ سرخ کی منور شمع سحر سے پہلے بجھ گئی دیکھیے بھڑکتے دلوں کی آگ نئے مشعل کون جلاتا ہے؟

مجھے یہ لگتا ہے روپوش ہو گیا مخدوم

یہ کس پیکر کی رنگینی سمٹ کر دل میں آتی ہے

سجّاد ظہیر

مخدوم کی یاد میں

کیسے یقین آئے کہ مخدوم اب ہم میں نہیں! دوست احباب رفیق سب مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ کہوں، کچھ کہوں۔ اور میں سوچتا ہوں کہاں سے شروع کروں، کیا کہوں، کیا کیا کہوں۔ ان کے بارے میں کہوں یا اپنے بارے میں کہوں، اس ہولناک خلاء کے بارے میں جو اپنی روح اور نفس میں، بلکہ ساری زندگی میں مخدوم کے چلے جانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن میں نے غلط کہا: خلاء میں تو کچھ نہیں ہوتا، اور یہاں تو حیرت ناک طور پر دلکش اور دل گیر انجمن سجی ہے کانوں میں ہی نہیں، رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کے ہر قطرے میں مخدوم کی آواز، ان کا ترنم گونج رہا ہے اور دل کے پردے پر بار بار ان کی مسکراہٹ اور ہنسی کے نقش ملتے بکھرتے نظر آتے ہیں، کبھی ان کو تیس برس پہلے سیاہ شیروانی میں، مخصوص حیدرآبادی طرز کی، اونچا کالر، سب بٹن بند، لمبی سرخ ٹوپی پہنے حیدرآبادی مزدوروں کے جلسے میں پر جوش تقریر کرتے سن رہا ہوں، جلسہ جس کی میں صدارت کر رہا ہوں۔ یہ شاید پچیس تیس برس کی بات ہے، کبھی ان کو بمبئی میں "قومی جنگ" کے دفتر میں دیکھتا ہوں، جہاں بالکل تنگ جگہ میں سردار جعفری، سبط حسن، کیفی اعظمی اور سب اپنی اپنی میزوں سے لگے بیٹھے ہیں اور مخدوم "صفِ اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر" سنا رہے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد ہم ان سے دوسری نظموں کی فرمائش کرتے ہیں، اس زمانے میں مجھے ان کی نظموں میں سب سے زیادہ "اندھیرا" اچھی لگتی تھی، رات کے ہاتھ میں ایک کاسۂ دریوزہ گری ہر لحاظ سے یہ ایک بڑی "انقلابی" نظم تھی، اس کے استعارے: وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ، وہ تہذیب کے زخم ...... اور چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا ..... آزردہ ستاروں کا ہجوم اور پھر آخری مصرعہ: رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں ..... یہ نظم نہیں ایک ترشا ہوا فنی نگینہ تھی، نئی کیف آور، چونکا دینے والی، ایک مکمل تعمیر: جتنی خوب صورت اتنی ہی پر معنی، جتنی جدید اتنی ہی ہماری بہترین روایات میں پیوست: انقلابی شعور و حرکت، عالمی افق کے سرخ سویرے کا رنگ لیے ہوئے، اس کے ساتھ ہم آہنگ!

مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے مخدوم سے پوچھا تھا "مخدوم بتاؤ یہ نظم تم نے کب اور کیسے اور کن حالات میں لکھی۔" اور مخدوم نے جواب دیا، جو مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس لیے شاید کہ نظم کی طرح ان کا جواب بھی چونکا دینے والا تھا۔ انھوں نے کہا "بنّے بھائی آپ کو شاید یقین نہ آئے، میں کلاس میں سبق دے رہا تھا، لڑکوں کو پڑھا رہا تھا کہ اسی دوران

یہ ذہن میں آنے لگی اور پھر میں نے اپنا سبق روک دیا اور وہیں کلاس میں بیٹھ کر یہ پوری نظم تھوڑی دیر میں لکھ ڈالی۔ مشکل سے آدھ گھنٹہ لگے ہوں بلکہ اور بھی کم۔ بعد کو ادھر ادھر سے کچھ تراش خراش ضرور کی، لیکن دراصل پورا ڈھانچہ اسی وقت مکمل ہو گیا تھا۔" میں نے ہنس کر کہا "پھر تو یہ وحی کی طرح نازل ہوئی تم پر مخدوم!" مخدوم نے اس وقت بھی اور پھر بعد کو یہ بات مجھ سے اکثر کہی کہ شعر کہنے کے لئے انہیں سکون، تنہائی، دوسرے کاموں سے فرصت درکار نہیں۔ نظم تو بالکل غیر متوقع طور پر چلتے پھرتے، سفر کے دوران، بات یا تقریر کے دوران ٹریڈ یونین کا کام کرتے وقت، دوستوں کی نجی صحبتوں میں ہنسی مذاق کے دوران، ان کے ذہن میں لال پری کی طرح ناچتی ہوئی جلوہ گر ہو جاتی تھی اور پھر مخدوم کا کام صرف اسے گرفتار کر لینا ہوتا تھا۔ لیکن کوئی نوآموز شاعر اور ادیب اس بات سے یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاعری محض الہامی چیز ہوتی ہے۔ ہوتی تو ہے وہ الہامی۔ کبھی کبھی اپنی بلند ترین کیفیتوں میں۔ لیکن فنکار کی ذہنی اور روحانی کدوکاوش اور تعمیر و حسن کاری کی صلاحیت، روحِ عصر کو سمجھنے اور جذب کرنے کی قوت اور اس کی ہمت اور حوصلہ اور نظر، ان سب کے بغیر الہام ہوتا بھی تو نہیں۔

مخدوم کی اچانک وفات یقینی ہماری انقلابی اشتراکی تحریک اور اردو شعر و ادب کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اور ہم جو ان کے دیرینہ ساتھی ہیں گو کہ اپنی تحریک کی کامیابی اور ظفرمندی پر یقینِ کامل رکھتے ہیں، اور اردو والے ہونے کی حیثیت سے یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے ادب کے دماغ میں کبھی خزاں نہیں آئے گی اور خود دکن میں جہاں قلی قطب شاہ، وجہی، سراج اور ولی جیسے لوگ اٹھے اور جہاں کے ادبی آسمان پر مخدوم جیسا ستارہ اتنی آب و تاب سے چمکا، فن و ادب کا آسمان اپنی رفعت اور درخشندگی برقرار رکھے گا، ایک ایسے انمول موتی کو کھو دیا جو اپنی مثال خود تھا۔

اس کی شخصیت کے بارے میں جتنا بھی سوچتا ہوں یہی محسوس کرتا ہوں اور یہی ایک بات بار بار دل و دماغ میں جاگزیں ہوتی ہے کہ اس شخص نے اپنی تیس چالیس سال کی انقلابی زندگی میں اپنے کو اپنے آرام و آسائش اور اپنی ذات کی تمام خواہشوں اور امنگوں کو کس قدر مٹایا اور دبایا تاکہ اس کی قوم کے مظلوم اور محنت کش عوام جن سے اسے بے پناہ محبت تھی دکھ اور رنج اور تکلیف اور جبر اور سختی کے چکر سے نکل کر نئی مسرت، مہذب اور متمدن زندگی کے روشن میدانوں میں سربلند و سرخرو داخل ہو سکیں۔ اس کی کھولتی ہوئی نفرت اور اس کا آتشیں غصہ اُن طاقتوں، ان طبقوں، ان گروہوں اور اُن افراد کے لئے تھا، اور ان حالات کے لئے جن میں وہ محنت کش عوام کے انقلابی راستے میں مخل اور حائل دیکھتا تھا، اور جن رکاوٹوں کو ہٹانے کے لئے وہ ساری عمر اپنے مظلوم عوام اور اپنے رفیقوں اور اپنی پارٹی کے ساتھ جدوجہد کرتا رہا۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ اگر مخدوم کی اچانک اور قبل از وقت وفات ہوئی تو اس کا سبب یہی ہے کہ مخدوم نے اپنے جسم اور اپنی ذات کو ان کا وہ تھوڑا سا حق بھی دینے سے انکار کیا، جو صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھا: انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئیے تھا۔ لیکن افسوس، اب انھیں کیسے سمجھائیں۔ اور اگر کوئی مخدوم کو سمجھا سکتا تب پھر شاید وہ یہ سوال اٹھا دیتے کہ زندگی کو اس کی کمیت سے نہیں بلکہ کیفیت سے ناپنا چاہیے۔ کیا ہوا اگر موت نے انہیں ایک دن گھیر لیا،

وہ تو ہماری اجتماعی زندگی کو اپنے کارہائے نمایاں سے اتنا مالامال کر چکے تھے کہ جب کبھی جی چاہتا ہمیں خدا حافظ کہکر چلے جاتے اور ہمارے پاس اپنی محبت، اپنے لاجواب فن اور سب سے بڑھ کر اپنی بے بہا انقلابی زندگی کی مثال کے اتنے بھرے خزانے چھوڑ جاتے کہ ہم اس لازوال دولت کے ہوتے ہوئے ان سے شکایت کی کوئی معقول وجہ نہ رکھتے اور یہ خزانے ایسے ہیں جو کبھی خالی نہیں ہوں گے ۔

میں کبھی کبھی مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوں، ایک صدی یا دو صدی بعد کے بارے میں اس سے بھی زیادہ دور مستقبل کے متعلق ۔ آج جن لوگوں کے بڑے طمطراق ہیں ۔جن کے دروازوں پر حاجت مندوں اور خوشامدیوں کی بھیڑیں لگی رہتی ہیں، یا جو اپنے دولت کے نشے میں مگن ہیں کہ خدا کی باقی مخلوق انھیں چیونٹیوں کی طرح حقیر نظر آتی ہے ، سو سال بعد یا پچاس سال بعد کون ان خوش نصیبوں کو یاد رکھے گا ۔ دہلی میں عہد مغلیہ کی آخری بڑی عمارت صفدر جنگ کا مقبرہ ہے لیکن یہ صفدر جنگ تھے کون ، مجھے بھی تاریخ ہند دیکھنا پڑی ۔ ان کا اتا پتہ دریافت کرنے کے لیئے ۔ اور دہلی کے معمولی رہنے والے تو موصوف سے قطعی ناواقف ہیں ، لیکن غالب کے بارے میں کسی سے بھی پوچھ لیجئے کچھ نہ کچھ آپ کو معلوم ہی ہو جائے گا اور شاید دو چار شعر بھی آپ غالب کے سن لیں گے ، ممکن ہے کہ ناموزوں سنائے جائیں یہ ، لیکن آخر لوگوں کے دل میں جگہ تو غالب کے لیئے ہی ہے ! زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ غالب کی یاد دھندلی نہیں ہوتی ، اس کی شہرت بڑھتی جاتی ہے ۔ یہ دنیا کا دستور ہے ۔ کھوٹے اور کھرے کی پرکھ کے معاملے میں انسان خود اپنے زمانے اور اپنی زندگی کے دور میں تو دھوکہ کھا سکتے ہیں اور دھوکہ کھاتے بھی ہیں ، اس لیئے کہ طرح طرح کی خود غرضیاں اور تعصبات لوگوں کی آنکھوں پر پردے ڈال دیتے ہیں ، لیکن امتداد زمانہ اور ایام سیمابی پردوں کو چاک کر کے حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں مخدوم خوش قسمت ہیں کہ ان کی شاعری کو ان کی زندگی میں ہی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ، گو کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتنی نہیں ہوئی جس کے وہ اہل تھے ۔ اس کا ایک سبب ان حلقوں کو مخدوم کی جانب تھا اور ہے ۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال ، مخدوم کی وفات کے بعد بھی ، یہ ہے کہ چند ہفتے پہلے جب دہلی سے اردو مجلس کے پروگرام میں شاذ تمکنت نے مخدوم پر اپنی المناک اور بے حد خوبصورت اور پر اثر نظم نشر کی تب اناؤنسر نے نہ اس کے شروع اور نہ بعد ہی میں یہ کہنے کی زحمت گوارا فرمائی کہ وہ نظم مخدوم کے متعلق ہے گو کہ نظم کے ایک ایک مصرعے سے یہ بات واضح تھی ۔ آخر مخدوم کا نام لیتے ہوئے آل انڈیا ریڈیو کو تکلف کیوں ہوتا ہے ، جبکہ ہر قسم کے ٹکے دو ٹکے کے شاعروں اور ادیبوں کا تعارف کرواتے وقت "اے ، آئی ، آر" کو کوئی تکلف نہیں ہوتا ؟ حد تو یہ ہے کہ "بی بی سی لندن" تک کو اس معاملہ میں ذرا بھی تامل یا تکلف نہیں ہوتا اور انہوں نے لندن میں مجھ سے مخدوم پر چند منٹ کے لیے گفتگو کرنے کو کہا ۔

ایک دوسری بات کا بھی ذکر یہاں پر ضروری ہے ۔ مخدوم کی وفات کے بعد ، قدرتی طور پر بڑے وسیع پیمانے پر ان کا سوگ منایا گیا ۔ ظاہر ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے مخدوم ان حلقوں میں بھی مقبول ہیں جو ان کی ادبی حیثیت اور وقار کو تسلیم کرتے ہیں ، لیکن ان کی سیاست سے یا تو اختلاف رکھتے ہیں یا اُسے اہمیت نہیں دیتے ۔ یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے اور

اس کی ہمیں کسی سے کوئی شکایت نہ ہونا چاہیے۔ لیکن بعض ایسے بددیانت افراد اور حلقے ہیں جو مخدوم کی و
یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں، اشارۃً یا براہِ راست کہ مخدوم کی شاعرانہ خوبی اور برتری کا کوئی تعلق اا
یا انقلابی زندگی سے نہیں تھا، حالانکہ یہ لوگ بخوبی جانتے ہیں یا ان کو جاننا چاہیے کہ مخدوم کی زندگی کی سب
ہی یہ ہے کہ وہ ایک وحدت تھی اور ان کی شاعری کو ان کی پوری شعوری زندگی کے اس اشتراکی نصب العین
دیکھا ہی نہیں جا سکتا جس کے لیے وہ زندہ رہے، اور جس کے لیے انھوں نے اپنے تمام ذہنی، روحانی اور جسمانی صہ
کر دیں تھیں۔ مخدوم کی شاعری ان کے نفس اور ان کی روح کا لطیف ترین جوہر ہے، اور یہ نفس اور یہ روح
اشتراکی مجاہد کے ہیں۔ ترقی پسندی اور اشتراکی انقلاب کے دشمنوں اور برا چاہنے والوں کو، مخدوم کی عظمت کو
پیش کرنے سے ہم کیسے روک سکتے ہیں، آخر وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں ہم جو مخدوم کے بعد زندہ ہیں، اور وہ بھی
زمانے میں مخدوم کے بتائے ہوئے راستے پر ثابت قدمی اور جرأت کے ساتھ چلیں گے، تا وقتیکہ ہم اس منزل پہ
جو مخدوم کی بھی منزل تھی، لیکن جس تک پہونچنے کے لیے ہمیں ابھی اور بھی سخت اور دشوار مرحلوں سے گذرنا ہوگا
اس پیغام کو یاد رکھیں گے ۔

کوہِ غم اور گراں، اور گراں، اور گراں
غمزدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

کرشن چندر

مخدوم — ایک مجاہد شاعر

ایک مرحوم دوست کی چند یادیں

دل کا سامان اٹھاؤ
جان کو نیلام کرو
اور چلو
درد کا چاند سرِ شام نکل آئے گا
کیا مداوا ہے؟
چلو درد پیو
چاند کو پیمانہ بناؤ
رت کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے کالے آنسو
رت سے کہہ دو
کہ وہ پھر آئے
چلو
اس گل اندام کی چاہت میں بھی کیا کیا نہ ہوا
درد پیدا ہوا درماں کوئی پیدا نہ ہوا
(مخدوم کی آخری نظم)

دبلا پتلا سیاہ فام، صاف شفاف پانی کے دو گہرے تالابوں کی مانند چمکتی ہوئی اور سنجیدہ آنکھیں! مخدوم کے انتقال کے بعد گزشتہ چند دنوں سے اس کی شبیہ میرے ذہن کے ایک گوشے میں اپنا گھر بنا چکی ہے۔ یہ ہیولیٰ مجھ سے ایک لمحہ کے لیے بھی جدا نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اس شبیہ کو ذہن و خیال سے نکال دینا چاہیے کیونکہ میری جو چیزیں

مرنے والی تھیں وہ تو کبھی کی مرگئیں اور جو کچھ زندہ ہے وہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور زندہ رہنے کے لیے خبیث روحوں ہی سے نجات حاصل کرلینا کافی نہیں بلکہ پیارے دوستوں کی ایسی یاد کو نکال پھینکنا پڑتا ہے جو کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی ہے۔ میرا یہ مضمون مخدوم کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنے کے مترادف نہیں بلکہ اس کی شبیہ کو اپنے ذہن و خیال سے نکال باہر کرنے کی ایک کوشش ہے تاکہ میں اس کے بغیر بھی زندہ رہ سکوں۔

مجھے یاد نہیں کہ مخدوم سے پہلی بار میری ملاقات کب ہوئی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ شروع ہی سے میرے ساتھ تھا۔ یہ احساس اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ دو آدمیوں کے ذہنوں اور ان کی روحوں میں مشابہت ہی نہیں یگانگت ہوتی ہے۔ گزشتہ ۳۵ برس کے دوران مجھ جیسے ۳۵، افراد اردو میں لکھتے رہے اور آج ہم سبھوں کا شمار اگلے وقتوں کے ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھیں انسان کی نفسیات کا تھوڑا بہت علم ہے اور جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ لکھنے والوں کے اعتبار سے ان پر چند سماجی پابندیاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ ہم سب ایک عجیب و غریب ناقابل اظہار منطق کی ڈوری میں بندھے رہے۔ جب بھی ہم پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو ہم سب اس کے مقابلے کے لیے صف آرا ہو جاتے اور جب کوئی فکر نہ ہوتی تو صحت مندانہ انداز میں ایک دوسرے کی چغلی سے دل بہلا لیتے۔ ہم سب ذہن اور روح کی یگانگت کے لحاظ سے ہمیشہ ایک اکائی بنے رہے۔ کوئی بات ہماری دوستی کے بندھن نہ توڑ سکی — ہم سارے ہندوستان میں بکھرے ہوئے ہیں — اور اسی لیے مہینوں ایک دوسرے سے ملتے بھی نہیں — برسوں خط و کتابت بھی نہیں ہوتی کبھی کبھی ہم، ایک ہی شہر میں موجود ہوتے ہیں، اور اس کے باوجود ایک دوسرے سے ملتے بھی نہیں۔ لیکن یہ ساری باتیں ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ دوستی کی غیر مرئی ڈوری ہمیں بہر حال باندھے رکھتی ہے۔ جوانی سے بڑھاپے تک، بھوک و افلاس کے زمانہ سے خوشی کے دور، اور پھر ایک بار نکبت و فلاکت کے عہد تک۔ وقت اور زمانہ کے نشیب و فراز کا ہم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم سب لباس کے کھردرے پن پر نظر نہیں کرتے، کیونکہ ہمارے لئے روح کا تانا بانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مسافت اور فاصلہ ہمارے لئے اعتباری ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ اندازِ فکر کے اعتبار سے تو ہم میں کوئی بُعد نہیں۔ دو سال پہلے عباس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں اپنی ۳۰ سالہ دوستی کی یاد میں ایک شایان شان تقریب منعقد کرنی چاہیے۔ لیکن ان ہی دنوں میرے قلب پر پہلا حملہ ہوا۔ اس کے بعد پرویز شاہدی کا اچانک کلکتہ میں انتقال ہو گیا۔ اور اب مخدوم، حیدرآباد میں دفن ہو گیا ہے۔ ان دوستوں کی مفارقت میں کوئی تقریب منانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ موت نے ہمارے پر نوچ لیے ہیں، اور وقت ہمیں، اپنے سن و سال کی یاد دلاتا ہے۔

ماضی کے جھروکوں سے، حیدرآباد میں گذری ہوئی ایک شام جھانک رہی ہے۔ سروجنی نائیڈو ایک ادبی کانفرنس کی رسم افتتاح انجام دے رہی تھیں۔ اور مخدوم اس کانفرنس کا آرگنائزر تھا۔ نظام حیدرآباد زندہ اور برسرِ اقتدار تھے۔ انگریز رزیڈنٹ کا سکہ چلتا تھا غرض یہ کہ ریاست میں آمریت کا دور دورہ تھا۔ دوہری پابندیوں میں جکڑے ہوئے ہم لوگوں سے کہا گیا کہ ہم احتیاط سے کام لیں۔ لیکن توقع کے مطابق ہم نے اس ہدایت کی پروا نہیں کی، اور ہم سب

آتشِ نوائی پر اتر آئے کیونکہ وہ ہماری جوانی اور ناتجربہ کاری کے دن تھے۔ [illegible] دو آتشہ کا ایک آدھ جرعہ بھی ہمارے حلق سے نیچے اتر چکا تھا۔ کانفرنس بے حد کامیاب رہی۔ جس شام کی یاد مجھے آرہی ہے وہ اس کانفرنس کے تین دن بعد کی تھی۔ کانفرنس ایک راجہ صاحب کی لائبریری میں شروع ہوئی اور راجہ صاحب کے محل کے لان پر ہی اختتام کو پہونچی۔ جام و مینا، خوب صورت چہروں اور خوش اخلاقی کے اسی ماحول میں، میں نے پہلی مرتبہ مخدوم کو سنا۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ اس نے کونسی نظم سنائی تھی۔ لیکن اس کی آواز نے ایک عجیب و غریب سماں باندھ دیا اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں کسی خوش نوا مغنی کو خواب میں گاتے، سن رہا ہوں۔ ہم ایک حلقہ کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ رنگین پیکروں کا روپ دھارنے لگے۔ دوسرا دور شروع ہوا۔ اور کسی نے کہا "اب تمہاری باری ہے"، لیکن ہمیں پتہ چلا کہ مخدوم چپکے سے کھسک گیا ہے۔ وہ حلقہ یاراں سے اٹھ کر بیڑی مزدوروں کے ایک جلوس کی قیادت و رہنمائی کے لیے چلا گیا تھا۔ اس پر پولس نے لاٹھی چارج کیا۔ اور پہلی مار مخدوم ہی پر پڑی۔ اس قسم کی لڑائیوں میں وہ ہمیشہ آگے رہتا۔ مخدوم کی نظم ہم سن چکے تھے۔ بظاہر اس کا مزدوروں کے جلوس سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن اس کا افق تصور اتنا بیکراں تھا کہ، اس نے اپنی شاعری کو آسودہ حالی کی جدوجہد کا ایک جزو بنا لیا۔ مخدوم صبح، انقلابیوں کے کسی جلسہ میں شرکت کرتا، دوپہر میں، کالج کے لکچر میں شرکت کرتا، اور سہ پہر میں کسی مزدور مورچہ کے ساتھ نظر آتا۔ ہر شام وہ، غزل گو دوستوں کے حلقے میں لہک لہک کر اشعار سنا رہا ہوتا۔

مارکسٹ انقلابی کے جوش کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے آداب و اطوار میں پرانی وضعداری بھی شامل کر لی تھی۔ اور یہ امتزاج بڑا ہی خوشگوار نظر آتا۔ فطرتاً وہ بڑا شرمیلا آدمی تھا۔ ان کے سنجیدہ اور گمبھیر چہرہ پر کبھی مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لکیر دوڑ جاتی تو، ایسا محسوس ہوتا جیسے چنبیلی کی کوئی کلی کھلنے ہی والی ہے۔ میں مخدوم کی مسکراہٹ سے بہت لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ اور اسے مسکراتا دیکھ کر، زندگی پر میرا بھروسہ اور اعتماد بڑھتا جاتا تھا۔ اگست ستمبر ۱۹۶۷ء میں آخری بار ہم دونوں کافی دنوں تک ایک ساتھ رہے۔ ہم نے بہار ریلیف فنڈ کے سلسلہ میں پانچ ریاستوں کا دورہ کیا۔ ان دنوں بہار، قحط کے چنگل میں جکڑا ہوا تھا۔ اور ہم اگلے وقتوں کے ۳۵۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ ہمیں ایک خاص تاریخ پر دہلی پہونچ کر فوراً دہلی، ہریانہ، پنجاب، راجستھان، اتر پردیش اور بہار کا دورہ کرکے، اپنی نظمیں، اپنے افسانے اور اپنے طنزیہ مضامین سنا کر بہار ریلیف فنڈ کے لیے سرمایہ جمع کرنا چاہیے۔ ہم، سڑک کے راستہ چل پڑے۔ مجھے یاد ہے کہ جس دن میں اور ساحر لدھیانوی بمبئی سے نکلے، اس دن بارش ہو رہی تھی۔ اور ہوائیں چل رہی تھیں۔ خواجہ احمد عباس اور سردار جعفری، طیارہ سے دہلی روانہ ہوئے۔ مخدوم حیدرآباد سے آیا۔ اور اردو شاعروں کے امام حضرت فراق گورکھپوری الہ آباد سے تشریف لائے۔ سجاد ظہیر تو پہلے ہی سے دہلی میں موجود تھے۔ دیگر اصحاب بھی اپنے اپنے شہر سے آکر ہمارے قافلہ میں شامل ہوتے گئے۔ سمترانندن پنت اور امرت رائے، الہ آباد سے ہمارے ساتھ ہو گئے، سہیل عظیم آبادی کا پٹنہ میں اور کلام حیدری کا گیا میں اضافہ ہوا۔ یشپال، امرت لال ناگر، بھگوتی چرن ورما، اور رام لال، لکھنو سے ہمارے

ہم سفر بن گئے۔ ہمارے پہلے جلسہ کی صدارت، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کی تھی۔ اور اس میں ہم نے ۱۸ ہزار روپے جمع کئے۔ ہمارے پاس ایک جیپ اور چار موٹر کاریں تھیں، شمالی ہندوستان کے لاتناہی شہروں میں ہمارا یہ سفر بیحد طوفانی اور صبر آزما نوعیت کا تھا۔ ہمارا بیشتر وقت سڑک پر گذرتا۔ اور ہم روزانہ تین تا چار سو میل کی مسافت طے کرتے۔ سڑک کے کناروں پر قائم کی جانے والی ٹین اور خس پوش ہوٹلوں میں ہم کھانا کھاتے اور جب بھی ہمارے کاروان کی ایک دو موٹریں مرمت طلب ہو جاتیں، قریبی چھوٹے سے شہر کی کسی چھوٹی سی ہوٹل میں ہم رات گزار لیتے۔

ہم میں سے اکثر ۵۰ سال سے بڑی عمر کے تھے۔ لیکن ہم سے ہر ایک نے اس طوفانی دورہ کا لطف اٹھایا۔ ہر شام ہمیں ایک آدھ جلسہ میں شریک ہونا پڑتا۔ اور ان جلسوں میں، اتنا ہجوم ہوتا کہ منتظمین کو پھینے تھا کہ بس رکھنا مشکل ہو جاتا۔ لوگوں کا یہ ہجوم، گھنٹوں ہمارے انتظار کی زحمت اٹھاتا۔، جب کبھی مجمع قابو سے باہر ہو جاتا تو مخدوم اور ساحر کی شاعری کام آجاتی، یا پھر فراق صاحب کا ایک ادھ چٹکلہ۔ ہمیں راتوں میں کافی دیر تک جاگنا پڑتا۔ اور بالعموم صبح کی ابتدائی ساعتوں میں ہمارا قافلہ چل پڑتا۔ اور مخدوم شب بیداری اور صبح خیزی دونوں ہی معاملات میں ہمارے رہنما ثابت ہوتے۔ غیر محسوس طریقہ پر ہم نے فرائض کی آپس میں تقسیم کر لی تھی۔ چونکہ مجھے بھی سویرے بیدار ہونے کی عادت ہے۔ اس لئے میں اپنے آدھے ہمسفروں کو اٹھا دیتا۔ اور بقیہ آدھے ہمسفروں کے لئے مخدوم کی آواز، مرغ کی بانگ بن جاتی۔ بعض دفعہ تو ان گھوڑے بیچ کر سونے والوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھانا پڑتا۔ اس فن میں مخدوم کو مجھ سے کمال اور مہارت حاصل تھی۔ ایک دن مخدوم نے مجھے بتایا کہ، یہ بہار کو ان کا دوسرا پھیرا ہے۔ پہلی مرتبہ کالج کے ایک طالب علم کی حیثیت سے، وہ ان دنوں بہار آئے تھے، جبکہ یہ ریاست زلزلہ سے تہس نہس ہو گئی تھی۔ انہوں نے کہا "میں نے ایک ڈرامہ لکھا تھا اسے خود میں نے ہی ڈایرکٹ کیا اور اسٹیج پر پیش کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ میں ہی اس کا ہیرو بھی تھا۔ یہ ڈرامہ بیحد کامیاب رہا۔"

میں نے کہا "ہونا ہی چاہئے تھا! کیونکہ تم جو اس کے ہیرو تھے..."

مخدوم میرے طنز کا خیال کئے بغیر، بولتے جا رہے تھے "مجھے تو بہت پہلے ہی ۱۹۱۱ء میں بہار والوں کی مدد کے لئے آنا چاہیئے تھا... لیکن اس وقت میں صرف تین سال کا تھا"

"بکواس" ...... میں نے کہا "آخر بہار پر کتنی بار مصیبتیں ٹوٹی ہیں" مخدوم کب چپ رہنے والے تھے۔ انہوں نے فوراً جواب دیا، ہمارے شاستروں کی رو سے تو دو ہزار برس پہلے کبھی بہار میں سبھیانک قحط پڑا تھا" ہم دونوں، نیم غنودگی کے عالم میں کافی دیر تک اس مسئلہ پر بات چیت کرتے رہے۔ میں نے مراد چودھری کے اس خیال کی تائید کی کہ "ہم نکموں کی قوم ہیں" مخدوم جو، حرکت و عمل ہی کو زندگی کا نام دیا کرتے تھے اور جن کے سوچنے کا انداز ہمیشہ اثباتی رہا..... کہنے لگے ہمیشہ ہی ہم نکمے نہیں رہے ہیں "اب بھی اس ملک کی ساری برائیاں دور ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ہم ایک ذرا سا حرکت میں آجائیں۔"

ایک مرتبہ مخدوم نے مجھے صبح کے ۶ بجے تک سوتا دیکھا۔ رات کا پروگرام چونکہ کافی دیر میں ختم ہوا تھا۔ اس لئے میں دیر تک سوتا رہا۔ مخدوم نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ انہوں نے نہ جانے کیا کیا صلواتیں سنائیں۔ اور کہنے لگے ... اٹھ بھی، کیا سورج کی شعاعیں بھی، تیری آنکھوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی ہیں۔ بیٹا اٹھو ورنہ جنت کا ٹکٹ نہیں ملے گا۔"

"یہ گالی گلوج کیوں"۔ میں بوکھلا کر پوچھنے لگا۔ مخدوم نے کہا کہ یہ ٹھیٹ امریکن اسٹائل ہے مجھے اٹھانے کے بعد وہ دوسرے محوِ خواب کے بستر پر پہونچ گئے اور ہر شخص کو نئی گالیاں دیکر، اپنی متنوع معلومات کا عملی ثبوت دیا۔

اس سفر کے دوران مجھے مخدوم کی، ایک اور خصوصیت کا علم ہوا۔ اور وہ یہ تھی کہ کسی جلسہ میں نظم سنانے کے بعد وہ کوئی تقریر نہ کرتے، نتیجہ یہ ہوتا کہ، جلسہ میں سننے والا ہر شخص، ان کے کسی نہ کسی شعر یا مصرعہ کو، اپنے آپ پر منطبق کرکے اس کی معنویت پر غور کرنے لگتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی کہ نظم مخدوم صاحب اپنے ہی کو سناتے، بالکل اس انداز میں جیسے وہ یکہ و تنہا ہیں ختم ہونے پر اکثر نہ تو کوئی تالی بجتی اور نہ ہی کسی کی زبان سے واہ واہ نکلتی۔ لمحہ دو لمحہ کی خاموشی سے، یوں محسوس ہونے لگتا جیسے ہر شخص ان کے ایک ایک مصرعہ پر غور کر رہا ہے ...... اور پھر اس کے بعد تالیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔

اب تو مخدوم کی یہ ساری باتیں یاد بن گئی ہیں۔ وہ ۶۱ سالہ پیرِ نابالغ ہم میں نہیں رہا ہے۔ اس کی یاد، مجھے سوگوار کرتی ہے۔ اصول اور رسمِ دنیا کے مطابق تو، مجھے اس سے پہلے مراجعت کرنی چاہیئے تھی۔

گذشتہ دو سال کے دوران، میرے قلب پر دو حملے ہوئے جب کہ دو ہی دن میں اس کے دل پر دو حملے ہوئے۔ وہ زندگی بھر دُبلا پتلا اور پھر تیلا رہا اور اسی پھرتیلے پن سے کام لیکر، مجھ سے پہلے چلتا بنا۔ وہ شاعر بھی تھا ٹریڈ یونین لیڈر بھی۔ بارہ سال تک وہ آندھرا پردیش قانون ساز کونسل کا رکن بھی رہا۔ تلنگانہ کا وہ ہیرو...... اب کہاں ہے؟

غالباً وہ رضوان کی بھی آنکھ بچا کر، جنت میں داخل ہو گیا ہو گا! ممکن ہے کہ وہ اس وقت چنبیلی کے کسی منڈوے تلے حوروں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر کوئی نظم سنا رہا ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اہلِ جنت کے شرائط کار پر، داروغہ بہشت سے، کسی بات چیت میں مشغول ہو۔

وہ جہاں کہیں ہو، ہمارے ہی ساتھ ہے جب بھی ہم ۲۳، ۲۰ یا ۱۰ دوست حلقہ یاراں کی صورت میں بیٹھے ہوں گے۔ ہمیں مخدوم کی جگہ خالی نظر آئے گی۔ ایسے ہر موقع پر، لطیفہ گوئی، یا نظم خوانی کے دوران بے خیالی کے عالم میں کسی نہ کسی زبان سے نکل جائے گا.. "..... مخدوم اب تمہاری باری ہے"..... اور پھر حلقہ یاراں پر ایک سکوت، ایک سناٹا طاری ہو جائے گا۔ ہم سب آنکھیں بند کرلیں گے اور مخدوم جہاں کہیں بھی ہوگا، ہمارے دلوں کی گہرائی میں اتر کر گنگنانے لگے گا۔

ایک چمبیلی کے منڈوے تلے
میکدہ سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
ایک چمبیلی کے منڈوے تلے
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے

پیار ... حرفِ وفا
پیار .... ان کا خدا
پیار ... ان کی چتا

زینت ساجدہ

مخدوم محی الدین

مخدوم میں تمہارا پرسہ کس کو دوں ؟
کیا تمہارے بیوی بچوں کو ؟ مگر ان غریبوں کی زندگی میں تم کس قدر کم شریک رہے۔ تمہاری سیاسی سرگرمیوں اور شاعرانہ مصروفیتوں نے تمہیں اکثر ان سے دور دور رکھا اور اب ادھر کچھ سالوں سے پہلے کی نسبت کسی قدر زیادہ وہ تمہارے وجود کے قرب سے استفادہ کرتے رہے ہوں گے۔ مگر ایک عام آدمی اپنے گھر والوں کی زندگی میں جس طرح گھلا ملا رہتا ہے اس کا تو تمہیں موقع ہی نہ تھا۔ تم تو سارے زمانے کو ساتھ لے چلنے کی فکر میں تھے یہ چند رہرو تمہیں اپنا اور صرف اپنا ساتھی کبھی نہ بنا سکے۔

کیا تمہارے بڑے بھائی سے اظہار تعزیت کروں ؟ وہ جو ہمیشہ تمہاری ذمہ داریوں کو اپنی ذمہ داری سمجھتے رہے اور ادھر چند سال سے ممکن ہے انھیں یہ خیال رہا ہو کہ اب وہ تم سے بے فکر ہو گئے ہیں اور تم ان کے بڑھاپے کا سہارا بنو گے۔ لیکن تم پھر غائب ہو گئے ہمیشہ کے لیے۔ اب کم از کم یہ فکر تو انھیں یا کسی کو نہیں ستائے گی کہ کب لوٹو گے، کب آؤ گے کب خیریت معلوم ہوگی۔

مگر پرسہ کسی کو نہیں دیا جا سکتا نہ دینے کا موقع ہے۔ تمہارا غم کس کو نہیں، کون کیسے سمجھائے، کون کس کی تعزیت کرے۔ اس دن تو تمہاری برات میں سارا حیدرآباد سمٹ آیا تھا۔ ۲۶ اگست کی صبح سے ہر راستہ بیگم پیٹ ایرپورٹ کی طرف رواں دواں تھا۔ ۲۵ کی شام کو جب سے لوگوں نے سنا تھا کہ محمد شاہ رنگیلے کی جس دلی نے دلی کا دل چھینا تھا اس نے اس بار حیدرآباد کا دل ہی توڑ دیا ہے۔ اس وقت سے لوگ تمہاری آمد کے بے چینی سے منتظر تھے۔ تمہاری اپنی زمین پیاری زمین تمہیں لینے کے لیے آغوش دل کشادہ کیے ہوئے تھی کہ تھکے ماندے مسافر اب سو جاؤ۔ اس دن بسوں میں لاریوں میں آٹو رکشاؤں میں، اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں پہ لوگ سرپٹ بھاگے جا رہے تھے۔ سب تمہیں لینے جا رہے تھے۔ تمہارا استقبال کرنا تھا انھیں تم آج اُدھر کس ڈھنگ سے اپنے لوٹ کر وطن آ رہے تھے۔ لوگ

ایک ایک لمحہ گن رہے تھے۔ اب آؤ گے اب آؤ گے۔ تمھاری نظم انتظار کا ایک ایک لفظ ان کی سمجھ میں آچکا تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے سورج کے سائے میں بے شمار سر نظر آتے تھے۔ اس دن نہ کسی کو گرمی کا احساس تھا نہ ہجوم کی گھبراہٹ۔ بس ایک دوسرے کو دیکھا، سر کا ایک اشارہ یا چشم و ابرو کی ایک جنبش اچھا تم بھی ہو اور ہم بھی۔ خاموشی گویائی بن گئی تھی۔ تمھارا نام لیے بغیر الفاظ کا سہارا ڈھونڈے بغیر سب تمھارا ہی ذکر کر رہے تھے، تمھارا ہی نام جپ رہے تھے۔ اتنے بڑے مجمع کو قابو میں رکھنے کے لیے نہ التجا کی ضرورت تھی نہ حکم احکام کی۔ ہجوم خود ہی اپنی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ شور و غل نہیں ہنگامہ نہیں، دبی دبی سسکیاں یا ٹھنڈی سانسیں۔ یہ سب کیوں ہوا، کس طرح ہوا؟ یہ جو ناقابل فہم بھی ہے اور ناقابل یقین بھی۔

یہ کیسی انوکھی بارات آرہی تھی اور براتی بھی کیسے طرح طرح کے۔ مزدور، طالب علم، تاجر، چھوٹے اور بڑے، سڑکوں پر بے مقصد گھومنے والے، دفتروں اور کارخانوں میں کام کرنے والے، تمھاری شاعری کے پرستار، تمھاری شخصیت کے مداح، تمھارے سیاسی حریف، تمھارے شخصی دوست، تمھارے بزرگ، تمھارے ساتھی، تمھارے شاگرد اور وہ سارے بے نام لوگ جو تمھیں اپنا سمجھتے تھے جن میں سے تم شاید کسی کا نام بھی نہ جانتے ہو گے، صورت آشنا بھی نہ ہو گے — وہ سب جل جائے تمھیں لینے کے لیے اپنے اپنے کام چھوڑ کر دوڑے آئے تھے۔ کسی کو تمھاری کوئی ادا یاد تھی کسی کو تمھاری شعلہ بیانی، تقریر کسی کو تمھارا شعر، کسی کو تمھارا انسانی برتاؤ۔ ہر ایک اپنی یادوں کی گٹھڑی اٹھائے کھڑا تھا۔ یہ سب جو آئے تھے حیدرآباد کی گلیوں اور بستیوں میں بسنے والے ہی نہیں تھے۔ دور دور سے بھی آئے تھے نلگنڈہ، وجے واڑہ، عادل آباد، کریم نگر اور کہاں کہاں سے بھوکے پیاسے اپنے آپ کو بھول کر صرف تمھیں یاد رکھ کر یہ سب کے سب چلے آئے تھے۔

ہوائی جہاز کی آمد کے ساتھ ہی سب نے جیسے سانسیں روک لی تھیں۔ آج تم اپنی زندگی کا آخری ڈرامہ کھیل رہے تھے اور ہجوم اکٹھا کرنے کی تمھیں عادت رہی۔ مشاعرہ ہو کہ بھوک ہڑتال، احتجاجی تقریر ہو کہ جیل سے چھوٹ کر آنا، ہر بار یہ ہجوم تمھارے اردگرد جمع ہوتا تھا۔ گویا سب کو کھینچ کر بلا لانا بھی تمھارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ اور ایسا مجمع جیسا کہ ۲۶ اگست کو اکٹھا ہو گیا تھا۔ ایک عام آدمی کے لیے .... لیے برسوں سے نہیں ہوا تھا۔ دولت، طاقت، اقتدار، شان و شوکت اور حکومت کے ہر وسیلے کے بغیر تم نے ان سب کو کھینچ بلایا تھا۔ یہ سب تمھارے چاہنے والے تھے۔ تمھارے عاشق تھے اور تمھیں اپنا عاشق سمجھتے تھے اسی لیے تو اتنی دھوم دھام تھی۔ ایرپورٹ پر ایک اجنبی مسافر نے حیرت سے منہ کھولے جب کسی سے پوچھا کہ وہ تو منسٹر بھی نہیں تھا صرف ایم۔ ایل۔ سی تھا پھر اتنا ہجوم کیوں؟ تو فوراً کسی نے اسے ٹوک دیا کہ بے وقوفی کی بات نہ کرو۔ وہ مخدوم تھا۔ بے چارا۔ بے وقوفوں کی طرح منہ دیکھتا رہا یہ کیا بات ہوئی کہ مخدوم تھا مگر ہاں یہی تمھارا مکمل تعارف ہے۔

آج تو تمھارا راستہ بدلا تھا۔ کبھی فرصت ملی اور دل ٹھکانے سے ہوا تو اس سے پوچھیں گے کہ سچ بتا یہاں

آنے تک چوبیس گھنٹے تجھ پر کس طرح گزرے، کس طرح گزارے جا سکے۔ ابھی تو دماغ ماؤف ہے۔ ہر بات جیسے معمول بسر گئی ہے اور اب کیوں نہ ہو۔ مخدوم تمہارے دوستوں کو یہ بھی یاد نہیں کہ رفاقت اور دوستی کے اتنے عرصے میں کبھی تمہاری خیریت اور مزاج پرسی کی ضرورت پیش آئی ہو۔ اس لیے کیسے شبہ ہو سکتا تھا کہ شاداب و توانا زندہ و جوان جسم کے ساتھ کبھی موت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا اس طرح موم کی طرح چپکے سے پگھل جائے گا۔ کاش تم نے اس ذرا آنکھیں کھول کر اپنے چاہنے والوں پر ایک نظر ڈالی ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ نظر فخر کی ہوتی۔ اطمینان کی ہوتی کہ یہ سب تمہارے چلے جانے کو کس طرح ناقابل یقین سمجھتے ہیں۔ مگر تمہارا آخری سفر تو تم نے آنکھیں موند کر طے کیا اور کھلی آنکھوں والوں پر لمحہ بہ لمحہ فنا کی حقیقت واضح ہوتی گئی۔ شاعر، رہنما مقرر پیدا ہوتے ہیں پیدا ہوتے رہیں گے مگر تمہارا کھو جانا ایک اچھے اور سچے انسان کا اور ہمارے دوست کا کھو جانا تھا اور تمہارے ساتھ ہم میں سے ہر ایک کی کتاب زندگی کے کچھ اوراق ہمیشہ کے لیے کھو گئے۔

میر حسن کی بات پر ہم نے اعتبار کر لیا تھا کہ زندگی میں جشن منالو، چاہت کا اظہار کرو اس سے زندگی اور بڑھ جاتی ہے۔ ہم نے تو چاہنے اور چاہت کے اظہار میں کسی قسم کی کمی نہیں کی تھی پھر تم کیوں رخصت ہو گئے؟ جانے دو اب کسی سے اس قدر اپنائیت کا اظہار نہیں کریں گے۔ اب دیکھو میر حسن کہتا ہے تمہیں نظر لگ گئی۔ تمہارے چاہنے والوں کو بھی اور تمہارے چاہنے والوں کو بھی۔ تمہارے سبھی دوست اس دن وہاں جمع تھے اور کتنے لوگ جو عام دنوں میں نظروں سے اوجھل رہتے ہیں وہ سب کے سب تمہارے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ ہر ایک تمہیں اپنا کہتا ہے اپنا سمجھتا ہے۔ تم ایک ہوتے ہوئے سب کے تھے۔ تم تو دشمن سے بھی دوستی کا دم بھر کے اسے ہنسا دیتے تھے۔ تم ان کے لیے بھی لڑتے جھگڑتے، حقوق منواتے اور مراعات مانگتے تھے جو تمہاری شہرت، تمہاری عزت، تمہاری شاعری تمہاری شخصیت اور تمہاری مقبولیت سے نالاں تھے۔ تم تو ہر ایک کے وکیل تھے پھر تمہارا دشمن بنا رہنا اس کے لیے آسان تھا۔

تم اس قدر توانا دم خم رکھنے والے، چست و مستعد فرض شناس سپاہی تھے کہ ہر مورچہ پر تازہ دم نظر آتے تم میں کبھی تھکن کے آثار دکھائی دیے نہ ماندگی کے۔ پھر تم نے اچانک یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ منہ موڑ کر چل دو۔

وہ خدا جب تم جیلوں میں صعوبت جھیلتے رہے، لاٹھیاں کھائیں، چیتھڑے ہو کے رہے، تب تو تمہیں کچھ نہیں ہوا وہ سب تم ہنس ہنس کر سہتے رہے۔ جیسے کوئی بات نہ ہوا اور اب جب کہ کسی کو تمہاری طرف سے کوئی خدشہ نہیں تھا کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا کہ کچھ ہونے والا ہے جب سب کچھ ٹھیک تھا کہ تم یوں چل دیئے۔ اب تم بتاؤ کہ یہ سب کے سب تمہارے چاہنے والے یوں بولائے بولائے پھر رہے ہیں تو کس کا دکھ بانٹا جائے کسے تسلی دی جائے۔

میں نے ایک کہانی پڑھی تھی ایک بہروپیہ روز نئے نئے بھیس بدلا کرتا۔ کبھی جادوگر بنتا، کبھی مداری کبھی فلسفی دکھائی دیتا اور کبھی سوداگر، ہر بار لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے۔ کبھی اسے پہچان نہ پاتے۔ ایک دن اسے تابوت میں

لیٹا دیکھ کر لوگوں نے اسے پہچان لیا کہ واہ کیا سچ مچ مرنے کا سوانگ بنایا ہے۔ مگر وہ سوانگ نہ تھا وہ تو سچ تھا جسے جھوٹ سمجھنے کو جی چاہتا تھا۔ اسی طرح تمہارے بارے میں سناؤنی سن کر اعتبار نہ آیا۔ تمھیں اس دن لیٹا دیکھ کر یقین کرنے کو جی نہ چاہا، اور آج بھی یہ ماننے کو دل کسی طرح تیار نہیں کہ تم سچ مچ چلے گئے۔ اب تمہاری آواز کبھی کانوں میں رس نہ گھولے گی۔

تم تو جہد مسلسل کے عادی رہے، برسوں کھوئے کھوئے پھرے۔ اب کہیں جاکر تو وہ دن آئے تھے کہ تم ذرا رک کر سکون کا سانس لیتے، اپنے کنبے کے ساتھ چھت کے نیچے پاؤں پھیلا کر لیٹتے، ہنستے بولتے اور زندگی کی گرم دھوپ کے بعد سکون کی چھاؤں سے لطف اٹھاتے۔ تم نے اس دن کتنے فخر سے کہا تھا اب میں بھی نانا بن گیا ہوں، تو ان ننھے منوں کو اپنی شاداب کہانیاں سناتے۔

یہی نہیں آج معلوم نہیں کیوں نئی نسل میں تنہائی اور غم ذات کی بیماری پھیلتی جا رہی ہے عام ہو گئی ہے۔ یہ نوجوان جنھیں سر اٹھا کر چلنا چاہیے زندگی کے چیلنج مردانہ وار قبول کرنا چاہیے، قدم ملا کر آگے بڑھنا چاہیے اور زندگی کے بنانے اور سنوارنے میں اپنا حصہ بٹانا چاہیے۔ سب اپنی ذات کے خول میں سمٹ سکڑ کر محبوس ہو گئے ہیں۔ ہر ایک اپنے ہی سوگ میں مبتلا ہے، اپنا ماتم آپ کر رہا ہے ـــ کاش تم انھیں سمجھاتے اس بے یقینی کے اندھیرے میں روشن کرن بن کر راستہ دکھاتے کہ دیکھو جب تک ہم ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹتے ہیں سب کے ساتھ اپنے آپ کو ایک کر کے پہچانتے ہیں۔ جب دل کے دروازے ہر ایک کے لیے وا کر دیتے ہیں۔ کندھا جوڑ کر ساتھ چلتے ہیں۔ مسائل پر سر جوڑ کر سوچ بچار کر سکتے ہیں، زندگی کے مسائل سے آنکھیں نہیں چراتے۔ انھیں حل کرنے کا حوصلہ و عزم رکھتے ہیں۔ جب تک ہاں جب تک ـــ تنہائی زندگی میں داخل ہی نہیں ہو سکتی۔ غم ذات کی اصطلاح بے معنی نہ سہی ہلکی پھلکی اور قابل برداشت بن جاتی ہے۔ یہ سب تمھیں کرنا تھا اور تم کر سکتے تھے، مگر آج پہلی بار تم نے اپنے فرض سے غفلت کی ہے نہیں اپنے پیچھے اتنے سوگواروں کو چھوڑ کر تم سمجھا گئے کہ زمانے کو ساتھ لے کر چلنے والے کبھی تنہا نہیں ہوتے۔

ابھی تم سے جدائی کا صدمہ اتنا نیا ہے کہ ٹھیک طرح سے اس نقصان کا اندازہ ہی ہم نہیں کر پاتے جو تمہارے کھو جانے سے ہوا ہے۔ ابھی تو ٹھیک طرح سمجھ ہی میں نہیں آ رہا ہے کہ تم چلے گئے۔ تم تو سحر کا انتظار کر رہے تھے۔ تم تو نقیب سحر تھے پھر کیا ہوا کہ چ سو گئے ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے۔

عزیز قیسی

مخدوم

اس اندھیرے میں اک روپہلی لکیر
ایک آوازِ حق نبی کی طرح

مخدوم سے میں سینکڑوں بار ملا ہوں۔ یہ شمار ملاقاتیں ہوئی ہیں ان سے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۹ء تک مختصر مفصل رسمی غیر رسمی، اخلاص، شفقت سے بھرپور، محبت و موانست سے مملو۔ جن میں اختلاف بھی خلوص پر مبنی رہا اور اتفاق بھی۔ اپنے اور ان کے وطن حیدرآباد میں، دیارِ غیر میں۔ وطن سے دور مشاعروں میں محفلوں میں سیاسی غیر سیاسی، ادبی غیر ادبی نشستوں میں سر راہے، سرِ میکدہ دن میں رات میں دھوپ میں چاندنی میں لیکن یہ سب ملاقاتیں ایک اولین ملاقات کا اہتمام تھیں تکملہ تھیں اس ایک ملاقات اول و آخر کا جو میرے نیم بیدار شعور کی ہوئی تھی ان کے نام اور پیغام سے اس ملاقات کی تاریخ ہے نہ جغرافیہ۔ اس ملاقات کی کوئی تحدید ہے نہ تعین۔ یہ ملاقات کب ہوئی کہاں ہوئی مجھے نہیں معلوم یا میں یہ بتا نہیں سکتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ یہ ملاقات ہوئی اور ایسی امٹ اور پائیدار ہوئی کہ مخدوم کی موت اس ملاقات کی حد ہے نہ میری موت۔

ملاقات تو ایک دیدہ و موقوعہ عمل ہے۔ دو اشخاص کے ملنے، ایک دوسرے سے متعارف ہونے اور گفتگو کرنے ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے سمجھنے اور سمجھانے کا نام ہے۔ میرے لیے مخدوم کوئی شخص نہیں تھے وہ تو ایک احساس تھے ایک ایمان تھے اور احساس اور ایمان کو آدمی تاریخ مقام اور لمحے کی قید میں محصور نہیں کر سکتا۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے زندگی کو اس کے گرد و پیش کو، زشت و خوب کو، خشک و تر کو جاننے پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت ایک آواز میرا پیچھا کر رہی تھی۔ اس کی گونج چاروں طرف۔ اور اسی گونج اور اسی آواز کا نام مخدوم ہے۔ اور میں عزیز قیسی نہیں ایک پوری نسل ہوں جس نے پولیس ایکشن کے ہنگامی زمانے میں ہوش سنبھالا ہے۔

مخدوم ان دنوں روپوش تھے۔ حیدرآباد میں انجمن اتحاد المسلمین کی ستیانہ زور زور سے چلا رہی تھی

ریں اور اس شور پر چھائی ہوئی ایک رسیلی آواز گونج رہی تھی۔

ادھر آ لے مرے ناداں تماشائی ادھر آجا

کا نغمہ تھی نہ شکست کا" وہ تو ایک دل نشین آواز تھی، وقت کی، عصر کی اور روح عصر کی۔

روم ان دنوں حقیقت سے زیادہ موجود اور افسانے سے زیادہ محسوس طریقے پر حیدرآباد کی شہ رگ کے نظام کی جاگیردارانہ حکومت اُن کی جان کے درپے تھی۔ اس کے بعد جب کانگریس کی سرکار نے تلنگانہ کی مسلح ماکاروں اور نظام کی فوج اور پولیس کے بس کے باہر سمجھا تو حیدرآباد کی پُرشور ریاست پر قبضہ کرلیا۔ حکمراں باقی رہا، صیاد بدل گئے مگر صید مطلوب وہی رہا ۔۔ مخدوم۔

...ء سے ۵۱ء تک حیدرآباد میں کیا کیا ہوا۔ اس کا احاطہ کسی مورخ سے ممکن ہے نہ کسی واقعہ نگار سے ...کی تحریروں اور ادبی تخلیقات میں حیدرآباد کی ضمیر کی آواز کا ارتعاش محفوظ ہے۔ انھیں آوازوں میں سینکڑوں ساتھ میری آواز بھی شامل ہے اور میری آواز ۔۔ اسی گونج کی گونج ہے۔ جسے میں مخدوم کہہ رہا ہوں۔

...وقت میرے لیے نادیدہ مخدوم ۔۔ جو کہیں چھپے ہوئے تھے ۔۔۔ حیدرآباد کے ہر غمزدہ اور جہد آمادہ دل میں ...اروں لاکھوں دلوں میں، ٹوٹے پھوٹے کھپریل کے تنگ و تاریک مکانوں میں جو بیڑوں گلیوں سڑکوں میں مخدوم لاموجود اور آواز کی طرح لامشہود ہوتے ہوئے بھی سانس کی طرح موجود اور خواب کی طرح مشہود تھے۔ ...کے اشعار دلوں کی خلوت گاہوں میں شمع کی طرح چپ چاپ پگھلتے تھے:

تو نے کس دل کو دکھایا ہے تجھے کیا معلوم
کس صنم خانے کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

...ار محبوب میں جلتے دلوں کی آواز تھے:

مرے محبوب مری نیند اڑانے والے
مرے مسجود مری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

...ہک کر اپنی طرف بلاتے تھے:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اور کبھی ڈھارس بندھاتے کہ: رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

اور کبھی غیظ و غضب میں للکارتے تھے:

بجلیو آؤ، گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنّم کی ہواؤ آؤ
زلزلو آؤ گرجتے ہوئے لاوا آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

"تلنگانہ کی مسلح بغاوت سے "کرّۂ ناپاک" کے غاصب لرزہ براندام تھے، مخدوم کا ذکر سرگوشیوں میں، خفیہ ملاقاتوں میں یہاں وہاں ہر روز آیا کرتا تھا۔ کبھی ان کے انقلابی جوش کا ذکر آتا، کبھی ان کی شاعرانہ بے نیازی کا کبھی ان کی بذلہ سنجی کے تذکرے ہوتے، کبھی ان کی ذہانت کے چرچے ہوتے، کوئی سناتا کہ سٹی کالج میں وہ اپنے شاگردوں کی فرمائش پر کلاس روم کے دروازے بند کر کے نظمیں سناتے تھے لہک لہک کر۔ کوئی جمال الدین پر ڈھالے ہوئے لطیفے سناتا۔ کوئی ان کے ہاسٹل کے زمانے کی شرارتیں سناتا، کوئی ان کے احباب میں سے اور اشفاق سے ان کی نوک جھونک کے واقعات سناتا۔ اور "سرخ سویرا" (جو ان دنوں ممنوع کتاب تھی) کے ایک ایک شعر کی شانِ نزول لوگوں کو یاد تھی۔ اور "سرخ سویرا" کی نظمیں کبھی جوش میں کبھی مستی میں کبھی تنہا اور کبھی مل جل کر سنائی جاتیں۔ اور پھر بات وہاں تک پہنچی کہ کس طرح انھوں نے قلم چھوڑ کر تلوار اٹھالی۔ کس طرح انھوں نے نظام کی سلور جوبلی کے موقع پر کہا:

ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں مری چشمِ گنہ گار نے یہ بھی دیکھا
خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میّت کا دھواں

اور پھر کس طرح "یہ شہر کا محبوب" شاہ کا معتوب بنا۔ اور پھر کس طرح اس نے کہا کہ:

پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربت کاری
حضورِ آصفِ سابع پہ ہے غشی طاری
بلا رہا ہے بہ سمتِ دگر تلنگانہ

اور پھر کوئی بے حد رازداری اور وثوق سے سناتا کہ اب وہ کہاں ہیں۔ تلنگانہ میں کس "دلم" کے ساتھ ہیں۔ کہاں مسلح جدوجہد کی کمان کر رہے ہیں اور حیدرآباد کی خفیہ پولیس کو انھوں نے کیسے اپنی حاضر دماغی اور ذہانت سے چکمہ دیا

لوگ کہتے وہ بھیس بدل بدل کر لوگوں سے ملتے ہیں۔ ان باتوں میں کتنی حقیقت ہے یہ میں نہیں جانتا لیکن یہ سچ ہے کہ مخدوم ان دنوں ہم سے بھیس بدل بدل کر ملتے تھے کہیں کسی مجبور کے آنسو کے روپ میں، کہیں کسی غمزدہ کی آہ کے روپ میں اور کہیں کسی حق دار کے نعرے کے روپ میں

پھر سنہ ۵۱ء کے آخر میں مخدوم کی نظم "قید" جیل سے اسمگل ہو کر آئی جس کے آخری مصرعے یہ ہیں:

مجھے غم ہے کہ میرا گنج گراں مایۂ عمر

نذرِ زنداں ہوا

نذرِ آزادیِ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

تو سب تڑپ اٹھے۔ تڑپنے والے لاکھوں لوگوں کے نعروں سے جیل کی دیواریں لرز گئیں اور دروازے کھل گئے۔ مخدوم رہا ہوئے۔ لاکھوں بے قرار دیوانے انھیں دیکھنے سڑکوں پہ نکل آئے۔ حیدرآباد نے انسانوں کا اتنا عظیم اور پرجوش مجمع کبھی نہیں دیکھا۔

حیدرآباد کی اس کے بعد سیاسی اور مجلسی زندگی کا ایک ہی نام تھا مخدوم، جانِ محفل مخدوم۔ جانِ جمعیت مخدوم، جانِ انقلاب مخدوم — وہ کامریڈ مخدوم تھے، مخدوم بھائی تھے، مخدوم چچا تھے، مخدوم بابا تھے۔ ان کے نام سے چہروں کے پھول کھل اٹھتے تھے، دلوں میں نسیم چلنے لگتی تھی۔ لوگوں نے ان کے نام سے کرامتیں مشہور کر رکھی تھیں ان کو دیکھنا سعادت ان سے ہاتھ ملانا خوش نصیبی اور ان سے بات کرنا حصول مقصود تھا۔ یوں نہیں ہے کہ مخدوم کے اطراف کوئی روشنی کا ہالہ تھا یا وہ بارعب شخصیت تھے یا شعلہ بیاں مقرر تھے۔ یہ سب ہوتا تو شاید وہ محبوب نہ ہوتے۔ انھیں عزت ملتی، احترام ملتا۔ محبت نہ ملتی۔ وہ تو درمیانہ قد کے سانولے سے عام آدمی تھے ہمیشہ مسکراتے ہوئے۔ شاید یہی سادگی ان کی محبوبیت کا راز تھی یہی مسکراہٹ ان کی روح کا پرتو تھی جس سے سب کو پیار تھا اور جو سب کو پیار کرتی تھی۔

سنہ ۵۱ء سے سنہ ۶۹ء تک میں نے انھیں — ان کے شخصی وجود کو دیکھا — ۵۶ء تک (جب تک میں حیدرآباد میں تھا) تو قریب قریب روزانہ سے ملتا رہا اور بمبئی آنے کے بعد جب جب وہ بمبئی آئے میں نے انھیں دیکھا ان سے ملا ہوں۔ ان سے باتیں کی ہیں۔ بڑی بڑی باتیں چھوٹی چھوٹی باتیں، اسکول کی باتوں سے لے کر اعظم جاہی مارکٹ تک کی باتیں انقلاب کی باتوں سے لے کر پتلی دال اور قیمے تک کی باتیں۔ ہر بار ان سے مل کر یہی احساس ہوا کہ جس ملاقات کا مری روح سے تعلق ہے، میرے شعور اور راز کے تعلق ہے وہ ملاقات اور پکی اور گہری اور پائیدار ہوتی جا رہی ہے۔ یوں ان سے کئی بار ناچاقیاں بھی ہوئیں۔ میں گستاخی کی حد تک ان سے الجھ جاتا تھا مجھے وہ بدتمیز نمبر ایک اور وحید اختر کو بدتمیز نمبر دو کہا کرتے تھے۔ جھگڑوں کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہوتی تھی میں نے اپنے لڑکے کا نام فرقان رکھا۔ مخدوم برہم ہوئے کہ تم لوگ اب تک متعصب اور مقدس ہو۔ ہندوستانی نام کیوں نہیں رکھتے اور میں نے کہا کہ آپ نے اپنے لڑکے کا نام نصرت کیوں رکھا ہے گلاب محمد یا پھول حسین کیوں نہیں رکھا۔

ایک رات تو عجیب واقعہ ہوا کرنل حمایت بیگ کے گھر میں۔ جہاں ان دنوں اکثر حمایت بیگ کی میزبانی کی برکتیں لٹتی تھیں سلیمان اریب، میں اور مخدوم ان محفلوں میں ــــ بہ پابندی اور بہ الاختصاص بلائے جاتے تھے۔

اس رات اس قدر گرما گرمی ہوئی کہ مخدوم کے لیے میری گستاخی ناقابل برداشت ہوگئی۔ وہ شاید ہاتھ بھی اٹھا دیتے۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا۔ اشتعال کے وہ لمحے گزر گئے تو میں رات بھر نہیں سو سکا۔ سوچتا رہا مخدوم نے کیا سوچا ہوگا ان سے اب سامنا ہوگا تو میں آنکھ کیسے ملا سکوں گا ــــ وہ یقیناً مجھ سے کبھی بات نہیں کریں گے۔ اگلے دن مخدوم اور رٹز ہوٹل کے گیٹ پر نظر آئے۔ میں ان سے نظریں چرا رہا تھا۔ نظریں ملیں تو مسکرائے۔ "کیوں جناب۔ رات کیا واقعہ ہوگیا؟" ــــ انھوں نے کہا۔ میں شرمندگی سے کچھ بول نہیں سکا۔ اور مخدوم نے مسکرا کر کہا "چلیے آپ کو نئی غزل سناتے ہیں۔"

یقین کیجیے جس دن سے ان کی موت کی خبر سنی ہے میں یہ تو نہیں کہتا کہ میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے۔ لیکن یہ ضرور ہوا ہے کہ دن یا رات کے کسی حصے میں اچانک وہ سامنے آ جاتے ہیں مسکراتے ہوئے۔ پھر مجھے خیال آتا ہے وہ تو مر چکے ہیں۔ لیکن کہیں دل کے کسی گوشے میں ایک ہلکا سا خیال ابھرتا ہے کہ آج کل، پرسوں، کسی دن، کسی جگہ وہ سچ مچ مل جائیں گے۔ میں ان سے یہ سمجھ کر نظریں چراؤں گا کہ ۲۵ اگست کی رات کو ایسا واقعہ ہو چکا ہے کہ اب وہ مجھ سے زندگی بھر بات نہیں کرسکتے اور وہ مسکرا کر کہیں گے:

"کیوں جناب۔ یہ ۲۵ اگست کی رات کو کیا واقعہ ہوگیا؟ ــــ چلیے آپ کو نئی غزل سناتے ہیں۔"

ویسے سچ پوچھیے تو مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ وہ مر چکے ہیں۔ اگر یقین ہوتا تو میں ان تمام جھگڑوں پر شرمندہ ہوتا ان تمام یادوں سے غمزدہ رہتا جو ان کے نام سے وابستہ ہیں۔ مخدوم میرے لیے اور صرف میرے لیے کیا ان سیکڑوں لاکھوں کے لیے جو ۲۶ اگست کو ایرپورٹ گئے تھے ان کے جنازے کے ساتھ تھے ان کا آخری دیدار کرنے گئے تھے۔ ان کو زیر خاک سلا کر آئے تھے ــــ جسمانی وجود تھے ہی نہیں۔

میں نے تو آخری دیدار بھی نہیں کیا۔ اور لاکھوں کروڑوں انسانوں نے ان کا آخری دیدار نہیں کیا ہے۔ آخری ایک طرف، ہوسکتا ہے کہ ان کا کبھی دیدار ہی نہ کیا ہو ــــ مگر دیدار تو شخصی وجود کا ہوتا ہے۔ پیار کے احساس اور محبت کے ایمان کا دیدار کون کرسکتا ہے۔ اسے تو سب محسوس کرتے ہیں۔ اور اس احساس کا نام دیدار ہے تو آپ بھی وہ دیدار کر رہے ہیں اور میں بھی۔

ہر روز دنیا کی آلائشوں اور روزگار کی ہزار مصروفیتوں کے باوجود اندر اندر دل کے نہاں خانوں میں یہ دیدار ہو رہا ہے۔ میں بھی مر جاؤں گا وہ لاکھوں آدمی بھی مر جائیں گے جنھوں نے مخدوم کو شخصی طور پر دیکھا ہے لیکن دلوں کے نہاں خانوں میں رہنے والے مخدوم کو ہم اپنے آنے والوں کے دل لے کر جائیں گے ایک مقدس امانت کی طرح اپنے میٹھے پیار کے سوغات کی طرح۔

مخدوم کو میں نے سرِ راہ کھڑے ہوئے دیکھا ہے۔ کسی دیدۂ انتظار کی طرح بیدار اور کسی عاشق کی

طرح نغمہ بہ لب کہ : اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہگزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

مخدوم سے کون کہے کہ وہ "جانِ نغمہ" ابھی تک نہیں آیا. ہجومِ شوق ابھی تک سرِ رہگزار کھڑا ہے. زمیں اب تک اس محبوب کے لیے بے قرار ہے. مگر تم کیوں چلے گئے. کم سے کم اس کے آنے تک تو انتظار کر لیتے. جس کے لیے ۶۳ برس تک تم موم کی طرح پگھلتے رہے اچانک کیوں بجھ گئے سحر سے پہلے. اب تمھارے لیے جہاں سوگوار ہے اور تصویرِ ماتم بنا کھڑا ہے ــ لیکن دیکھیے مخدوم تو اس جانِ نغمہ کے لیے. اسی طرح کھڑے ہیں اس راہ پر جس کا ایک کنارہ ازل ہے اور دوسرا کنارا ابد ــــ

بھارت چند کھنہ

مخدوم محی الدین

ویسے تو ایسا کون شخص ہوگا جس نے حیدرآباد میں رہتے ہوئے مخدوم کا نام نہ سنا ہو۔ قانون ساز کونسل کے رکن یا ایک نہایت باوقار ٹریڈ یونین لیڈر کی حیثیت سے بہت سے ایسے لوگ بھی ان کے نام سے واقف ہیں جو اردو سے واقف نہیں۔ لیکن نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے ہر حصہ میں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے لوگ مخدوم کو ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ میرے خیال میں اگر یہ کہا جائے کہ مخدوم نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے ہر اس خطے میں جہاں اردو سے دلچسپی لی جاتی ہے جانے پہچانے مستند شعر گو سمجھے جاتے تھے اور سمجھے جاتے رہیں گے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

ان کی شاعری کے معیار یا شاعروں کی دنیا میں ان کے مقام کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھ سکتا کہ اس بارے میں تبصرہ کر سکوں۔ ظاہر ہے کہ ان کی شاعری کے فن کے متعلق کئی مضمون لکھے جا چکے ہیں اور بہت سے لکھے جائیں گے۔ میں اس ضمن میں محض اتنا کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ مخدوم ہر دل عزیز شاعر تھے اور ان کی جن غزلوں، گیتوں یا ترانوں میں خلائم شدت سے شریک نہیں تھے ان کو میرے جیسے نا اہل بھی سن کر اور سمجھ کر لطف اٹھاتے ہوئے گنگنانے لگتے تھے۔

مخدوم جامعہ عثمانیہ کے ان ڈگری یافتہ حضرات میں سے تھے جنھوں نے جامعہ کے نام کو چار چاند لگائے۔ میں بھی عثمانیہ کا ایک طالب علم رہ چکا ہوں مگر مخدوم مجھ سے سینیر تھے لیکن ایک زمانہ ایسا آیا جب ہم دونوں بیک وقت سٹی کالج حیدرآباد میں مدرس کے فرائض انجام دینے پر مامور تھے۔ میں سٹی کالج میں صرف چھ ماہ تک طلبا کو علم کی روشنی سے منور کرنے کی کوشش کرتا رہا اور خود دوپہر کے کھانے کے وقت مخدوم صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہوتا رہا۔ یہ غالباً وہ زمانہ تھا جب ان کو درس دینے اور الفاظ کو اشعار میں ڈھالنے کے علاوہ اور کوئی مصروفیات نہیں تھیں۔

دن کے کھانے پر غپ شپ رہتی۔ شاعری سے لے کر کھٹی دال اور خواجہ حسن نظامی کی ڈائری سے لے کر گھنگھریالے بال تک زیر بحث آتے۔ ان سینیر اساتذہ کا بھی جو طلبا کے رویے سے اثر اندوز ہو کر خود اکثر و بیشتر چھٹی منانے کی کیفیت میں

پہنچ جاتے اور جن کا کام ہم کو دیکھنا پڑتا تھا، ذکر ہوتا تھا اور نہایت نفیس اور شستہ الفاظ میں ان کی خوبیاں بیان اور اجاگر کی جاتی تھیں اور دل کی بھڑاس نکالی جاتی تھی۔

کھانے کے معاملے میں مخدوم مرچی کے بڑے دلدادہ تھے جس سالن کو کھا کر ہمارے کان سرخ اور آنکھیں اشک بار ہو جاتی تھیں اس کو مخدوم "برا نہیں" کہہ کر مزے لے لے کر کھاتے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ میں تو اب اس کیفیت میں پہنچ چکا ہوں کہ مجھے مرچی لگتی ہی نہیں۔ غالباً اگر بچھو زبان پر ڈنک لگائے تو ممکن ہے سی سی کر سکوں!

چھ ماہ کے بعد میں تو سٹی کالج سے رخصت ہوا مگر مخدوم غالباً مستقبل ملازم تھے اور بہت سال تک درس و تدریس سے طلبا کو فیضیاب کرتے رہے۔

آخری تین چار سالوں میں چند مرتبہ مجھے مخدوم صاحب سے بطور ٹریڈ یونین لیڈر سابقہ پڑا۔ صنعتی مزدوروں کے مسائل سلجھاتے وقت حکام متعلقہ کے ساتھ ان کا برتاؤ ہمیشہ نہایت باوقار اور اچھا ہوتا تھا۔ بحث کرتے وقت انھوں نے کبھی "رگ ہائے حجت و گردن قوی" کا مظاہرہ کیا۔ میرے ساتھ تو بہر حال ان کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ ہی رہے۔

آج مخدوم ہم سے بچھڑ چکے ہیں اور بچھڑے بھی اس طرح آناً فاناً مگر ان کی نظم "ذرہ موت" کے ان اشعار پر عمل پیرائی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ فرماتے ہیں:

اُس تباہی کی گزرگاہ سے چل
یہ کوئی رستہ ہے جس رستے میں
نہ کوئی پھول نہ پتا
نہ کوئی پیڑ نہ پھل
اک ہیولائے سیاہ
حدِ نظر
جس طرف دیکھو کھنڈر
موت کا ذرہ بڑی تیزی سے گزر"

مخدوم تو قیدِ حیات سے آزاد ہو گئے مگر اپنے پیچھے بے شمار اپنے چاہنے والوں کو چھوڑ گئے جو اُن کی جدائی میں آہیں بھر رہے ہیں۔ وقت ان چاہنے والوں کے زخم بھی مندمل کر دے گا۔ مگر چنبیلی کے منڈوے تلے بیٹھ کر ان الفاظ کو ترنم سے پیش کرنے والا انسان کبھی بھلایا جا سکتا ہے؟

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے

کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے"

اس سوال کا جواب حیدرآباد کے ایک اور سپوت نے ان الفاظ میں دیا ہے۔

"ایک شاعر نے موت سے یہ کہا
اے شکستِ زندگی دشمن
وقت کی فصل کاٹنے والی
ایک زندہ خیال کی دھن
گنگناتے ہوئے مسرت سے
ایسے الفاظ میں نے لکھے ہیں
جن کو تو بھی مٹا نہیں سکتی"

احسن علی مرزا

شہر میں سوگ ہے اک شعلہ نوا کا یارو

مخدوم کے سانحۂ ارتحال سے جہاں ہماری بساطِ سیاست و ادب کا ایک مہرہ اٹھ گیا
ہے وہیں ہمہ گیر بے چینی کے اس دور کے صاحبانِ فکر و نظر کی داخلی تنہائی بھی کچھ اتنی درہم برہم ہوئی ہے کہ کسی خاص موضوع
پر غور و فکر کرتے ہوئے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ مخدوم کا مادّی وجود ہماری روایتی ٹرمنالوجی میں نہ تو
کسی تاجدارِ وقت کی نمائندگی کرتا تھا، نہ مخدوم کے دستِ تہی کے بارے میں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ضرورت مندوں اور
حاجت مندوں کی حاجت روائی اس کا شعار تھی . . . . . . مخدوم تو بس نام کا مخدوم تھا۔ نہ کبھی دولت نے اس کے
قدم چومے اور نہ کسی مرحلہ پر اقبال و خوش بختی نے اسے مسکرا کر آواز دی۔ موت ایک طبعی لوازمہ ہے۔ انسان بہرحال مرتا ہے
اور ایک دن آیا کہ اجل کے سرد ہاتھ مخدوم کے گلے تک بھی پہنچ گئے . . . . اور پھر "شورِ ماتم" — مخدوم کے بال بچے
بلک بلک کر رونے لگے۔ دوست احباب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ جانے پہچانے لوگوں نے اظہارِ افسوس کیا —
اور ہر مرنے والے کے لیے اس کے بال بچے، دوست احباب شناسا اپنی بساط کے مطابق رو پیٹ کر اپنا غم ہلکا کر ہی لیتے
ہیں لیکن جن لوگوں نے مخدوم کے آخری سفر کا منظر دیکھا ہے وہ محوِ حیرت ہیں کہ اس آدمی کے لیے اتنے سارے غم گسار کس
طرح جمع ہو گئے — نوجوان، بوڑھے، مرد، عورتیں — اپنے پرائے، ایسے بھی جو زندگی بھر مخدوم کے اندازِ فکر سے اختلاف
کرتے رہے، متشرع بزرگ، جٹا دھاری پنڈت، گلے میں صلیب لٹکائے فادر — بعضوں نے تو صرف مخدوم کا نام ہی سنا
تھا اور صورت دیکھی تو رو دیے پڑا! لڑکیاں سوگوار، لڑکے گم سم، بوڑھے دم بخود . . . . جھریاں پڑے ہاتھ سے آنسو
پونچھتے ہوئے ایک بڑے میاں نے کہا: کاش مخدوم کے بجائے مجھے موت آ جاتی۔ ایک جاروب کش بڑھیا غسلِ میّت کے
دوران بین کرنے لگی — اچھے لوگ ہی تو جلدی اٹھ جاتے ہیں۔ نمائش میدان میں ایک بزرگوار ملے، میں ان
سے واقف ہوں، پانچ وقت کی نماز کے عادی، دو مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔ ایک دو دفعہ بڑے
غیظ و غضب میں مخدوم کے مصرعہ "قد آشنو یا ہوا ہے جل رہی ہے شمعِ شیطانی" کے متعلق کف در دہان اپنی ناراضگی
اور برہمی کا اظہار بھی کیا تھا۔ یہ حضرت بھی نمائش میدان میں مخدوم کے آخری دیدار کے لیے کیو میں کھڑے ہیں آنسو

گالوں سے بہہ بہہ کر ململ کے ڈھیلے ڈھالے کرتے میں جذب ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک کانگریسی رہنما شے مخدوم کی ڈھٹائی اور صاف گوئی کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ہندی کے ایک کوی سر جھکائے منہ لٹکائے چپ چاپ سے کھڑے ہیں۔ ایک صاحب بخار میں مبتلا، آنکھیں سرخ، چہرہ تمتمایا ہوا ـــ بھیڑ بھاڑ سے الگ تھلگ ایک دیوار کے سہارے دم لے رہے ہیں . . . استفسار پر بتایا کہ صرف مخدوم کی نماز جنازہ میں شریک ہو کر اس کے لیے دعائے مغفرت کرنا چاہتے ہیں۔

ہم لوگوں کے لیے تو مخدوم سب کچھ تھا ـــ بزرگ، دوست، رہنما ـــ ہم میں سے کتنوں نے اس کے کندھے سے کندھا ملا کر رجعت و قدامت کے مورچوں پر یلغار کی، کتنوں نے فرق مبارک پر ضرب کاری لگائی ـــ نئی سحر کو آوازہ دے دے کر بلایا۔ انقلاب کے استقبال کے لیے کوچہ و بازار میں قطاریں باندھے کھڑے رہے . . . . . محبس کی اونچی دیواروں سے دور عوام کے رواں دواں قافلے کے قدموں کی چاپ سنی، اور کچھ تو ایسے بھی ہیں جنھوں نے جولیس فوچک کی طرح انصاف و سماجی مساوات کے مطالبہ کی پاداش میں پھانسیوں کی سزا پائی۔ ہماری نظروں میں مخدوم صرف ایک آدمی نہیں ایک نظریہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی مفارقت نے عارضی طور پر ہی سہی ہمارے نصب العین کو نظروں سے اوجھل کر دیا ہے، آنسوؤں کی نمی منزل کو دھندلانے کا سبب بن گئی ہے۔ ہمارا غم تو فطری ہے، الجھن حق بجانب لیکن ایک لمحہ کے لیے سوچیے تو سہی کہ اتنے سارے مختلف الخیال لوگوں کے لیے مخدوم کی مرگ مفاجات غم و اندوہ کا مشترک محرک کیوں بن گئی ہے؟

ذاتی طور پر میں اس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جو مخدوم کو دور ہی سے دیکھ کر خوش ہوتی رہی اور شعور کی ناپختہ کاری کے عالم ہی میں ان کا اتنا گہرا اثر قبول کیا کہ ہماری اندھی تقلید پر خود مخدوم برآفروختہ اور برہم ہو جاتے تھے۔ مخدوم نے بال بڑھا لیے تو ہم نے بھی بال ترشوانا چھوڑ دیا، اور مخدوم کے جذبۂ احترام کی بنا پر گھروں سے نکال دیے گئے۔ پارٹی آفس میں مخدوم کے انتقال کی خبر سننے کے فوراً بعد زندگی کے اس دور کی کہانی کے اوراق ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں ابھرنے لگے۔ مخدوم کے ذہن و فکر اور شعور کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے خد و خال سے واقفیت ضروری ہے جس میں مخدوم نے فرزند آذر کی طرح، دین بزرگاں خوش نہ کردی روایت پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔

۳۰، ۴۰ برس کے اس حیدرآباد میں جاگیردارانہ سماج کی سانس ضرور اکھڑنے لگی تھی۔ تاہم اس کی بعض اچھی روایات کی پاسداری، سفید پوشی لیکن قرض دار گھرانوں کا وطیرہ بنی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ والد بزرگوار نے مجھے ایک پان والے کی دکان پر کھڑا دیکھا . . . . . اور گھر آنے پر بڑی خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے والدہ محترمہ سے کہا "آپ کے برخوردار پان کھانے لگے ہیں۔ میرے ساتھ انھیں بھی پان لگا کر دیا کرو"۔ یونیورسٹی میں پہنچ جانے کے بعد بھی میری مجال نہ تھی کہ میں والد بزرگوار کی کسی بات کو خواہ وہ کتنی ہی ناجائز اور ناروا ہی کیوں نہ ہو سنی ان سنی کر دوں۔ تمام بچوں کے لیے ضروری تھا کہ رات کے آٹھ بجنے سے پہلے گھر پر موجود رہیں کسی دن پندرہ بیس منٹ کی دیر ہو گئی تو گھنٹوں دروازہ پر کھڑے ہوئے ان کے قریب آنے کا انتظار کرنا پڑتا تاکہ دھیمی آواز میں ان سے دروازہ کھولنے کی درخواست کی جائے۔ جوانی

ان تحدیدات کے خلاف احتجاج کرتی لیکن زبان پر لگی ہوئی روایات کی مہر لب کشائی کی اجازت نہ دیتی۔

متوسط درجہ کے کم و بیش سبھی گھرانوں کا یہی عالم تھا۔ گھٹن، بے بسی اور لاچارگی —— غم دوراں تو صبر آزما نہیں ہنس بنا تھا لیکن دوسرے لمحے ہی غم جاں گسل ہوتے جارہے تھے۔ بنت عم کی چاہت، محبت کی آزادی کی خواہش طلب جی چاہتا کہ یہ لیل و نہار بدل کر رکھ دیں۔ مجاز کی طرح آسمان سے چاند تارے نوچ لینے کی بے نام سی خواہش دل و دماغ کے کسی گوشے میں جاگتی . . . . . یہ وہ دور تھا جب کہ بہادر یار جنگ نے انا الملک —— کا نعرہ دے کر دکن ٹین فیکٹری میں روزانہ دو آنے کی اجرت پر کام کرنے والے آٹھ دس سال کے بچوں کے سرپرستوں کے سر میں حیدرآباد کے تاجدار ہونے کا خبط پیدا کر دیا تھا۔ بہادر یار جنگ کی شخصیت اس وقت کے کتنے ہی لوگوں کا مرکز نظر بنی ہوئی تھی . . . . . اور دوسری طرف چنچل گوڑہ کی دسویں کلاس میں نورالحسن صاحب جو لندن سے ڈپ ایڈ کر کے واپس ہوئے تھے، اولیور گولڈ اسمتھ کی ویکار آف ویکفیلڈ کا ابریجڈ اڈیشن پڑھاتے ہوئے ہمیں نئے معانی کی باتیں بتاتے۔ جواہر لال کا ذکر چھیڑ دیتے —— لندن کی درسگاہوں میں ہندوستان کے انقلابی نوجوانوں کی سرگرمیوں کا حال سناتے —— پردہ کے خلاف لکچر پر لکچر جھاڑتے! اور دبی زبان سے بہادر یار جنگ کے احیائے دین کے نام نہاد فلسفہ کی مخالفت کرتے . . . . . نورالحسن صاحب نے اپنے شاگردوں کی نہ جانے کتنی نسلوں کو ایک نیا انداز فکر عطا کیا ہے۔ میں، عالم اور کامریڈ ابراہیم مرحوم ان سے بے حد متاثر تھے عالم مرنجاں مرنج محنتی طالب علم اور ہم دونوں جہانیانِ جہاں گرد —— ! جوں توں کر کے میٹرک کا امتحان رائل کلاس میں کامیاب کیا، اور جامعہ عثمانیہ میں قدم رکھا . . . . . ناپختہ ذہن کو پروفیسر صلاح الدین، خلیفہ عبدالحکیم اور معتمد ولی الرحمٰن نے صیقل کر دیا۔ دوسری طرف نیاز فتح پوری کا نگار توہمات کے بندھن توڑتا رہا . . . . . برسوں سے دماغ میں ابلنے والے لاوہ نے جامعہ عثمانیہ کی کھلی فضا میں اپنی روانی کا راستہ ڈھونڈ نکالا۔ اور عالم کے چھوٹے سے دیوان خانے میں بچھے پھٹے صوفوں پر بیٹھ کر ہم تینوں نے کامریڈز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھ دی۔ اور اسی ادارہ کے ارتقا کی پہلی منزل ہی پر مخدوم سے سرراہے ملے۔ مخدوم اس وقت تک جامعہ عثمانیہ چھوڑ چکے تھے۔ لیکن جامعہ کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر ان کی ہمہ جہتی شخصیت کی گرفت بہت مضبوط تھی —— وہ ایک شاعر، ایک باغی —— اور ایک مکتب خیال کی صورت اختیار کر گئے —— دوسری طرف قاضی صاحب کے "پیام" کے سرپرست مدیر سبط حسن "سرود خانہ ہمسایہ حسن رہ گزرے" کی لطافت سے لطف اندوز ہونے کے گر بتاتے ہوئے مجھے [illegible] کی تحریک کے رموز و نکات سے آشنا کر رہے تھے۔ اب ہمارے لیے پریم چند کی "میدان عمل" ہماری رومانی انقلاب پسندی کی تسکین کا سامان مہیا کرنے لگی تھی۔ سبط نے تھوڑے سے توقف کے ساتھ جواہر لال کی "میری کہانی" بھی ہمارے ہاتھوں میں تھما دی۔ مخدوم کو اسی دوران جامعہ عثمانیہ کے اس پہلے کل ہند مشاعرہ میں انتظار سناتے دیکھا —— اور اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ گرمی کی کڑی دوپہر کے سناٹے میں خشک پتوں کا کھڑکھڑانا بھی ہمارے لیے فردوس گوش بن گیا۔ مخدوم بالمشافہ ملاقات سے کہیں پہلے ہی ہمارے آئیڈیل بن گئے تھے اور اس سے ملنے سے قبل ہی ہماری رومانی انقلاب پسندی نے ہمیں ہر سال دیویک وردھنی ہائی اسکول کے احاطے میں منعقد

ہونے والے اسٹیٹ کانگریس کے اس جلسہ کے اسٹیج پر پہنچا دیا تھا جس کی صدارت بالعموم بڑی مونچھوں والے بارعب سراج الحسن ترمذی فرمایا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک جلسہ میں راج بھی ہماری پنڈال چوکڑی میں شامل ہوگیا۔

مخدوم سے پہلی ملاقات بڑی مایوس کن ثابت ہوئی۔ بڑے ہی خلوص سے ہم نے ان سے مودبانہ التماس کی کہ وہ کامریڈز ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ کی صدارت کریں اور جلسہ کے بعد اپنے کلام سے محظوظ فرمائیں۔ میں اور عالم نے مرتعش آواز میں انھیں اس ادارہ کی غرض و غایت بھی بتادی اور اس توقع کے ساتھ کہ وہ ہماری پیٹھ ٹھونکیں گے، یہ بھی بتایا کہ ہم بہادر یار جنگ کے مخالف ہیں سبطے کے شناسا ہیں — ان پر رعب گانٹھنے کے لیے یہ اضافہ بھی کر دیا کہ روزنامہ پیام میں ہمارے مضامین شائع ہوا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت تک جو مضامین ہمارے ناموں سے روزنامہ پیام میں شائع ہوا کرتے تھے وہ سبطے اور قاضی صاحب کی اصلاح کے بعد اتنے بدل جاتے تھے کہ ان میں سے اکثر الفاظ کا صحیح تلفظ کرنا بھی ہمارے لیے مشکل ہوتا۔ مخدوم کے انا کو شاید اس خود ستائی سے ٹھیس لگی — انھوں نے روکھے پن سے کہہ دیا۔ مجھے آپ کی انجمن سے کوئی دلچسپی ہے نہ سبطے سے کوئی تعلق! ہماری بجز اس التجا اور منت سماجت کے اس حسرتناک انجام نے ایک مدت تک ہمیں مخدوم سے برگشتہ رکھا۔ لیکن سبطے کی مہربانی سے وہ ایک دن ہماری بزم میں آئے۔ تقریر سے معذرت چاہی اور اپنی چند رومانی نظمیں سنائیں . . . . .

اب وہ چنچل گوڑہ کی ان مختصر محفلوں میں شریک ہونے لگے تھے یہی نہیں بلکہ انھوں نے کامریڈز ایسوسی ایشن کی سرپرستی بھی قبول کر لی تھی۔ مخدوم کے شعوری ارتقا کی ہر منزل پر میں ان کے ساتھ نہ رہ سکا۔ کامریڈز ایسوسی ایشن نے کمیونسٹ پارٹی کی شکل اختیار کرلی —— مخدوم نے سرکاری ملازمت کا جوا اتار پھینکا اور لکچرار سے ٹریڈ یونسٹ بن گئے۔ کامریڈز ایسوسی ایشن کا بانی اور پہلا صدر احسن علی مرزا جس نے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس کے گھر جنم لیا تھا جاد آزادی کے اس صبر آزما دور سے گھبرا گیا۔ لیکن اس اثنا میں اس نے ممنوعہ کمیونسٹ لٹریچر پڑھنا شروع کیا۔ داس کیپٹل، کرٹیک آف گوتھا پروگرام، انٹی ڈیہورنگ، ریلیجن —— اور اس زمانے کے اشتراکی ادیب پاری کے اردو تراجم۔ مارکسزم اب ایک واضح نظریہ کی صورت میں سطح ذہن پر ابھر آیا تھا۔ اسی دور میں دوسری بڑی جنگ شروع ہوئی اور اس سے کچھ پہلے ہی ترقی پسند ادیبوں کی تحریک مقبولیت حاصل کرنے لگی۔

مخدوم، مجاز، عالم، سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح، ساحر —— سبھی نئی سحر کے منتظر افلاس و غربت کے عذاب سے سارے ملک کو نجات دلانے کے آرزومند، پرانی دنیا کو ڈھا کر نئی دنیا اور نیا آدم بنانے کی باتیں —— حریر و اطلس میں ملبوس سرمایہ داری کے بدن پر ابھر آنے والے کوڑھ کے دھبوں کی نشاندہی کرکے تہذیب و ثقافت کی نام نہاد قدروں پر طنز کرتے —— مخدوم گلوئے زہرہ میں پیوست تیروں کا واسطہ دے کر انقلاب سے بڑے ہی لاگ لگاوٹ کے انداز میں کہتے — "گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے"

مجاز کو محل کی اوٹ سے نکلنے والا ماہتاب مُلّا کے عمامہ اور بنیے کے بہی کھاتہ کی یاد دلاتا۔ سردار جنگ آزادی کا

رجز سناتے کیفی، بغاوتوں اور باغیوں کی شان میں قصیدے لکھتا۔ ادھر حیدرآباد میں بھی ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ پیدا ہوگیا۔ جب جب کر بیٹھکیں ہونے لگیں۔ کبھی عابد علی خاں صاحب کے گھر میں تو کبھی اختر بھائی کے مکان پر۔ مخدوم ان محفلوں کی جان ہوتے۔ نظر، ابراہیم جلیس، زینت ساجدہ، حسینی شاہد اور ہمت سے۔ میں اکثر یہی سوچتا تھا کہ صاحبان فکر و نظر کے ان اجتماعات میں مخدوم سب سے دراز قد کیوں نظر آتے ہیں؟

مخدوم کے ذہنی ارتقا کے پس منظر اور اس کے اسباب و محرکات کے تجزیہ کے سلسلہ میں مجھے ماضی کے چند واقعات کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر میں شاید یہ نہیں بتا سکوں گا کہ مخدوم کی شخصیت کو ہشت پہلو بنانے میں کن عوامل و عناصر کا دخل رہا ہے۔ میں مخدوم کے ہم نشینوں میں ہوں نہ ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے کا دعویدار۔ سچ پوچھیے تو مجھے زندگی بھر ان سے برابر والے کی طرح بات چیت کرنے کی جسارت بھی نہ ہوسکی۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی کے بعض مرحلوں پر مجھے انھیں بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ مجھے مخدوم کو ان کی روپوشی کے دور میں اپنے گھر مہمان رکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان دنوں میری شادی ہوئے سال دو سال ہی کی مدت گزری تھی۔ گھر میں والدہ محترمہ، اپنی بیوی اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میری والدہ پرانی وضع کی تربیت پانے کے باوجود اپنے عہد کی روشن خیال خاتون تھیں۔ انھیں کمیونسٹ پارٹی سے میرے لگاؤ کا علم تھا۔ اور وہ اس کے امکانی عواقب و نتائج کے تصور سے پریشان رہا کرتیں۔ میرے والد بزرگوار کے انتقال کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے بڑے بھائی صاحب معاشی حیثیت سے آسودہ حال تھے۔ لیکن پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے انھیں اضلاع پر رہنا پڑتا تھا میرا گھرانہ معاشی افراتفری کا شکار ہوگیا تھا۔ میں نے سرکاری نوکری چھوڑ کر پیام سے وابستگی اختیار کرلی تھی۔ سو ڈیڑھ سو روپے اور بالاقساط مل جاتے۔ لے دے کے وہی زندگی کا آسرا تھا۔ مخدوم جن دنوں میرے گھر پناہ گزین تھے ان دنوں عالم یہ تھا کہ صبح میں جو کچھ روکھا سوکھا باسی تو اسی کھا نال جاتا۔ اسی پر میں والدہ اور میری بیوی قناعت کرلیتے، اور پھر رات کے ۸، ۹ بجے چولھے پر ہانڈی چڑھتی۔ . . . گھر کا کرایہ چار چار چھ چھ مہینے ادا نہ کیا جاتا۔ قرضداروں کے وارے نیارے۔ کامریڈز ایسوسی ایشن کے دور میں راج، عالم اور ابراہیم تو والدہ محترمہ سے ملتے رہتے تھے، اور ایسوسی ایشن کے پہلے سالانہ جلسہ میں راج بہادر نے میری والدہ کا ایک پیام بھی پڑھ کر سنایا تھا جس کا مطلب کچھ ایسا تھا کہ میں نے اپنے تین بچوں میں سے ایک کو غریبوں اور دردمندوں کی خدمت گزاری کے لیے وقف کردیا ہے اور کامریڈز ایسوسی ایشن کے لیے یہی میری دین ہے۔

مخدوم کا نام بھی ان کے کانوں تک پہنچ چکا تھا۔ بڑے بھائی کی زبان سے سن چکی تھیں کہ مخدوم کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے والے کے لیے پانچ ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔ مخدوم جب میرے گھر لائے گئے تو ان کا مزاج قدرے ناساز تھا۔ وہ غالباً ملیریا میں مبتلا تھے۔ میں نے والدہ محترمہ کو اپنے اس پراسرار مہمان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا صرف اتنا کہہ دیا کہ یہ میرے ایک بزرگ سی دوست ہیں اور کچھ دن ہمارے یہاں قیام کریں گے۔ والدہ محترمہ کی زیادہ ہمدردی

حاصل کرنے کے لیے میں نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ ان دنوں بخار میں مبتلا ہیں۔ مخدوم شام میرے گھر لائے گئے۔ میں پیام کی نائٹ شفٹ انجام دے رہا تھا۔ رات کے دو بجے گھر آیا تو والدہ نے کہا "اچھے آدمی ہو! بے چارے کو بخار ہے اور اسے پوچھنے والا تک کوئی نہیں۔ تمھاری دولہن سے کہا بھی لیکن وہ حجاب کے مارے انجان بنی رہیں۔ ابھی ابھی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ توے کی طرح جل رہا ہے۔ . . ."

میں دبے پاؤں اس کمرہ میں آیا جہاں مخدوم سو رہے تھے۔ انھیں نیند لگ گئی تھی اس لیے جگانا مناسب نہ جانا۔

صبح ہوئی تو حسبِ معمول ۹ بجے میں اپنے کمرے سے نکلا۔ والدہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر دالان میں بیٹھی تھیں۔ انھوں نے قریب بلا کر تمھارے دوست تو رات کے ۴ بجے ہی باہر چلے گئے . . . . . میں جاگ گئی تھی۔ ناشتہ کے لیے مجبور کیا تو بھوک نہ ہونے کا عذر کر گئے ـــــــ عجیب لڑکا ہے۔ رات بھر بخار تھا لیکن سویرے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔ مجھے بتا دیتے تو پانی گرم کر دیتی۔

میں اس زمانہ میں پارٹی کی رکنیت سے محروم ہو گیا تھا۔ تلنگانہ تحریک کے تعلق سے مجھے کچھ اختلافات پیدا ہو گئے تھے لیکن مخدوم کی شخصیت میری پارٹی سے عدم وابستگی کے باوجود میرے لیے بے حد قابلِ احترام تھی۔ میں تو خوش تھا کہ صبح میں ان سے باتیں ہوں گی، لیکن وہ تو منہ اندھیرے ہی چل نکلے تھے۔

دوسرے تیسرے دن بھی یہی ہوا۔ اور چوتھے دن سے میری ماں جو سویرے اٹھنے کی عادی تھیں۔ رات کو جوکی نا ہونا اسے گرم کر کے کمرے میں رکھ آتیں ـــــ ازدواجی زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں مجھے کسی دن بھی ۹ بجے سے پہلے بیدار ہونے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ میری بیوی بھی محوِ خواب رہتیں۔ چار چھ دنوں بعد ایک دن والدہ محترمہ نے بڑی رازداری کے انداز میں پوچھا "بیٹا! یہ تمھارا دوست مخدوم تو نہیں؟"

میں اچنبھے میں تھا کہ انھیں یہ شبہ کیونکر ہو رہا ہے۔ میری ماں کی آنکھوں میں ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ "مجھ سے چھپاتا کیوں ہے رے! تیری بیوی ہی سے معلوم ہوا کہ تیرے مہمان کا نام مخدوم ہے، اور وہ کوئی بڑا آدمی ہے۔" مجھے یاد آ گیا کہ ایک دن برسبیلِ تذکرہ میں نے بیگم سے کہہ دیا تھا کہ میرے مہمان دوست کا نام مخدوم ہے۔

ماں بولیں تو سمجھتا ہے میں مخدوم کو گرفتار کرا دوں گی . . . . . قرآن پہ ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں ایسا نہیں ہوگا لیکن تیرے بھائی سے ڈر لگتا ہے۔ وہ آتا جاتا رہتا ہے۔ پرسوں ہی پوچھ رہا تھا کہ "بی! دیوان خانے کے دروازہ پہ قفل کیوں لگا ہے۔" میں نے بات ٹال دی۔ لیکن وہ کھوج میں ہے۔ کون جانے پانچ ہزار روپے کی ہوس میں کچھ کر بیٹھے" میرا ماتھا ٹھنکا اور پھر میری اصرار پر مخدوم کا شلٹر بدل دیا گیا ـــــ دس پندرہ دن کی اس مختصر سی مدت میں صرف ایک دفعہ میری ملاقات مخدوم سے ہو سکی لیکن مخدوم میری ماں کے لیے بیٹا بن چکے تھے۔ ان کے کمرے کی کنجی ان کے آنچل سے بندھی رہتی۔ وہ ان کے کپڑے دھوتیں، ان کا بستر صاف کرتیں۔ کتابوں کو سلیقہ سے جما کر رکھ دیتیں۔ میری بیوی بھی ان کے سبھاؤ اور ان کے رہن سہن کے طریقے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں ـــــ ایک رات جب میں کافی دیر سے گھر میں داخل ہوا تو والدہ سے

رہی تھیں، بیوی محوِ خواب تھی لیکن باورچی خانہ میں چراغ جل رہا تھا جھانک کر دیکھا تو مخدوم صاحب چولہا پھونک رہے ہیں۔ میں نے کہا آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ بولے۔ برخوردار! ماں کو زکام ہو گیا ہے۔ کڑاکے کی ان سردیوں میں بھی وہ ٹھنڈے پانی سے وضو کرتی ہیں۔ آج شاید طبیعت بہت خراب ہے اس لیے وہ وقت پر بیدار نہ ہو سکیں میں ان کے اور اپنے لیے چائے بنا رہا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ پانی بھی گرم کر رہا ہوں تاکہ انھیں وضو کے لیے گرم پانی بھی مل جائے۔ تم جاکر کمرے میں سو رہو، ورنہ شور و غل سے ان کی نیند ٹوٹ جائے گی ——— خلوص سے دمکتی ہوئی آنکھوں والے اس مخدوم کی تصویر آج بھی میری نظروں میں سمائی ہوئی ہے۔ ایک ماں کے لیے اس عظیم انسان کے دل میں پیار کا جو سوتا پھوٹ نکلا تھا، کوئی مذہبی ایقان اس کا محرک نہیں تھا۔ سعادت و خدمت گزاری کے اسی جذبے کے تحت جو اندازِ فکر کارفرما تھا وہی دراصل مخدوم تھا۔ اور مخدوم کے جسدِ خاکی کو سپردِ خاک کرنے کے باوجود بھی یہ جذبہ زندہ ہے اور رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں مخدوم کے ذہن و فکر کے تجزیہ کے لیے جن حالات و واقعات کی مدد لے رہا ہوں وہ میری ذات اور میرے گھرانے سے متعلق ہیں۔ لیکن اس کا مقصد یہ بتانا نہیں کہ مجھے مخدوم سے بڑا قرب حاصل رہا ہے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو مخدوم کے بے تکلف دوستوں میں شمار نہیں کر سکتا۔ میں تو ایک لنگڑے کی طرح اس راستے پر گرتا پڑتا رواں دواں رہا ہوں جو مخدوم کے اندازِ فکر سے مطابقت رکھتا ہے لیکن آج جب کہ مخدوم ہم میں نہیں ہیں مجھے ماضی کے ان دنوں کی یاد آرہی ہے جن میں مخدوم میری نسل کے لیے ایک آئیڈیل اور ایک نصب العین کی طرح ابھرتے رہے۔

مارک سٹین کے الفاظ میں مارکسزم کے طبقاتی جدوجہد، پرولتاری ڈکٹیٹرشپ، سوشلسٹ انقلاب اور کمیونزم کے بنیادی اصولوں پر ایک نئے معاشرہ کی تشکیل کے اصولوں نے انقلابی انسان دوستی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ انقلابی انسان دوستی میں نہ تو استحصال کے لیے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے اور نہ ہی معاشرہ کے کسی فرد کو اس بات کی شکایت کا موقع مل سکتا ہے کہ اس کی ترقی کی راہ میں کوئی شے حائل ہو رہی ہے۔ مخدوم نے اسی انقلابی انسان دوستی کو اپنایا تھا اور اسی انقلابی انسان دوستی نے انھیں معاشرہ کی اعلیٰ اور اچھی قدروں کا علمبردار بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج مخدوم کے بدترین اعدا اور مخالفین بھی انھیں یاد کر کے "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" کا مصرعہ پڑھتے ہیں۔ میری آنکھوں نے مخدوم کو روپوشی کے اس دور میں بھی دیکھا ہے جب کہ نظام کی مطلق العنانی نے اس کے اپنے بچوں نصرت اور اساور کی زبانوں پر بھی مہر لگا دی تھی۔ اور یہ دونوں اپنے باپ کو باپ نہیں چچا کہا کرتے تھے۔ میں نے وہ دور بھی دیکھا جب کہ پہلے چناؤ کے موقع پر مخدوم روپوشی اور قید کی صبر آزما منزلیں طے کر کے عوام کے ایک محبوب کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے۔ آج تک بھی لوگ مخدوم کی رہائی کے بعد کے تاریخی اور یادگار جلوس کا ذکر بڑے ہی جوش و خروش سے کرتے ہیں۔ میں نے ایسے مشاعرے لوٹتے دیکھا، بزمِ یاراں میں قہقہے لگاتے سنا، عام جلسوں میں ہزاروں کے دماغ سے خطاب

سا نظارہ بھی کیا ہے۔ اسمبلی میں اسمبلی کے باہر، بازار میں گھر میں، پارٹی آفس میں ــــ مخدوم کی انقلابی انسانیت پسندی کی ڈور اس کی شخصیت کے تانے بانے سے ہمیشہ بندھی رہی۔ زینت ساجدہ نے جشنِ مخدوم میں اس کی سدابہار جوانی پر طنز کرتے ہوئے رومان پسند بچیوں اور خواتین کو متنبہ کیا تھا کہ ؎

اے حسن کے تاجدار آیا آیا
اے یارِ غم گسار آیا آیا

کے چکر میں نہ آجانا ــــ مخدوم خیر سے ساٹھے پاٹھے کی منہ بولتی تصویر بن گئے ہیں لیکن زینت نے غالباً فکر و نظر کی اس سدابہاریت کو بھلا دیا جس نے مخدوم اور بڑھاپے کو ایک دوسرے کی ضد بنا دیا تھا۔ مخدوم نے اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑا ہے۔ نہ اپنی رفیقۂ حیات کے لیے مکان نہ اپنے بچوں کے لیے کوئی متروکہ، لیکن اس نے ہمیں ایک جاودانی پیام کا ورثہ ضرور دیا ہے۔ "بساطِ رقص" کے ہر صفحہ پر یہی پیام درج ہے۔ خود مخدوم کے الفاظ میں:

"زماں و مکاں کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں (TIMELESS)
ہوتا ہے، اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے۔ سماج کے
بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی احساسات و جذبات بھی بدلتے جاتے
ہیں مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں۔"

مخدوم کا سرمایۂ شعری اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر آج ہر عہد کا CONTEMPORARY بنا دیتا ہے اس کی رومانی شاعری کا ابتدائی دور بھی "انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کے مسلسل عمل کی نمائندگی کرتا ہے۔" وہ شروع سے آخر تک ادب و شعر کو اپنے اس نظریہ سے ہم آہنگ رکھنے میں کامیاب رہا کہ "اگر انسان کو سماج سے الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک گونگا وحشی بن کر رہ جائے گا جو اپنی جبلتوں پر زندہ رہے گا۔" اس نے شاعری کو انفرادی اور اجتماعی تہذیبِ نفس کا ایک موثر ذریعہ بنایا اور اسی حربہ سے اس نے انسان کو وحشت سے نکال کر شرافت کی بلندیوں پر لے جانے کی کوشش کی۔ اس نے کمانِ ابروئے خوباں کے بانکپن کی بات بھی کی اور تمام رات غزل گا کر دیدار کرنے کی روایت کو بھی زندہ رکھا۔ لیکن ہر شام تمنا کے نشیمن سجانے کے ساتھ ساتھ ہر صبح مئے تلخیِ ایام بھی پیتا رہا۔ میں اپنے اس مضمون میں مخدوم کی ان نظموں پر بحث نہیں کروں گا جو انقلاب کے نام انتساب کی جاتی رہیں اور جن سے مارو کٹر دم کا ٹھکانا بن جانے والی پرانی دیواروں اور ڈیوڑھیوں کی بنیادیں لرز گئیں۔ میں صرف مخدوم کی غزلوں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ غزل اردو شاعری کی بڑی مطلوب لیکن مشکل صنف ہے۔ غزل کے لغوی معنی معشوق سے باتیں کرنے کے ہوتے ہیں اور فارم کے لحاظ سے اس کا دائرہ اتنا محدود ہے کہ اس میں تیز رفتار عصری تبدیلیوں کو سمونا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن غزل کی بندھی ٹکی تکنیک کی پابندی کرتے ہوئے بھی مخدوم نے اسے انقلابی انسانیت دوستی کا جامہ پہنایا۔

اس کی ہرغزل تہذیبی انقلاب کی ضرورت کا احساس پیدا کرتی ہے، اور اس کے بین السطور مخدوم کا یہ احساس ابھرتا ہے کہ جب تک عام آدمی کو استحصال سے نجات دلائی نہ جائے گی محبت کا موضوع بھی اس کے لیے سرچشمۂ حیات نہیں بنے گا سیماب وشی، تشنہ لبی، باخبری ہے

اس دشت میں گر رخت سفر ہے تو یہی ہے

اور اس زادِ راہ و رخت سفر کے باوجود وہ کاکلِ شب رنگ کے سایہ میں دم لینا اور اپنی خرد کو مہکاتا ہے ؎

وہ عطر تیری کاکلِ شب رنگ نے چھڑکا

مہکی ہے خرد، روح کلی بن کے کھلی ہے

"روح" کی اصطلاح کو مخدوم نے ان معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے جو عام طور پر لیے جاتے ہیں ـــــ نہ اس حسنِ لطیف کو روح کا نام دیتا ہے جو عوام کو ایک آسودہ آدمی زندگی سے استفادہ کے حق کی پیداوار ہوتی ہے چنانچہ وہ حریم ناز میں داخل ہونے کے لیے دار سے گزرنے کی شرط لگاتا ہے ؎

تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے

دار سے گزرے تری راہ گزر سے پہلے

مارکس نے ECONOMIC AND PHILSOPHIC MANUSCRIPTS میں کمیونزم کی اصطلاح کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"کمیونزم انفرادی ملکیت کی نفی کرتا ہے اور یہ بات انسانی زندگی کے عین مطابق ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس نے پہلی بار انسان میں اس کی تمام عظمتوں کے تحت اس کے وجود کا احساس پیدا کیا۔ اور اس احساس نے آلاجات اپنے وجود کو تسلیم کرانے سمت متحرک کر دیا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں آدمی بنا اور روحِ انسانیت کی نمائندگی کرنے لگا۔"

غالب نے بھی اپنے مخصوص انداز میں کم و بیش یہی بات کہی تھی ع

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مخدوم آدمی اور انسان کے اسی فرق و امتیاز کو خاتمہ کی راہ سمجھتا ہے اور اپنی شاعری کی زنبیل سے نسخۂ کیمیائے محبت پیش کرتا ہے۔ اس نے مایوس اور ہرمال نصیب انسانی آنکھوں کی زبان سمجھی اور پھر بڑے درد کرب سے کہنے لگا ؎

ساقی بھرتی میں آنکھیں کہانیاں کیا کیا

اب اور کیا کہیں کس کس کو سوگوار کریں

لیکن وہ خود مایوس نہیں ہوتا۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں والے حرماں نصیب قافلہ کو للکارتا ہے ؎

اٹھو کہ فرصت دیوانگی غنیمت ہے قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہم کنار کریں

اور پھر بڑے ہی پیار سے استحصال کے شکار انسان کے دل میں اس کی عظمت و اہمیت کا احساس جگاتا ہے سہ

ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسم ہیں ندیم
مسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے

انسان اور اس کی مسرتوں کو وہ سب سے بڑی قدر قرار دیتا ہے اور صدیوں سے ٹھکرائے ہوئے عوام کو ایک نئی شخصیت عطا کرتا ہے۔ وہ ہر اس کارخانہ کے گیت گاتا ہے جو اپنے سرمایہ دار مالک کی گرفت سے کامل یا جزوی آزادی حاصل کر چکا ہے۔ ہر اس گاؤں کو اپنا موضوعِ فکر بناتا ہے جہاں کی زرعی زمین بے زمین کسانوں اور کاشتکاروں میں تقسیم کی گئی ہے۔ ہر اس شعبۂ حیات کی تعریف کرتا ہے جسے انسان کے ذہن نے اپنی صلاحیتوں سے سنوارا اور سجایا تاکہ وہ اس جیسے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی کسی نہ کسی ضرورت کی تکمیل کر سکے۔ مختصر یہ کہ لینن کے الفاظ میں وہ "آدمی کو اس کے پورے قد میں دیکھنا چاہتا ہے۔ کارکرد، مسرور و شاداں اور فرحاں"

وا ہو رہی ہے میکدۂ نیم شب کی آنکھ
انگڑائی لے رہا ہے جہاں دیکھتے چلیں

میرے دل میں سرورِ صبحِ بہار
تیری آنکھوں میں رات پھولوں کی
پھول کھلتے رہیں گے دنیا میں
روز نکلے گی بات پھولوں کی

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی، زندگی رنگِ گل کا بیاں دوستو
گاہ روتی ہوئی گاہ ہنستی ہوئی میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو

کچھ پھول سے صحنِ چمن کھل تو رہے ہیں
اک نور سرِ طور نظر آ تو رہا ہے

ان اشعار کے پس پردہ مخدوم کا محبوب موضوع وہ انسان اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ فگن ہے جو استحصال، عدم مساوات اور ناانصافیوں سے ستیزہ کار ہے جو لڑائیوں سے متنفر ہے جو دیر و حرم کے جھگڑوں سے بیزار۔ لطفِ عفیف اور دلِ پاک باز مخدوم کے جسدِ خاکی میں کبھی یہی انسان پروان چڑھتا رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مخدوم کے جسدِ خاکی کو تہہِ خاک کرتے ہوئے ہم نے انسان کو بھی تہہِ خاک کر دیا ہے؟ اور اگر نہیں تو مخدوم کے آگے موت نے بھی سپر ڈال دی ہے۔ وہ انسان آج ہم سبھوں کے پیکر میں محفوظ، زندہ اور سلامت ہے، اور اس طرح مخدوم ہندوستان کے ۵۱ کروڑ افراد ہی کا نہیں، شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک بسنے بولتے متحرک و عامل ۳ ارب انسانوں کا کمبل بن گیا ہے۔ سوویت یونین میں، امریکہ میں، برطانیہ میں، صحرائے نجد میں، شام و عرب میں اس کی فتح و نصرت کے گیت گونج رہے ہیں

لیکن ۲۶ اگست کی رات سے لے کر آج تک ہمارے آنسو تھمتے کیوں نہیں ہیں . . . . . میری آنکھوں میں ماضی سے حال تک کے وہ سارے نقوش ابھر رہے ہیں جن میں سانولے سلونے مخدوم نے جمال و جلال کے سو روپ دھارے اور تین نسلوں کو اپنی محبت اور اپنے اخلاص کی کچھ ایسی یادیں دے گیا کہ ہم سب اس کی بارگاہ میں آنسوؤں کا خراج پیش کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

بیگم مخدوم اپنے شوہر نامدار کے کھو جانے کے غم میں سوگوار ہیں۔ اساوری، نصرت اور ظفر کو ایک شفیق باپ کی شفقتوں سے محروم ہو جانے کا دکھ ہے۔ راج کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ راج شیکھر ریڈی اپنے ایک رفیق اور مخلص دوست سے محروم ہو گئے۔ کامریڈ چندرا اور راموں لکھ رام سے لے کر شمارا اور میری چھوٹی بچی یاسمین تک سب اپنے اپنے انداز میں مغموم ہیں . . . . . حرم کے پاسباں، پجاری، فقیر، پریس، اعلیٰ عہدیداروں سبھوں کو فرشتۂ اجل سے گلہ ہے کہ اس نے ایک اچھے آدمی کو چھین لیا۔ مخدوم ۶۳ سال کے تھے لوگ تو اس سے کم عمری میں مرجاتے ہیں لیکن مخدوم کے لیے عمر کے اندازے کا عام پیمانہ بیکار ثابت ہو رہا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے ایک نوجوان کو موت کی سرد آغوش میں جھونک دیا ہے۔ وہ تو زندگی کا شاعر تھا۔ ہم عہد اور ہر عمر کے لوگوں کا ہم عصر۔ اب ہم کس کو پرسہ دیجئے کہ اپنے ہی نقصان کی تلافی کے اہل نہیں ہیں تو دوسروں کو صبر کی تلقین کیسے کریں . . . . اس مرحلہ پر اگر کوئی چیز ڈھارس بندھا سکتی ہے تو یہی کہ مخدوم نے زندگی بھر جس شعار کو اپنائے رکھا وہ انسان کو بقائے دوام کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ دل اداس اور شہر چپ ضرور ہے کہ ؎

شہر میں ایک قیامت تھی قیامت نہ رہی
حشر خاموش ہوا فتنۂ دوراں چپ ہے

لیکن اس سناٹے میں بھی مخدوم کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

خواجہ احمد عباس

ایک انقلابی - ایک شاعر - ایک انسان

یہ مخدوم محی الدین تھا!

کچھ اندھوں نے ہاتھی کو ٹٹول کر دیکھا۔ ایک اندھے نے ہاتھی کی [illegible] ٹانگ کو ہاتھ لگا کر کہا۔

یہ تو کوئی ستون جیسی چیز ہے۔

دوسرے اندھے نے ہاتھی کے [illegible] تیسرے اندھے نے ہاتھی کی دم کو ہاتھ میں لے کر کہا "یہ تو ایک رسّی ہے۔" چوتھے نے ہاتھی کے [illegible] پانچویں نے ہاتھی کی سونڈ کو چھو کر کہا "ارے یہ تو کوئی اژدھا ہے۔" چھٹے نے کہا [illegible] وہ کون تھا؟ کیا تھا؟

جب مخدوم محی الدین کی اچانک موت کی خبر آئی تو مختلف لوگوں نے کہا

افسوس ایک انقلابی شاعر مر گیا جس کی [illegible] آگ لگا دی تھی۔ مثال کے طور پر [illegible] یہ جنگ ہے جنگ آزادی [illegible]

افسوس ایک رومانی شاعر مر گیا، جس کی خوبصورت غزلیں [illegible] دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر "اک چنبیلی کے منڈوے تلے [illegible]

دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے"

تلنگانہ کے غریب کسانوں کی ایسی انقلابی تنظیم کی تھی کہ برسوں تک [illegible]

افسوس ایک ممتاز اور ہر دلعزیز حیدرآبادی مر گیا جس کے ایک [illegible] ہزاروں آدمی اکٹھا ہو جاتے تھے۔

افسوس آندھرا پردیش لیجسلیٹو کونسل کا اپوزیشن لیڈر مر گیا جس [illegible]

افسوس مزدور تحریک کا ایک رہنما مر گیا جس نے اپنی زندگی میں [illegible] قائم کی تھیں۔

افسوس ہمارا ایک مخلص دوست مر گیا جس کے آنے سے محفل میں [illegible] ہو جاتی تھی۔

افسوس ہمارا استاد مر گیا جس نے ہمیں ادب سے لے کر انقلاب تک بہت کچھ سکھایا تھا۔

افسوس ایک اداکار مرگیا جو اپنی نوجوانی کے دنوں میں خود اپنے لکھے ہوئے ڈراموں میں کام کیا کرتا تھا جس کی اداکاری کی تعریف گرو دیو ٹیگور تک نے کی تھی اور جو گیتوں اور نظموں میں بھی ڈرامائی کیفیت پیدا کردیتا تھا۔

ہر رنگ ہر خوشبو!

دراصل بات یہ ہے کہ افسوس اس لیے ہے کہ ایک انسان مرگیا ــــ ایک مکمل انسان جس کی شخصیت میں زندگی کا ہر ایک رنگ تھا، ہر ایک کیف تھا، ہر ایک خوشبو تھی، انسانیت کا ہر ایک جذبہ تھا، سنگیت کا ہر سُر تھا، ہر لے تھی، آہنگ تھا۔

جو شعلہ بھی تھا، شبنم تھا۔
انقلاب کی للکار بھی تھا، پائل کی جھنکار بھی۔
علم بھی تھا، عمل بھی تھا، عقل بھی تھا۔
انقلابی چھاپہ مار کی رائفل بھی تھا، سنگیت کار کا ستار بھی۔
بارود کی بو بھی تھا، چنبیلی کی خوشبو بھی تھا۔

ان سب سے مل کر انسان بنتا ہے۔ یہ سب چیزیں ایک انسان میں ہونی چاہئیں۔ مگر کتنے انسانوں میں ہوتی ہیں؟
تب ہی تو مخدوم محی الدین کی موت سے محفل سونی ہوگئی ہے۔

شبنم قیوم

مخدوم محی الدین سے پہلی اور آخری ملاقات

میرے کمرے کے ٹیبل پر ایک تصویر ہے۔ میری چھوٹی بچی نے جب تصویر اٹھا کر دیکھی تو مخدوم محی الدین پر انگلی رکھ کر توتلی زبان میں بولی۔

"پپا! یہ مرگئے؟" اپنی بچی کی اس بری بات پر سخت غصہ آیا اور ڈانٹتے ہوئے میں نے یہ تصویر اس کے ہاتھ سے چھین لی یکایک مجھے وہ ملاقات یاد آگئی جب ہم نے یادگار کے طور پر یہ تصویر کھنچوائی تھی۔ اس میں مخدوم محی الدین، سجاد ظہیر، ڈی کے کنول، رضیہ سجاد ظہیر اور میں شامل تھے۔ یہ تصویر ہم نے صادق صاحب چیف منسٹر کے پرائیوٹ ہوم کے احاطے میں لی تھی۔ جہاں سجاد ظہیر اپنی فیملی کے ساتھ مہمان خصوصی کے طور پر قیام پذیر تھے۔

اسی روز رات کو جب میں نے آل انڈیا ریڈیو سے خبروں میں سنا کہ مخدوم محی الدین دل کی حرکت بند ہونے کی وجہ سے دہلی میں انتقال کر گئے۔ تو میرے وجود پر سکتہ سا طاری ہوگیا، میرا سر گھومنے لگا اور دماغ میرا ماؤف ہونے لگا کچھ دیر بعد جب میں نے دم سنبھالا تو یکایک میں نے اپنی معصوم بچی کو گود میں لے کر اسے زور سے چوما اور کہا:

"میں نے تمہیں خواہ مخواہ ڈانٹا، مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہیں الہام ہوا ہے۔ مخدوم صاحب واقعی مر گئے ہیں اتفاق سے اسی وقت مر گئے ہیں جب تم نے البم ہاتھ میں لیا تھا۔"

میں نے دیکھا میری معصوم بچی میری باتیں بالکل نہیں سمجھی بیچاری مخدوم صاحب کو جانتی بھی نہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر نے سری نگر آنے سے پہلے مجھے ایک خط لکھ دیا تھا جس میں اس بات کا بھی ذکر تھا کہ میں سجاد صاحب اور بچوں کے ہمراہ ایک مہینے کے لیے کشمیر آرہی ہوں اس لیے وہاں ہم سے ملنے ضرور آنا۔ جب میں ڈی۔ کے کنول کے ہمراہ ان کی کوٹھی پر ملنے گیا تو سجاد ظہیر نے مجھے ایک ایسے شخص سے متعارف کرایا جن کا نام سن کر میں نہ صرف چونک اٹھا بلکہ فرط مسرت سے سرشار ہوگیا۔ یہ مخدوم محی الدین تھے جو اتفاق سے ہم سے پہلے بنے میاں سے ملنے آئے تھے۔ مخدوم صاحب کل ہی حیدرآباد سے آل انڈیا ریڈیو کے اردو مشاعرے میں شرکت کے لیے سری نگر آئے تھے۔ مخدوم محی الدین سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس ملاقات میں وہ میرے جتنے قریب آگئے شاید ہی کوئی میرے اتنے قریب آج تک آیا ہوگا۔ ہم سبھی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں

کررہے تھے کہ سجاد صاحب نے نیچے باغ میں جاکر بیٹھنے کی تجویز رکھی۔ جب ہم باغ میں بیٹھنے کے لیے نیچے آئے تو اسی وقت صادق صاحب تشریف لائے۔ صادق صاحب ایک ایک کر کے ہم سے معانقہ کیا اور خیر و عافیت پوچھی۔ پھر جب مخدوم صاحب سامنے آئے تو صادق صاحب فرطِ مسرت سے ان سے لپٹ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیر تک اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جب صادق صاحب ہم سے رخصت ہو گئے تو ہم ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے سب سے پہلے ہمارے اس اردو رسالے کی بات چلی جو آج کل ترتیب کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ بنے میاں اور مخدوم صاحب نے اس رسالے کو جاندار بنانے کے لیے جو مفید مشورے ہم کو دیے ہم کبھی بھول نہیں سکتے۔ رضیہ سجاد ظہیر نے تجویز رکھ دی کہ کیوں نہ اس رسالے میں ہر ماہ ایک ایک شہر کی داستان بیان کی جائے۔ میں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ انھوں نے فرمایا "میں دلی کے بارے میں لکھ دوں گی اور ساتھ ہی مخدوم صاحب سے گزارش کروں گی وہ حیدرآباد کے بارے میں لکھ دیں۔"

ہم سب نے مخدوم صاحب کا جواب سننے کے لیے ان کی طرف دیکھا، حیدرآباد کا نام سن کر ان کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا ان کے دل سے جیسے ایک ہوک سی اٹھی وہ بڑی مایوسی سے بولے۔

"جس حیدرآباد کے بارے میں آپ مجھ سے لکھنے کے لیے کہہ رہے ہیں وہ حیدرآباد آج جل رہا ہے۔ وہاں سارا کاروبار معطل ہے اسکول اور کالج بند ہیں۔ دکانوں میں ہڑتال ہے چار سو افراتفری وہاں روز مرّہ کی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے، غنڈہ گردی، لوٹ مار ظلم و جبر، تشدد، قید و بند وہاں کا معمول ہے۔ جدھر دیکھو ملٹری اور پولیس بندوقیں تانے کھڑی ہے۔ ہر گلی کوچے اور بازار پر ملٹری اور پولیس کا کڑا پہرہ۔ حیدرآباد کے کاروبار پر وہاں کی تعلیم پر، آمد و رفت پر چلنے پھرنے پر، زبان اور خیالات پر پولیس اور ملٹری کا پہرہ ہے، ہر طرف خون خرابا ہو رہا ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ کے خیال میں تلنگانہ ایجی ٹیشن کہاں پر جا کر رکے گا؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" مخدوم صاحب فوراً بولے۔ "پھر بھی تباہی اور بربادی کے سوا یہ ایجی ٹیشن کہیں اور جا کر نہیں رک سکتا۔ مرکزی حکومت آنکھیں بند کر کے عوام پر ظلم و جبر کر رہی ہے۔ حکومت اس مسئلہ کو سلجھانے کے بجائے الجھا رہی ہے۔ مرکزی حکومت چیف منسٹر برہما نند ریڈی کی باتوں میں آکر یہ سارا کھیل رہی ہے۔ حالات کا تقاضہ تو یہ ہے کہ برہما نند ریڈی کو فوراً ہٹا دیا جائے اور صدر راج نافذ کر کے آہستہ آہستہ لوگوں کا جوش ٹھنڈا کیا جائے۔ پھر حیدرآباد اور تلنگانہ کے سنجیدہ لوگوں سے مل کر اس مسئلہ کا حل نکالا جائے۔"

میں نے پوچھا "کیا آپ علیحدہ تلنگانہ کے حق میں ہیں؟"

"نہیں ہرگز نہیں۔" مخدوم صاحب جذباتی لہجے میں بولے۔ "میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تلنگانہ علیحدہ ہوا تو اس کی اہمیت گھٹ جائے گی، آندھرا کی پوزیشن ختم ہو جائے گی۔ بیس ضلعوں کی راجدھانی صرف نو ضلعوں کی راجدھانی رہ جائے گی۔ سارے آندھرا اور تلنگانہ میں زبردست افراتفری مچے گی۔ لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ وہاں ابھی سے اینٹی آندھرا تحریک چل رہی ہے آج کھلے بندوں آندھرا کے لوگوں کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ آندھرا کے لوگوں کی ننگی تصویریں بنا کر دیوار پر لٹکائی جاتی ہیں۔ ہم اس کے

بارے میں احتجاج کرتے ہیں لیکن کوئی ہماری سنتا نہیں۔ دراصل وہاں آج کل سننے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ وہاں اسکولوں اور کالجوں کے لڑکے اپنی حکومت چلا رہے ہیں۔ تیجر وغیرہ اپنی حکومت بنا رہے ہیں۔ دوسرے کاروباری لوگ اپنی وزارت کی دھاک بٹھا رہے ہیں۔ لوگ بے حد مشتعل ہو گئے ہیں، لوگوں سے زیادہ مشتعل پولیس اور ملٹری ہے۔

آج خرابی اور بربادی کا نام آندھرا اور تلنگانہ ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کانگریس نے تلنگانہ کے بارے میں معاہدہ کیا تھا، وہ اس پر کاربند نہیں رہی لوگ کب تک اس امتیاز کا شکار بنے رہتے عوام مشتعل ہو گئے ہیں۔ سنجیدہ لوگ جذباتی بن گئے ہیں ہر طرح نقصان ہی نقصان ہو رہا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کسی بھی حکومت کو یہ سمجھنا چاہیے کہ عوام کسی بھی ظلم دیر سے نہیں دیتے بلکہ اور آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ عوام کے جائز مطالبات کو سنجیدگی سے پورا کرنا ہر حکومت کا نصب العین ہونا چاہیے۔ اسی میں اس کی کامیابی ہے۔

"اگر آپ یہاں کھلے بندوں ایسی باتیں کریں گے تو سمجھنے والے کہیں گے۔۔"

مخدوم صاحب نے میری بات کاٹ دی اور کہا: "شبنم صاحب آپ کے اشارے میں ایک انکشاف بھی ہے اس پر مجھے ایک بات یاد آگئی۔ بخشی صاحب کی وزارت میں "جشن کشمیر" کے ایک مشاعرے کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا تھا اور بخشی صاحب کا خصوصی مہمان بھی تھا۔ ان دنوں بخشی صاحب جہاں بھی جاتے مجھے اپنے ساتھ لے جاتے وہ میرا بڑا احترام کرتے تھے۔ اسی دوران میں انھوں نے کشمیر کے حالات کے پس منظر میں مجھے ایک نظم لکھنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہ نظم آپ علی جواد زیدی کو دے دیں جو ان دنوں انفارمیشن افسر تھے میں نے نظم لکھ کر علی جواد زیدی کو دے دی۔ دوسرے روز مجھے نہ صرف یہاں سے فوراً نکل جانے کو کہا گیا بلکہ میرے یہاں دوبارہ داخلے پر پابندی بھی عائد کر دی گئی۔

مخدوم صاحب کے اس انکشاف پر ہم سبھی ہنس دیے۔ رضیہ آپا نے پوچھا "اس نظم میں آپ نے کیا لکھا تھا؟"

"اس میں نے کشمیر کے حالات کا حقیقی نقشہ کھینچا تھا۔"

میں نے کہا "آپ نے بھی کمال کیا۔ دوسروں کی طرح آپ کو حقیقت پر پردہ ڈالنا تھا نہ کہ آپ نے پردہ اٹھا دیا۔"

مخدوم صاحب نے کہا "میں نے اپنی زندگی میں زیادہ تر قیمتی چیزوں کی رکھوالی کی ہے۔ بردباری، عزت اور حقیقت"

دوسرے دن میں نے ان سے پوچھا۔ آج شام کو گاندھی جی کے سلسلے میں جو مشاعرہ ہو رہا ہے اس میں آپ کیا پڑھ رہے ہیں۔

انھوں نے فرمایا: "میں نے مارٹن لوتھر کنگ پر ایک نظم لکھی ہے۔ مارٹن لوتھر کنگ کو میں گاندھی جی کا ایک پیرو مانتا ہوں۔ وہی نظم پڑھوں گا۔"

کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے ہم باہر چہل قدمی کے لیے روانہ ہو گئے۔ دس بجے کے قریب وہ مجھ سے رخصت ہو کر ریڈیو اسٹیشن کی طرف جانے لگے۔ جاتے جاتے مخدوم صاحب نے مجھ سے کہا۔

"میں جلد ہی واپس حیدرآباد جانے سے پہلے تم سے ضرور ملوں گا تم میرے پاس آ جانا۔"

اُف! کتنا افسوس کا مقام ہے۔ روانگی کے وقت میں ان سے انتہائی مصروفیت کی وجہ سے نہیں مل سکا۔
آج جب وہ ہمیشہ کے لیے ہم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ میں لاچار و بے بس ہو کر سوچ رہا ہوں۔
کاش! میں آج ان کی میت کو رخصت کر سکتا۔ لیکن مخدوم صاحب کو میت کا نام دے کر یقیناً میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کی پہلی اور آخری ملاقات میرے لیے ایک بہت بڑا یادگار واقعہ ہے۔
میں جانتا ہوں وہ ابھی ہم سے بچھڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے لیکن موت اتنی اٹل کیوں ہے۔ کاش! اس موت کو موت آجائے جو ہم سے ہمارا مخدوم لے جاتی ہے

فکر تونسوی

وہ مر نہیں سکتا

اچانک میرے ریڈیو سٹ سے اناؤنسر کی آواز سنائی دی " ہندوستان کے مشہور انقلابی شاعر اور محبوب عوامی رہنما مخدوم محی الدین ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے چھوڑ کر چلے گیے "۔

اس سے چند منٹ پہلے ریڈیو سے ایک مسرت انگیز خبر سنائی گئی تھی کہ ہندوستان کے مشہور عوام دشمن سنڈیکیٹ اور غیر محبوب رہنماؤں نے اندرا گاندھی کی سوشلسٹ پالیسیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

ایک خبر اتنی اندوہناک دوسری خبر اتنی خوش کن ؟ اور دونوں خبروں کے درمیان صرف چند منٹ کا فاصلہ ؟ اور میں سوچنے لگا۔ کیا موت اور زندگی اتنے قریب قریب رہتے ہیں۔ ایک لمحے سوشلزم کا متوالا دنیا سے چل بسا۔ دوسرے لمحے سوشلزم فاتح و کامران ہو کر نکلا۔ یہ کیسی دنیا ہے ؟ جس میں خوب و ناخوب دونوں حقائق بیک وقت ٹکراتے رہتے ہیں۔

سچ مانیئے مجھے اس بات پر اعتبار تو آ گیا کہ سنڈیکیٹ سوشلزم کے طوفانی ریلے کی تاب لا کر ضرور پیچھے ہٹ گیا ہو گا لیکن اس خبر پر مجھے پہروں یقین نہ آیا کہ مخدوم محی الدین چل بسا۔ وہ جو عمر بھر سوشلزم کی خاطر لڑتا رہا۔ جونہی سوشلزم کے درخت پر بور آنے لگا وہ درخت سے ہی پیٹھ موڑ کر چلا گیا۔

اور کیا پرائمری کے قاعدے کے اس بوڑھے کا یہ کہنا واقعی صحیح ہے۔ جسے پیڑ لگاتے دیکھ کر کسی نے پوچھا تھا " بابا! تم یہ پیڑ کاہے کو لگا رہے ہو، جب تک اس پر پھل لگیں گے اس وقت تک تم تو اس دنیا سے کوچ کر چکے ہو گے؟"

اور بوڑھے بابا نے جواب دیا تھا " بیٹا " میں یہ پیڑ اپنے لیئے نہیں آنے والی نسلوں کیلیئے لگا رہا ہوں "

ہاں مخدوم میں شاید اسی بوڑھے بابا کی روح تھی۔ اس نے زندگی بھر سوشلزم کے بوٹے کو سینچا ! اسے پانی دیا ! اسے حرارت پہونچائی، اسے رجعت پسندوں کی زہریلی ہواؤں سے محفوظ رکھا۔ اکتیس سال تک وہ اس پیڑ پر پھل لانے کے لیئے کڑے سے کڑے مصائب سہتا رہا۔ اس کے لیئے قید و بند کے دکھ جھیلے، اس نے غریب محنت کش عوام کے لیئے سوشلزم لانے کے لیئے اپنی جوانی، اپنی تمناؤں، اپنے علم اور اپنے خلوص کا لہو دیا۔

اور پھر جب پیڑ کی کونپلیں پھوٹنے لگیں دیش بھر میں سوشلسٹ طاقتوں کے پھریرے لہرانے لگے۔ اور قریب تھا کہ عوام کا صبر اور جد و جہد پھل لاتی۔ نہ جانے مخدوم کے جی میں کیا آئی کہ اس پھل کو سرمایہ داروں کی بجائے عوام کی جھولیوں میں گرتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ اور اس وقت سے پہلے چلا گیا۔ جب اسے جانا نہیں چاہیئے تھا، یہ شاید صحیح ہو کہ بقول غالب۔ موت کا ایک دن معین ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ ایسے لوگوں کے لیے موت کا دن کیوں معین کر دیا جاتا ہے۔ جو روشنی کی مشعل لے کر آگے بڑھ رہے ہوتے ہیں۔

میں شاید یہ کہہ کر زیادتی نہیں کر رہا ہوں کہ میرے قارئین نے مخدوم محی الدین کا نام کم سُنا ہوگا۔ لیکن یہ کہنا بھی مبالغہ ہرگز نہیں ہے کہ آندھرا پردیش میں مخدوم کی پوجا کی جاتی تھی۔ گذشتہ سال جب میں حیدرآباد گیا تھا تو حیدرآباد کے رکشا پلر سے لے کر یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس سے ہوتے ہوئے بڑے بڑے وزیر تک جب مخدوم کا نام لیتے تھے تو احترام و عقیدت سے ان کے سر جھک جاتے تھے۔ کیونکہ وہ بیک وقت مزدور لیڈر بھی تھا، شاعر لیڈر بھی تھا اور سیاسی لیڈر بھی تھا۔ ہلکے سیاہ رنگ کا، نکر تونسوی کی طرح دبلا پتلا، محبت اور خلوص کا مجسمہ، جس سے بھی بات کرتا تھا اس کا دل موہ لیتا تھا۔ طبیعت میں، لباس میں، بول چال میں نہایت پرکشش سادگی، حیدرآباد کی کوئی محفل مخدوم کے بغیر نمائندہ محفل نہیں سمجھی جاتی تھی۔

میں نے بڑے بڑے امیرزادوں کو مخدوم کے سامنے سر عقیدت جھکاتے دیکھا ہے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی جڑیں ہلانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ مگر اس کے باوجود مخدوم کی شخصیت ہی ایک طلسم تھا کہ محنت کش طبقہ اس کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا تھا۔ مگر سرمایہ دار طبقہ اس کی سچی اسپرٹ اور عزم صمیم کا احترام کرتا تھا۔ اس نے سرمایہ دارانہ نظام سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، کیونکہ اس کے مزاج میں اس کی روح میں وہ تڑپ تھی، جو تیز تر ہو جائے تو سوشلسٹ انقلاب کے دہانے پر پہونچ جاتی ہے۔

اور آج جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، میرے دماغ میں متواتر کشمکش ہو رہی ہے کہ مخدوم کے انتقال کی خبر جھوٹی ہے یا سچی! وہ مر ہی نہیں سکتا تھا، اسے مرنا چاہیئے بھی نہیں تھا۔ کیا مرنے کے لیئے صرف مخدوم ایسے خادم عشق باقی رہ گئے ہیں؟ کیا موت نے اسے دنیا سے اٹھانے سے پہلے یہ نہیں سوچا کہ مخدوم ایسے لوگ مرنے کیلئے پیدا نہیں ہوتے، کیا موت کا انتخاب انتہائی غلط نہیں تھا؟

میں مخدوم سے کئی بار ملا ہوں اور وہ ہمیشہ مجھے پیارا لگا ہے میں اسے گذشتہ پچیس سال سے جانتا ہوں سب سے پہلے اس سے میرا تعارف ایک شاعر کے طور پر ہوا تھا۔ جب ہم سب شاعر اور ادیب لوگ انگریز سامراج کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، مخدوم کا شاعرانہ قلم ہم سب سے پیش پیش تھا۔ اس کی شاعری کا ایک ایک بول عوام کی رگوں میں ہمت اور طاقت کا لہو دوڑا دیتا تھا۔ وہ غلامی کے اندھیرے میں شاعری کی روشن مشعل لے کر آگے بڑھتا تھا۔ اور اس وقت کا مجھے اس کی نظم کا ایک مصرعہ جو زبان زد عام ہو چکا تھا، کبھی نہیں بھولتا کہ اے دوستو! سے

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں ۔
اور پھر جب ہمیں معلوم ہوا کہ مخدوم صرف شاعر نہیں ہے، وہ صرف ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ کر عشق و حسن کے راگ الاپنے والا شاعر نہیں ہے بلکہ وہ مزدور جھنڈے بندیوں میں جا کر ان کی سیاسی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ تو ہم قدرے پریشان ہو جاتے تھے، ہم نے مخدوم سے کئی بار کہا "مخدوم صاحب! یہ ٹریڈ یونین کی لیڈری تمہاری شاعری کی رفتار کو مدھم کر رہی ہے اور عوام کو تمہاری خوب صورت اور رچاؤ والی شاعری کی بیحد ضرورت ہے۔" تو وہ کہا کرتا "مزدوروں میں رہ کر میری شاعری میں زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے، شاعری میرا آدرش نہیں ہے بلکہ آدرش تک پہونچنے کا ایک سادھن ہے۔"
اور وہ آدرش کا متوالا اپنا زیادہ تر وقت سیاسی کاموں میں صرف کرنے لگا۔ کبھی کبھار اس کی نظم کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہو جاتی تو سبھی عش عش کر اٹھتے۔ لیکن آہ! آج وہ شاعری اور سیاست دونوں کو چھوڑ کر ہم سے جدا ہو گیا مگر اس اچانک سے پر جدا ہوا کہ میں اس مضمون کا آخری فقرہ لکھتے وقت بھی یہ محسوس کر رہا ہوں کہ کل شام مخدوم محی الدین سے پھر ملاقات ہو جائے گی اور میں کہوں گا "مخدوم! اپنی کوئی تازہ نظم سناؤ۔ کوئی ایسی نظم، جو اندھیروں کو چیرتی ہوئی صبح صادق کی روشنی کا پیغام سنائے۔"

ابراہیم جلیس

مخدوم ـ دوامی طور پر انڈر گراؤنڈ

دنیا میں چند انسان ایسے بھی آتے ہیں کہ کاتب حیات ان کی زندگی کا سرورق تو لکھ دیتا ہے لیکن آخری صفحہ نہیں لکھتا ـــــ شاید قیامت کے دن کے لیے اٹھا رکھتا ہے۔

مخدوم محی الدین بھی ان چند زندہ جاوید انسانوں میں سے ایک ہیں جن کی زندگی کی کتاب کا پہلا ورق سنہ ۱۹۰۸ء میں تحریر کیا گیا۔ ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء تک اس کتاب کے ۲۲۱۳۵ صفحات لکھے گئے اور آخری صفحہ باقی ہے، شاید دنیا کی تکمیل کے ساتھ ہی مکمل ہو جائے گا۔

مخدوم محی الدین صاحب میرے ذہنی راہ نما، میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کے جگری دوست اور ہر طرح سے میرے بزرگ تھے۔ خوردی اور بزرگی میں جتنا فاصلہ ہوتا ہے وہ میرے اور مخدوم صاحب کے درمیان بھی تھا۔ مشرقی تہذیب اور بالخصوص حیدرآبادی تہذیب میں ایک چھوٹے پر اپنے بڑے کا جتنا احترام لازم ہے میں بھی مخدوم صاحب کا اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ احترام کرتا تھا۔ ان کے آتے ہی کھڑا ہو جانا، سر پر ٹوپی اوڑھ لینا، ان کے لیے بازار سے چائے پان اور سگریٹ لانا، ان سے چھپا کر سگریٹ پینا، جن دنوں وہ انڈر گراؤنڈ تھے ان کے کپڑے لانڈری سے دھلوانا اور ان کے خاص خاص پیغام خاص خاص لوگوں تک پہنچانا وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک ایسی خدمات کا تعلق ہے مخدوم صاحب میرے لیے اسم بامسمیٰ یعنی وہ واقعی میرے مخدوم تھے اور میں واقعی ان کا خادم ـــــ حالانکہ اپنے غریب ہم وطنوں کے لیے انہوں نے جہاں فرسودہ سماج اور مطلق العنان حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا وہاں انہوں نے اپنے تجویز کیے نام سے بغاوت کر دی تھی۔ اور یہ واقعی کیسی عجیب بغاوت تھی کہ نام تو "مخدوم" اور اپنے ہر غریب اور مظلوم ہم وطنوں کے بے دام خادم اور بے تنخواہ خدمت گزار۔

∴ ∴ ∴

یہاں سے سینکڑوں میل دور جنوب میں سطح مرتفع دکن میں اور دکنی گھٹاؤں، موسلا دھار بارشوں، ہرے بھرے کھیتوں اور سانولی سلونی شاموں والا اسرار وطن حیدرآباد ـــــ آہ! اب جب کبھی فرصت کے لمحات میں پرانی یادوں کی چاندنی پھیل جاتی

ہے تو میں تصور کی آنکھوں سے اپنے ہرے بھرے دیس میں اپنے ماں باپ بھائی بہنوں رشتہ داروں اور دوستوں کے چہرے دیکھا کرتا ہوں۔ ان موہ بھری مورتوں اور پیاری پیاری صورتوں میں مجھے مخدوم محی الدین کا وہ پُر وقار چہرہ بھی ضرور نظر آتا تھا جس پر دکن کی مخصوص سانولی شام کا سلونا پن ہمیشہ دمکتا رہتا تھا۔

لیکن ابھی ٹھیک اسی دن سے جس دن سے یہ منحوس خبر آئی ہے کہ مخدوم محی الدین زندگی کی شاہراہ سے بھٹک کر موت کی اندھی گھاٹی میں اُتر گئے ہیں اور اب اس راستے پر ان کی حیات جاوداں کا چراغ جل اٹھا ہے تو میں اسی چراغ کی روشنی میں پھر اپنے پیارے وطن سندر دکن کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ سارے مانوس اور پیارے چہرے صاف صاف نظر آ رہے ہیں صرف مخدوم کا دلآویز چہرہ آنسوؤں میں بار بار ڈوب ڈوب جاتا ہے۔

آنسو ہیں کہ رکتے نہیں، چہرہ ہے کہ دکھتا نہیں۔ عدم کے راستے کا مسافر کبھی رکتا ہی نہیں تو اسے اکیلے آنسو بھلا کیسے رک سکتے ہیں!؟

اب تک تو مخدوم کا نام مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر پھیل جاتا تھا۔ اب وہی مخدوم کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنسو بن کر اُمڈتا رہے گا۔

. . . .

ابھی بہت دور جب میں گلبرگہ ہائی اسکول کا طالب علم تھا دہلی سے بچوں کا ایک رسالہ "پیام تعلیم" شائع ہوا کرتا تھا۔ اس رسالے کے ذریعہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان دنیا بھر کے بچوں کی دوستی کی ایک تنظیم "پیام برادری" کے نام سے قائم تھی اور میں اس پیام برادری کی شاخ گلبرگہ کا صدر تھا۔ اس کے ایک سالانہ جلسہ کی تقریب کے لیے ہم کسی بڑی اور مشہور شخصیت کو مدعو کرنا چاہتے تھے۔ ان دنوں ساری ریاست حیدرآباد میں ایک نئے نام کی شہرت کا طوطی بول رہا تھا جس نے جوش الحانی سے جھلک رہا تھا وہ نام تھا ——— مخدوم محی الدین۔

میں نے اپنے دوستوں عثمان صحرائی مرحوم، نوح فاروقی، عبدالرحیم فضل اور رہنما گلبرگوی کے مشورے سے مخدوم محی الدین کو اس تقریب کی صدارت کے لیے مدعو کیا۔ مخدوم نے نہ صرف اس تقریب کی صدارت قبول کی بلکہ اس دور کے ایک اور مشہور اور مقبول شاعر صاحبزادہ محمد علی خاں میکش مرحوم کو بھی اپنے ساتھ گلبرگہ لے آئے۔ پیام برادری کی وہ تقریب نہایت کامیاب رہی۔ گلبرگہ میں ہل چل سی مچ گئی۔

جمادات میں پارس پتھر
انسانوں میں مخدوم محی الدین

جسے چھو لیں، وہی سونا۔ مخدوم گلبرگہ سے تو چلے گئے لیکن اپنے پیچھے اپنی ساری محبت چھوڑ گئے۔ بڑے بڑے مالوں کے اشعار مخدوم بنیش کے علاوہ مخدوم سے ہر ملنے والا ایک نئے نظام حیات کا بھی گرویدہ ہوتا چلا گیا۔

نیا نظام جیا کہ دنیا میں سارے انسان برابر برابر ہیں اور انسان کے سب سے بڑے دشمن سرمایہ دارانہ نظام اور جاگیردارانہ نظام ہیں۔

ریاست کا ہر نوجوان مخدوم بنتا چلا جا رہا تھا۔ حیدرآباد کے جیسے دو ٹکڑے ہو گئے تھے ——— جاگیرداروں کا حیدرآباد

— جاگیردارانہ نظام سے کچلے ہوئے اور سہمے ہوئے نوجوانوں کا حیدرآباد۔
نظامِ سابع نواب میر عثمان علی خاں جاگیرداروں کے حیدرآباد کے تاجدار۔
اور مخدوم محی الدین نوجوانوں کے حیدرآباد کے بے تاج بادشاہ۔

ریاست حیدرآباد بلکہ جنوبی ہندوستان کا شاید ہی کوئی نوجوان ایسا ہو جس پر مخدوم محی الدین کی پرچھائیں نہ پڑ چکی ہو، اور جو مخدوم سے کسی نہ کسی طرح متاثر نہ ہوا ہو۔

جاگیردارانہ نظام بھلا مخدوم کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ حکومت کی داروگیر سخت ہوئی تو مخدوم محی الدین انڈرگراؤنڈ ہو گئے لیکن اس وقت تک وہ خود ایک مکتبِ فکر SCHOOL OF THOUGHT بن چکے تھے ایک عقیدہ اور ایک نظریہ میں ڈھل چکے تھے۔ اس لیے سامنے ان کا جسمانی وجود ضروری بھی نہ تھا۔

وہ انڈرگراؤنڈ کیا ہو گئے گویا دکن کی سرزمین میں ترقی پسند تحریک جڑ پکڑ گئی۔ مخدوم اس وقت تک انڈرگراؤنڈ رہے جب تک کہ اس سرزمین پر ترقی پسند تحریک ایک مضبوط، توانا پھل دار سایہ دار درخت نہیں بن گئی۔

مخدوم نے اپنی جوانی ترقی پسند تحریک کی جوانی پر سے نچھاور کر دی۔ انھوں نے اپنی بیوی کا پیار اور اپنے بچوں کے سروں کا سایہ تک اس تحریک پر سے وار کر پھینک دیا۔

پھر جب وہ گھر لوٹے تو ان کی جوانی کی شام بہت گہری ہو چکی تھی لیکن مخدوم کو کوئی دکھ نہیں ہوا، کیونکہ ان کے سامنے ایک نئی ترقی پسند نسل کی مسکراہٹیں بکھری تھیں

· · ·

میں تو بلا شبہ یہی کہوں گا کہ ریاست حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف سب سے پہلے جس جیالے نوجوان نے بغاوت کا علم بلند کیا وہ مردِ حر مخدوم محی الدین ہی تھا۔ وہ اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل اور پھر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا، کارواں چلتا گیا، کارواں بڑھتا گیا اور پھر کارواں مخدوم محی الدین کی رہنمائی میں جنوبی ہندوستان کے نوجوانوں کی ایک ساری نسل چل پڑی۔

مجھے تو یوں بھی محسوس ہوتا ہے جیسے سلطان ٹیپو شہید کی روح کے آگے شرمسار خاکِ دکن نے اپنے ایک ناعاقبت اندیش بیٹے کے ایک گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے دو سپوت پیدا کیے۔ ایک بہادر یار جنگ دوسرا مخدوم محی الدین۔
— اب مجھے یقین ہے کہ عرشِ بریں پر شہید ٹیپو نے پہلے بہادر یار جنگ کو اور اب مخدوم محی الدین کو بے اختیار سینے سے لگا لیا ہوگا۔ اور دونوں کی اس کڑی نے دکن کے ماتھے سے غداری کا کلنک کا ٹیکہ مٹا دیا ہوگا۔

· · ·

میں آخری بار مخدوم صاحب سے اگست ۱۹۶۰ء میں حیدرآباد میں ملا تھا۔ اسی اگست کے مہینے میں جب وہ ہم سب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ میں بارہ سال کی اذیت ناک جدائی کے بعد اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں سے ملنے حیدرآباد پہنچا۔

وہاں میرے بڑے بھائیوں میر عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر کے اخبار "سیاست" میں عابد علی خاں کا ایک ریٹائرنگ روم تھا جو دراصل مخدوم صاحب کا بقول شاہد صدیقی مرحوم "شطبہ" تھا۔ مخدوم صاحب یہاں اکثر آیا کرتے۔ برسہا برس بعد ان سے میری ملاقات وہیں ہوئی۔ بڑی شفقت سے سینے سے بھینچ کر ملے۔ پھر انھیں وہ پرانا زمانہ یاد آگیا۔ جب وہ مجھ سے پان سگریٹ منگوایا کرتے تھے چنانچہ بڑی پیار بھری سرزنش کے انداز میں بولے۔

"تم پاکستان سے آئے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اب تم سے پان سگریٹ نہیں منگوایا کروں گا اتنے برسوں بعد آئے ہو۔ وہ رہے میرے میلے کپڑے۔ تم دوا انھیں اور دھلا لاؤ کسی لانڈری سے۔"

میں ۱۷ دن حیدرآباد میں رہا ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ وہ اپنے پرانے دوستوں اور خاص طور پر حضرت فیض احمد فیض، حضرت جوش ملیح آبادی، سید سبط حسن، مرزا ظفر الحسن، محی الدین غازی، احمد علی علوی، محمد قمر مہاجر، اور نظر حیدرآبادی مرحوم کے بارے میں بار بار پوچھتے تھے۔ پھر بھی ان کا جی نہ بھرتا تھا۔ سب سے زیادہ سید سبط حسن اور مرزا ظفر الحسن کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ میں تھوڑا بہت تو مرزا ظفر الحسن کے بارے میں بتا دیا کرتا تھا لیکن سبط صاحب کے بارے میں مشکل یہ تھی کہ میں سبط صاحب کا اتنا ہی احترام کرتا ہوں جتنا کہ مخدوم صاحب کا کرتا تھا۔ ان میں اور مجھ میں کمی عمر کی اور بزرگی کا وہی فاصلہ ہے جو مجھ میں اور مخدوم صاحب کے درمیان تھا۔ اس لیے میں کچھ زیادہ نہ بتا سکتا تھا وہ جیسے چڑ کر کہتے۔

"جب تم سبط کے بارے میں وہی ساری باتیں بتاتے ہو جو پاکستان سے آنے والا ہر شخص سنا دیتا ہے تو پھر تمھیں کیا تکلیف تھی جو تم پاکستان سے آئے ہو!؟"

ان کی ان باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ پاکستان میں سب سے زیادہ سبط حسن اور مرزا ظفر الحسن سے پیار کرتے تھے۔

• •• •

اس ملاقات کے کوئی چار سال بعد اچانک ۳ر جولائی ۱۹۶۴ء کو ان کا ایک خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا۔

"ملیس کتنے برسوں بعد تمھیں لکھ رہا ہوں بہت بہت پیار۔ ایک چھوٹا سا کام ہے۔ تم ذاتی دلچسپی لے کر پورا کرو۔ میرے ایک بھتیجے ہیں منان صاحب انھیں کسی بینک میں ملازمت دلانے کا سوال ہے اس وقت وہ کسی اور محکمہ میں ہیں انٹر کامرس پاس ہیں۔ اسلامی ہرواس سے گریجویشن کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید عمر کی پخ بھی ہو۔ تم ممتاز حسن صاحب سے جو نیشنل بینک کے منیجنگ ڈائرکٹر ہیں کہہ کر یہ کام کرا دو۔ منان اور اس کی بیوی ثریا (میری بھتیجی) پر بڑا احسان ہوگا اور میں ممنون ہوں گا۔"

تمھارا

مخدوم محی الدین

اس خط کے بعد ان سے خط و کتابت ہوئی اور نہ ملاقات۔ البتہ ایک بار ان کے بارے میں یہ خبر آئی کہ وہ انڈر گراؤنڈ ہو گئے ہیں۔ اس خبر پہ کیسے یقین آسکتا تھا کیونکہ اب وہ آزاد ہندوستان کے ایک بہت بڑے راہنما تھے، اور عوام کے

محبوب لیڈر کہ حکومت ان پر ہاتھ ڈالے تو حکومت کے پاؤں اکھڑ جائیں۔

اس وقت تو وہ خبر غلط نکلی لیکن اب ـــــ اب یہ خبر بالکل سچی ہے۔
مخدوم محی الدین اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انڈر گراؤنڈ ہو گئے ہیں۔
پیاری زمین کا وہ عاشق جانباز مخدوم، زمین کو چھوڑ کر آسمان کی طرف بھلا کیوں جاتا ہے ؟
اس نے تو آسمان کو کبھی چاہا ہی نہیں۔
جبھی تو زمین نے بھی اسے اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا ہے۔
زمین اور اس کا محبوب مخدوم اب ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو چکے ہیں
اب فلک کج رفتار انھیں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں کر سکتا کبھی نہیں

مخدوم کو خراجِ عقیدت

منجانب

وزیر سلطان ٹوباکو کمپنی لمیٹڈ

حیدرآباد۔ اے پی

کشمیر میں تعلیم کی اشاعت

ملک میں ریاست جموں وکشمیر ہی غالباً واحد ریاست ہے جس میں کنڈر گارٹن سے پوسٹ گریجویٹ تک تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء میں تعلیم پر ۳۵ لاکھ روپے خرچ کئے گئے، جب کہ سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء میں اس مد پر ۷ کروڑ روپے کے اخراجات لاحق ہوئے۔ تعلیم کی توسیع کے سلسلہ میں اختیار کردہ تدابیر کے نتیجہ میں، تعلیمی اداروں کی تعداد میں سو فی صد اضافہ ہوا ہے۔

ملک اور قوم کی تعمیر سے متعلقہ سرگرمیوں کی رفتار ترقی کا اندازہ حسب ذیل امور سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء میں خواندہ افراد کا مجموعی آبادی میں تناسب ۶ فیصد تھا۔ لیکن اب گیارہ فیصد کی سطح پر پہنچ گیا ہے۔ ۲۔ سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء کا تعلیم کا بجٹ جو ۳۵ لاکھ روپے پر مشتمل تھا، بڑھ کر پانچ کروڑ روپے کا ہو گیا۔ ۳۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے پرائمری مدارس کی تعداد ۱۱۹۰ سے ۶۱۵۴ ہو گئی۔ سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں جہاں ان اداروں میں زیر تعلیم طلباء و طالبات کی مجموعی تعداد ۶۵۳۰۹ تھی، وہاں اب وہ ۳ لاکھ ۳۳ ہزار ہو گئی۔ سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء کے دوران ۱۰۵ پرائمری مدارس (ایک سو مدارس طلباء کے لئے اور ۵ مدارس طالبات کیلئے) کھولے گئے۔ ۴۔ سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء میں مڈل اسکولس کی تعداد ۱۵۲ تھی، اور اب وہ ۱۲۰۵ ہو گئی ہے۔ ان میں زیر تعلیم طلباء اور طالبات کی تعداد ۸۶۸۸۶ سے تجاوز کر کے ۹۵ ہزار کی سطح پر پہنچ گئی ہے۔ ۵۔ سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں جہاں صرف (۵۲) ہائی اور ہائر سکنڈری اسکول تھے وہاں اب ان کی تعداد (۴۰۰) ہو گئی۔ ۶۔ چھ تا گیارہ سال کی عمر کے بچوں کا ۶۰ فیصد ان مدارس میں زیر تعلیم ہے۔ ۷۔ جموں وکشمیر یونیورسٹی جو سنہ ۱۹۴۸ء میں محض ایک امتحانی ادارہ کی حیثیت سے قائم کی گئی تھی۔ اب ایک مکمل تدریسی ادارہ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جو (۲۱) پوسٹ گریجویٹ شعبوں پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۹۶۴ء میں یونیورسٹی کے دو شعبوں میں تنظیم جدید عمل میں لائی گئی۔ اس کا ایک شعبہ جموں میں اور ایک شعبہ سرینگر میں کام کرنے لگا تاکہ ریاست کے دونوں صوبوں کے طلبا کو، جامعاتی تعلیم کے حصول کی تمام تر سہولتیں حاصل ہوں۔ سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں یونیورسٹی کو ۵ء۲ لاکھ روپے کی گرانٹ جاری کی گئی تھی جسے بڑھا کر ۶ لاکھ روپے کر دیا گیا۔ ۸۔ سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء ریاست میں صرف ۳ کالج تھے جن کی تعداد اب ۱۶ ہو گئی۔ ان کے علاوہ ۳ امدادی کالج بھی ہیں۔ تمام کالجوں میں سہ سالہ ڈگری کورس رائج کر دیا گیا۔ ۹۔ ریاست کے طول و عرض میں، بہت بڑے پیمانہ پر سماجی تعلیم کے پروگرام کو بھی روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔ ریاست میں ۹۴۳ سوشل ایجوکیشن سنٹر موجود ہیں۔ اس اسکیم کی عمل آوری پر سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء میں ۲۱ء۶۱ لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ ۱۰۔ دس سال پہلے ریاست میں این سی سی اسکیم کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ ریاست کے مختلف حصوں میں، ۱۹ یونٹس کام کر رہی ہیں اور ان میں ۲۰ ہزار کیڈٹس زیر تربیت ہیں۔ ۱۱۔ گذشتہ چند سال کے دوران فنی تعلیم کی رفتار ترقی بھی اطمینان بخش رہی۔ فی الوقت متعدد ٹیکنیکل کالج موجود ہیں، ان میں ایک ریجنل انجینئرنگ کالج، ایک میڈیکل کالج، ۲ زرعی کالج، ۲ گورنمنٹ پالی ٹیکنکس (ایک سری نگر اور ایک جموں میں) سات صنعتی ٹریننگ کے ادارے، ایک آیورویدک کالج، اور ایک طبیہ کالج، شامل ہے۔ ۱۲۔ ریاستی حکومت نے اساتذہ کی تنخواہوں میں ایک اور اضافہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد بعض صورتوں میں تنخواہیں، کوٹھاری کمیشن کی سفارشات سے متجاوز ہیں۔ ۱۳۔ لداخ جیسے دور افتادہ علاقوں میں تعلیمی پروگرام کو روبہ عمل لایا جا رہا ہے سنہ ۱۹۶۱ء میں اس ضلع میں مدارس کی تعداد (۱۳۷) جو اب بڑھ کر (۲۵۴) ہو گئی ہے۔ بالفاظ دیگر ان کی تعداد میں ۱۸۵ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ ضلع میں بچوں کو تعلیم کی جانب مائل کرنے کیلئے "ہارڈ ایریا اسکالرشپ اسکیم" بھی نافذ کی گئی ہے۔

جاری کردہ: ڈائریکٹوریٹ آف انفارمیشن۔ حکومت جموں وکشمیر۔

کچھ قوسِ قزح سے رنگت لی کچھ نور چرایا تاروں سے

آل احمد سرور

مخدوم محی الدین

جولائی کے آخر کی بات ہے۔ سری نگر میں ریڈیو مشاعرہ تھا۔ مخدوم اس سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ میں بھی اس زمانے میں توسیعی لیکچر دینے کے لیے گیا ہوا تھا۔ ریڈیو کے مشاعرہ کے علاوہ گاندھی جینتی کے سلسلہ میں ایک اور مشاعرہ ہوا پھر یہ طے کیا گیا کہ مشاعرے میں جو شعرا آئے ہوئے ہیں وہ اور کشمیر کے ممتاز شعرا اچھا بل، بانڈی پورا اور سوپور میں بھی مشاعروں میں اپنا کلام سنائیں۔ غرض ایک ہفتے تک ان کا ساتھ رہا۔ شعر و شاعری، ادبی مسائل، ملکی سیاسیات، تلنگانہ تحریک سبھی پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ مخدوم کو دیکھ کر یہ خیال ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ چھریرا بدن، نکلتا ہوا قد، تپا ہوا سیاہ رنگ ترشے ہوئے خط و خال کسی طرح پچاس پچپن سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ دسمبر ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد میں ان کا ساٹھ سالہ جشن منایا گیا تھا۔ میں نے پوچھا بھائی یہ کیا قصہ ہے لوگ اپنی عمر کم بتاتے ہیں تم اپنی عمر زیادہ بتاتے ہو۔ اتنی جلد ساٹھ سالہ جشن منا لیا۔ کہنے لگے حساب سے آپ سے کم سے کم چار یا پانچ سال بڑا ہوں، ہاں ویسے آپ کو بڑا مانتا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ کچھ دن کے لیے علی گڑھ آ جاؤ تاکہ اطمینان سے ادبی مسائل پر بات چیت ہو۔ کہنے لگے ضرور آؤں گا۔ دلی کے پھیرے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہاں سے علی گڑھ کیا دور ہے مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ مخدوم ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسے کے سلسلے میں دلی آئے ہوئے تھے۔ ۲۴ کو صبح ان پر دل کا دورہ پڑا۔ فوراً ارون اسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ خیال تھا کہ خطرے کے چند دن گزر جائیں تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ مگر ۲۵ کی شام کو دوسرا سخت دورہ ہوا جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ ۲۶ کو دن کے ہوائی جہاز سے ان کی لاش حیدرآباد لے جائی گئی اور شب میں ہزاروں سوگواروں کے ہجوم میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ صرف حیدرآباد کے لوگ ہی نہیں ساری اردو دنیا ان کی سوگوار ہے۔

مخدوم ہمارے صف اول کے شاعروں میں تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی۔ میں حیدرآباد میں مولوی عبدالحق صاحب کے یہاں مقیم تھا۔ مخدوم اس زمانے میں بھی اپنی سحر انگیز نظموں اور سیاسی و ادبی تحریکوں میں گہری دلچسپی کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ شروع سے کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے۔ اپنے مسلک کے لیے انھوں نے بڑی قربانیاں دیں اور بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ برسوں تلنگانہ تحریک کے سلسلے میں روپوش رہے۔ قید و بند کی

سختیاں بھی جھیلیں مگر دیاں کہ ان کے یہاں عقیدے کی پختگی اور کردار کی مضبوطی تھی اس لیے ان کے مزاج کی شگفتگی اور قلب کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ سب سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے نہ کسی پر اپنے سیاسی عقائد ٹھونسنے کی کوشش کرتے تھے نہ کسی پر طنز کرتے تھے، نہ اپنی ہمہ دانی کا رعب ڈالتے تھے نہ ادبی اختلافات کی وجہ سے ذاتی تعلقات پر آنچ آنے دیتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور دانش ور بھی اور بڑے مخلص آدمی تھے۔ مخدوم کی شروع کی نظموں میں خطابت یا بیانیہ انداز خاصا نمایاں ہے، مگر جا بجا سچی اور حقیقی شاعری ملتی ہے۔ شاعری میں معشوق کی اہمیت نہیں ہوتی عاشق کی اہمیت ہوتی ہے محبوب کیسا ہی ہو دیکھا یہ جاتا ہے کہ عشق کیسا ہے۔ اس میں کتنی گرمی ہے، کتنی تڑپ کتنا سوز و گداز اور پھر یہ سوز و گداز شعر بنا ہے یا نہیں۔ تجربہ سچا ہے یا رسمی۔ مخدوم اس لیے اچھے شاعر نہیں تھے کہ وہ کمیونسٹ تھے۔ شاعر کمیونسٹ بھی ہو سکتا ہے، سوشلسٹ بھی، آدرش وادی بھی رومانی بھی، اقبال اور ایلیٹ کے یہاں ایک گہرا مذہبی عقیدہ ہے مخدوم کے یہاں مارکسزم پر گہرا عقیدہ ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ مذہبیت یا مارکسزم کی وجہ سے شاعری بڑی نہیں ہوتی اور بڑی شاعری مذہبی بھی ہو سکتی ہے اور مارکسی بھی۔ یہ وہی سچے عشق کی بات ہے۔ مخدوم نے اسٹالن پر ایک نظم لکھی تھی۔ جب ۱۹۴۱ء میں پہلی دفعہ دہلی ریڈیو سے یہ نظم نشر ہوئی تو سب کو اس نے متاثر کیا۔ اب اسٹالن کے رول کا سبھی کو علم ہو چکا ہے۔ خروشچیف کے بیان کے بعد اور بھی مواد سامنے آچکا ہے۔ مگر مخدوم کی نظم کی اہمیت اپنی جگہ باقی ہے اس لیے کہ یہ نظم ہے تاریخ نہیں ہے۔ اس کی اپنی صداقت ہے۔ اسی طرح فیض کی نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" ایک خوبصورت نظم ہے اور اس کی خوبصورتی کے اعتراف کے لیے یہ ضروری نہیں کہ جولیس اور اتھل روزن برگ کے رول کو بھی درست مانا جائے۔ یہ بھی کچھ عاشقوں کی داستان ہے۔ سرخ سویرا سے گل تر تک اور گل تر سے بساط رقص تک مخدوم کے فن میں بہت ارتقا ہوا۔ انھوں نے "چاند تاروں کا بن" جیسی نظم لکھی جو میرے نزدیک فیض کی نظم "یہ داغ داغ اجالا" کے ساتھ آزادی پر اردو کی بہترین نظم ہے۔ انھوں نے چارہ گر، تلنگانہ، سناٹا جیسی حسین نظمیں لکھیں اور چند نہایت بانکی غزلیں جو غزل کے ہر انتخاب میں ضرور جگہ پائیں گی۔ ان کی آخری دور کی نظموں میں خطابت یا براہ راست اظہار کے بجائے بالواسطہ یا شاعرانہ اظہار ہے۔ ان کے یہاں بڑی غنائیت پائی جاتی ہے۔ ان کی فکر آخر تک جوان رہی۔ انھوں نے اپنے کو دہرایا نہیں۔ وہ جدید میلانات کا خاموش اثر برابر قبول کرتے رہے۔

اور یہ معمولی بات نہیں تھی کہ مخدوم کا شعر پڑھنے کا انداز بڑا دلکش تھا۔ میں نے کشمیر میں ایک مشاعرہ میں ان سے کہا تھا کہ مخدوم تم واقعی جادوگر ہو۔ بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے بچپن میں مجھے قرات سکھائی گئی تھی یہ اس کا فیضان ہے میں نے بلا مبالغہ چالیس پچاس دفعہ مخدوم کو سنا ہوگا نئی نظمیں کم سننے کا اتفاق ہوا زیادہ تر پرانی نظمیں سننے کو ملتی تھیں مگر ہر بار ایک نیا لطف اور نیا کیف محسوس ہوتا تھا۔ مخدوم واقعی سدا بہار تھا اور مرنے کے بعد بھی سدا بہار رہے گا۔ عاشق رخصت ہو جائے پھر بھی اس کا عشق زندہ و تابندہ رہتا ہے۔

سلام شاہدی

تری چشمِ نگراں باقی ہے

میں نہ تو شاعر ہوں نہ نقاد لیکن شعر و ادب سے مجھے ایک رشتۂ موانست ضرور رہا ہے۔ شعر لطیف جذبات کو حرکت میں لانے والی کیفیت کا نام ہے جسے سُن کر یا پڑھ کر انسان کے منہ سے بے ساختہ آہ یا واہ نکل جائے۔ حکایت شب ہجراں ہو یا گھمبیر لفظوں کی تعریف جس کے پیچھے ہزاروں افسانے جنم لیتے ہوں یا وصال جاناں کی آرزو و انتظار میں کٹنے والے کڑے لمحات، غم راحت کی پر لطف اذیت ہو یا وصل کی شادمانی۔ بقول مخدوم ؎

دلوں کی تشنگی جتنی دلوں کا غم جتنا ؎ اسی قدر ہے زمانے میں حسنِ یار کی بات

لیکن شاعر کی اُن داخلی کیفیات، اس کے جذب اندرون و لطیف محسوسات کی گہرائیوں میں پہنچ کر کھو جانا۔ جہاں سے شعر جنم لیتا ہے۔ جتنا پُر کیف ہوتا ہے۔ اسی قدر تڑپا دینے والا بھی — شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے اس سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ اسی وقت سے جب سے میرا شعور جاگ رہا تھا ؎

ز شعرِ شاعرم اے کور دل نظر باز نیست ؎ کہ عشق خیزد از آب و ہوائے کشورِ ما

کے مصداق اشعار کا رسیا رہا ہوں — یہ اس وقت کی بات ہے جب میں بہت کم عمر تھا۔ مجھے اپنے ماموں اور بھائیوں کے ساتھ ایک مشاعرے میں جانے کا اتفاق ہوا اور یہ میری زندگی کا پہلا اتفاق تھا۔ یہ مشاعرہ خیر المبین صاحب کے نئی خانے میں ہو رہا تھا۔ اس مشاعرے میں مجھے کئی شعرا کو سُننے کا موقع ملا اور اسی بیٹھک میں پہلی بار مخدوم کو دیکھنے اور سُننے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس رات مشاعرے میں مخدوم نے اپنے مخصوص اور اثر آفریں ترنم میں کئی نظمیں سنائیں، جن میں ساگر کے کنارے اور انتظار نے بے حساب داد حاصل کی۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ مخدوم ہی کا کلام حاصلِ مشاعرہ رہا۔ اسی وقت سے مخدوم میرے لئے ایک پسندیدہ شاعر ثابت ہوئے اور میں نے بڑے ہی اشتیاق و عقیدت کے ساتھ ان کا کلام پڑھنا شروع کیا۔ سماجی ناانصافی اور فرسودہ روایات کے خلاف مخدوم کے رشحاتِ قلم میرے ہی دل کی آواز محسوس ہونے لگے۔ اور میرے دل میں سماجی ناانصافی اور فرسودہ روایات کے خلاف نفرت و حقارت کا منتظر جوالا مکھی پھٹ پڑا اور مخدوم کے اشعار کشاں کشاں مجھے اس نظریہ اشتراکیت سے قریب کرتے چلے گئے جس سے انسانیت تعبیر ہوتی ہے۔ میں ان ہی کے کلام کی بالواسطہ تحریک پر ترقی پسند ادب سے روشناس ہوا اور پھر آہستہ آہستہ اشتراکی نظریہ مجھے کمیونسٹ پارٹی سے قریب کرتا گیا۔ اور پھر جب میں تنظیم کا ایک رکن بن گیا تو مخدوم میرے نزدیک صرف ایک پسندیدہ شاعر ہی نہیں رہے بلکہ ہماری تحریک کے

ایک کہنہ مشق، عقدہ کشا، پرخلوص اور بے باک مستقل رہنما کی حیثیت سے انہوں نے مجھ پر اپنی شخصیت کا اثر اور بھی گہرا کر دیا۔ مخدوم صرف ہماری تحریک ہی کے ایک مثالی رہنما نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل عوام کے ہر دلعزیز شاعر اور سچے خدمت گذار بھی تھے۔ ان کے مزاج کی شائستگی، بردباری اور اپنے نظریہ اور تحریک سے ان کا خلوص ہی وہ عظیم طاقت تھی کہ ان کے بدترین سیاسی مخالف دوسری سیاسی جماعتوں کے افراد جو مسائل و نظریہ میں ان سے شاید اختلاف رکھتے۔ مخدوم کی شدید تنقیدوں پر چیں بہ جبیں نہ ہوتے اور اس بات کا اعتراف کرتے کہ مخدوم اپنی مخصوص شائستگی اور اپنے مہذب اندازِ تنقید کے باعث اور اپنے بے پناہ خلوص کی وجہ ہمیں کبھی ناگوار نہیں گذرتے اور نہ ہی ان کی اتنی کڑی تنقیدیں ہمارے اشتعال کا باعث ہوتی ہیں بلکہ ہم ان کی تنقیدوں سے سبق بھی حاصل کرتے ہیں۔ آج مخدوم کے ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کے ساتھ عظیم رہبرانہ حیثیت میں اپنے تاثرات کا اظہار ناممکن بھی ہے اور بے محل بھی — اگرچہ کہ ان کی کمی نے تحریک میں ایک خلاء ضرور پیدا کر دیا ہے۔ لیکن ہماری تحریک کا خاصہ یہ ہے کہ یہ تحریک اپنے خلاء کو خود ہی پورا کر لیتی ہے، مخدوم کے آدرشن اور اُن کے اعلیٰ اصول اور بنائے ہوئے راستے ہمیں اسی تیز رفتاری سے آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے رہیں گے۔ بقول علی سردار جعفری کے ؎

موت جب آ کے کوئی شمع بجھا دیتی ہے ؎ زندگی ایک کنول اور کھلا دیتی ہے

مخدوم کی شخصیت بڑی ہمہ گیر تھی وہ وقت واحد میں مزدور رہنما، دانشور، پایہ کے سیاسی قائد اور ایک ہر دلعزیز شاعر بھی تھے۔ اور کمال یہ تھا کہ مخدوم کو عمل سیاسیات اور نوجوان طالب زندہ ذہن تحریک کی لامتناہی مصروف زندگی کو اپنا لینے کے باوجود ان کی شاعری آورد سے بے نیاز آمد ہی کا نتیجہ رہی ہے۔ خود ان کی زبان میں یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا کہ جب بھی وہ عمل سیاسیات اور تحریک میں مصروف رہتے، اُن لمحات میں وہ عالمِ خارج میں رہا کرتے اور جب بھی وہ تنہا ہوتے داخلی عالم میں پہنچ جاتے اور اسی عالم کیف و آمد میں جیسے شعر کہنے پر مجبور کئے جاتے اور پھر شعر معنویت اور پرکاری کے سانچوں میں ڈھل کر جنم لیتے — مخدوم کے کلام سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ وہ تہذیب و جبلت کے حسین امتزاج کو پسند کرتے تھے اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت بھی ہے کہ اگر تہذیب کو جبلت سے علیحدہ کر دیا جائے تو شائستگی ختم اور نری جبلت باقی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح مخدوم محنت اور محبت کا امتزاج چاہتے تھے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ جب مخدوم کی نظر یورپ کے سرمایہ دار ممالک کے غیر متوازن صنعتی ارتقاء کی طرف پڑتی ہے جہاں محنت اور محبت میں کوئی امتزاج نہیں۔ جس کی بدولت انسانی زندگی میں فرار اور بے راہ روی پیدا ہو گئی ہے سماجی ناانصافی اور یہی ناآسودگی چار سو ماتم کناں ہے۔ ان کا حساس دل تڑپ اٹھتا ہے۔ اور وہ ایک تمثیل کے منڈوے تلے محبت کے مٹنے کا المناک نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ جہاں چاند مٹ جاتا ہے اور دو بدن پیار کی آگ میں جل جاتے ہیں اور مخدوم اس غیر متوازن صنعتی ارتقاء سے سوال کرتے ہیں۔ یہ تیا چارہ گر تری زنبیل میں نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟ کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے — محنت اور محبت کے امتزاج کی حمایت کرتے ہوئے کہتے ہیں — صدائے تیشہ کامران ہو کوہکن کی جیت ہو — اور سماجی ناانصافی

اور ناآسودگی کا تجزیہ، وہ یوں کرتے ہیں۔

ہر ایک زخم کے اندر ہے زخم درد میں درد
کہیں گلاب کہیں کیوڑے کی بستی ہے

سماج کی اس کرب، ناآسودگی، گھٹن اور اضطراب کی جسے سرمایہ دارانہ ممالک کے بے ہنگم بے جوڑ اور غیر متوازن صنعتی ارتقا نے جنم دیا ہے۔ اس قدر خوش اسلوبی اور اظہار کی دلنشینی کے ساتھ بہت کم فنکاروں نے عکاسی کی ہے۔ جیسی کہ جیتی جاگتی تصویر مخدوم نے پیش کی۔ اپنی شاعری میں ہو یا نجی زندگی میں، مخدوم کسی بھی صورت میں، روایتی شاعروں کی طرح اپنی سماجی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنا نہیں جانتے۔

مخدوم کی شاعری ہماری سماجی زندگی اور اس کی حقیقتوں کی آئینہ دار ہے۔ وہ ہمیشہ اخلاق، شائستگی، سچائی اور دوسری مثبت روایات کے حامی رہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ بے باک اور حق گو تھے۔ وہ لوگ جو مذہب و اخلاق کو اپنا ٹھیکہ سمجھتے ہیں انہوں نے اپنی عصبیت اور تنگ نظری کی بدولت مخدوم پر نکتہ چینی کی، جب یعنی مخدوم نے سماج کی فرسودہ روایات اور نام نہاد اخلاق کے پردۂ زنگاری کو چاک کر کے استحصال کے بھیانک چہروں کو بے نقاب کیا۔ اسی طرح جس طرح حافظ سے لیکر غالب تک غالب سے لیکر اقبال تک ہر صاحب نظر نے ان فرسودہ روایات پر کڑی تنقیدیں کی ہیں تو ان پر نکتہ چینی کی گئی اور اسی انداز میں جیسی کہ غالب اور اقبال پر کی جاتی رہی۔

مخدوم کی شاعری صرف الفاظ کی الٹ پھیر کا نام نہیں۔ ان کی شاعری صرف لذت آفریں نہیں بلکہ نہایت ہی صحتمند، بامعنی اور ایک اثر دیرا ثر کا کام کرنے والی تحریک بھی ہے۔ میں ان لوگوں کے خیال سے متفق نہیں ہوں جو مخدوم کی ۵۲ سے ۵۸ عیسوی تک کی شاعری کو نعرہ بازی کا نام دینے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ مخدوم کی ابتدائی شاعری سے ان کی آخری دور تک پوری شاعری میں ایک ارتقائی تسلسل ہے۔ غالب کی طرح ان کے کلام میں ہمہ عصریت ہے اوروں کے مقابل مخدوم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر مقصدی اور سیاسی شاعری میں اس کے مزاج و آہنگ کو متاثر کئے بغیر کسی عظیم تحریک کی بالواسطہ نمائندگی کی جائے تو انسانیت اور محنت محبت اور شائستگی محبت اور تہذیب کا دلکش اور پاکیزہ امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ایسی شاعری مر نہیں سکتی بلکہ سماجی زندگی کی آئینہ دار ہو کر باقی رہتی اور ہمہ عصریت کا بلند مقام حاصل کر لیتی ہے۔

مخدوم کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سیاسی نظریہ کو نری نعرہ بازی کے انداز میں کڑ پن کے ساتھ کبھی پیش نہیں کیا بلکہ اثر آفریں اور دل میں اتر کر بس جانے والی بھرپور شعریت کے ساتھ ایسا اثباتی انداز اختیار کیا جو درحقیقت ایک ترقی پذیر آدمی کی فطری خواہش کے مطابق ہے۔ مخدوم کا کلام اپنے مخصوص پرکشش انداز میں بالواسطہ مگر پوری قوت کے ساتھ تحریک کی طرف ذہن کو مائل کر دیتا ہے۔ اور یہی مخدوم کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اور اسی نے انہیں اپنے عہد کے دوسرے شاعروں سے الگ کیا ہے۔ مخدوم عوام سے کتنے قریب رہے ہیں اس کا

اندازہ ان کی نظم "فیدرو" سے ہوتا ہے۔ زندان کی چار دیواری میں محبوس مخدوم کا دل اپنے عوام سے دور نہیں بلکہ وہ ان کے قدموں کی چاپ سنتا ہے، ان کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کرتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے مخدوم کے کشادہ اور بے کراں سینے کی وسعتوں میں دھڑکنے والا دل صرف عوام کے لئے دھڑکنا جانتا دھڑکنا چاہتا ہے۔ اور دھڑکتا رہتا ہے۔ اس کے احساسات خلوص اور اس کی داخلیت کا یہ عالم کہ محبس کی فصیلوں کے اندر رہ کر بھی وہ عوام سے کتنا قریب ہے۔ ان کے قدم بہ قدم، ان کے دوش بدوش۔

سینکڑوں لاکھوں قدم، سینکڑوں لاکھوں عوام
سینکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے انسانوں کے دل

جس زمانے میں تلنگانے کا غریب کسان زمین کے لئے جد وجہد چلا رہا تھا تو تلنگانہ کا نام ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ اس کے باہر بھی چار دانگ عالم میں گونج رہا تھا۔ اس کسان تحریک کی مخدوم عملی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ اور اس سے نیا جوش بھی حاصل کرتے ہیں، اُن جیالے کسانوں کو سلام بھی کرتے ہیں۔ تحریک اور محنت کش طبقات سے ان کے بے پناہ خلوص اور محبت کا اس سے اظہار ہوتا ہے ؎

امام تشنہ لبان خضر راہ آب حیات
اندھیری رات کے سینے میں مشعلوں کی برات
مرا ثبات مری کائنات میری حیات
سلام مہر بغاوت سلام ماہِ نجات
سلام سرخ شہیدوں کی سرزمین سلام
سلام عزم بلند آہنی یقین سلام

قومی تحریک آزادی کے ہیرو وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی وفات پر مخدوم نے جو اشعار لکھے۔ ان کا جو سراپا کھینچا شاید اتنی پرمعنی اور اثر انگیز نذر عقیدت کسی نے پیش کی ہو۔ اخلاص و معنویت کا یہ عالم کہ ہر لفظ اثر میں ڈوبا ہوا، ہر لفظ بولتا ہوا، نہرو کی مکمل آفاقی شخصیت اور ان کی اپنی راکھ کو وطن عزیز کی فضائے بسیط میں بکھیر دینے کی محبت بھری وصیت اور اس کے اثرات سب کچھ ان چند مصرعوں میں منضبط اتنے دلنشین ڈھنگ سے کہ بس اپنی آپ مثال ہے ؎

ہزار رنگ تھے اک خوشبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غبار مشت بہار
ہوا ہے وادئ جنت نشاں میں آوارہ

ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

مخدوم تحریک کی راہ میں عارضی ناکامیوں رکاوٹوں کی سنگلاخ چٹانوں سے کبھی نہ خود مایوس ہوئے اور نہ ساتھیوں کو ہونے دیا وہ ہمالیہ کی بلندیوں پر چڑھ جانے کا حوصلہ خود بھی رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی پیٹ ٹھونک کر جوش دلا کر آگے بڑھاتے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کوہِ غم اور گراں اور گراں اور گراں
عمزدو تیشہ کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

راستے کا اعتماد منزل تک پہنچنے کا ایقان اتنا اٹل اور اتنا اٹوٹ۔

منزلیں عشق کی آسان ہوئیں چلتے چلتے ۔ اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

روز ہو جشنِ شہیداں وفا چپ نہ رہو۔

بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو ۔ چپ نہ رہو

مخدوم رُکنے کے قائل نہیں، ایک ہی پیام ہے بڑھو اور بڑھتے چلے جاؤ۔

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا اجالا بھی ہے

ہمدمو ———

ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

ہر قدم پر ہر حملہ کے جواب میں تازہ دم ہو کر کہتے ہیں

ابن آدم کو سولی چڑھاتے رہو ؛ زندگی سر دار گاتی رہے
ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسم ہیں ندیم ؛ مسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے
خیر ہو حق کی صداقت کی جہاں بانی کی ؛ اور اونچی ہوئی صحرا میں امیدوں کی صلیب

قدم قدم یہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں ⁂ سفر کٹھن ہے دمِ شعلہ ساز ساتھ رہے

مخدوم کی شاعری میں "موت کا گیت" کو ان کے بعض ہم عصر یا نقادوں نے نعرہ بازی یا پھر دہشت پسندی سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے میں قطعاً متفق نہیں ہوں۔

ع "آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں"

دراصل اس مصرعہ میں سماجی ناانصافی ظلم و زیادتی کے خلاف نفرت و حقارت اور انسانی فلاح و خوشحالی کے لیے اس فرسودہ نظامِ حیات کے خلاف بغاوت کا اثر ابھرتا ہے۔ کرۂ ناپاک کو بھسم کرنے سے مراد سماجی ناانصافی کو ختم کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس گیت کا اختتامی مصرعہ اس فرسودہ سماج کی بنیاد اکھیڑ کر ایک نئے اور خوشحال سماج کی تعمیر کا ایک آفاقی اور عظیم تصور پیش کرتا ہے۔ ع کاش دہر کو معمور کرم کر ڈالیں۔

دورِ ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
روحِ انسان کو آزاد کیا جائے گا

ایک نئے خوشحال سماج کی تعمیر کا پاکیزہ تصور اتنی بے حساب محبت اور بے اندازہ خلوص سے معمور ہے کہ اس پورے گیت پر مرکزِ خیال کی حیثیت سے انسانیت سے محبت اور اس کی خوش حالی و آزادی کا تصور محیط اور چھایا ہوا ہے۔ جن لوگوں کو "موت کا گیت" میں نعرہ بازی یا دہشت پسندی نظر آتی ہے وہ اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ مخدوم ہی کی ایک نظم "جنگِ آزادی" تحریکِ آزادی کے مقبول ترین گیت کی حیثیت سے پڑھتے ہوئے بھی کرختگی یا نعرہ بازی یا دہشت پسندی کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوا۔ صرف اس لئے کہ قومی آزادی کے متوالوں کا شعور انگریز سامراج سے ان کی نفرت و حقارت کے جذبات راس کماری سے کشمیر تک آسام سے گجرات تک اسے قبول کرنے اس سے ایک نیا جوش حاصل کرنے کی پختگی کے حامل ہو چکے تھے۔
سماجی زندگی کی صحیح ترجمانی اور عصرِ حاضر کے نئے اور بدلتے ہوئے تقاضوں سے مطابقت رکھنے والی شاعری متوازن طریقے سے اپنے ارتقائی مدارج بھی طے کرتی رہتی ہے۔ اور یہی حال مخدوم کی شاعری کا ہے۔ چنانچہ مخدوم کے کلام میں سرخ سویرے سے گلِ تر تک اور گلِ تر سے بساطِ رقص تک۔ اس عہد کے تقاضوں کے عین مطابق ایک متوازن ارتقائی تسلسل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ منزل بہ منزل ان کی زبان ان کے بیان کی ندرت اور اشاریت اور بھی نکھرتی چلی گئی ہے۔

"ہر گلی کوچے میں مرگِ ناگہاں کے رقص" کے خلاف جہاد کرنے والا مخدوم خود مرگِ ناگہاں کا شکار ہو گیا۔ بلا شبہ اس کی رحلت نے ہماری اجتماعی زندگی اور داخلی تنہائی میں سناٹا پیدا کر دیا ہے لیکن اسی کے الفاظ میں ؎

دلبری باقی ہے دلداریٔ جاں باقی ہے
تو نہیں ہے تری چشمِ نگراں باقی ہے

اصغر وجاہت

مخدوم خواص و عوام کا شاعر

مخدوم مزدور رہنما تھے، شاعر تھے، انسان تھے اور یہ کہنا مشکل تھا کہ ان تینوں حیثیتوں میں ان کی کون سی حیثیت سب سے زیادہ بلند تھی۔ شاید یہ کہنا آسان ہو کہ ان میں کوئی بھی حیثیت معمولی نہ تھی۔ مخدوم عوام کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری آمد تھی آورد نہیں، سارے ملک کے مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں کا نعرہ بن جاتی تھی۔

مخدوم کو ان کے دوست سبط حسن نے کبھی لکھا تھا "تم کو معلوم ہے کہ تمہاری کون سی نظم ہے جس نے تم کو ہندوستان کے عوام کا محبوب اور مقبول شاعر بنا دیا ہے۔ لاکھوں مزدوروں اور کسانوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس نظم کا لکھنے والا کون ہے؟ لیکن جلسوں کی جو روداد ہمارے اخبار میں شائع ہونے کے لیے آتی ہیں ان میں اکثر لکھا ہوتا ہے کہ جلسے کی کارروائی "جنگ آزادی" سے شروع ہوتی ہے جسے پانچ لڑکوں کے ایک ٹولے نے یا دس لڑکیوں کی ایک ٹولی نے گا کر سنایا۔ شاید نامہ نگار کو بھی اس کی خبر نہیں کہ یہ نظم مخدوم کی ہے۔ قبول عام کا یہ درجہ ہماری ادبی تنقیدوں پر بھاری ہے۔"

بقول رضیہ سجاد ظہیر کے مخدوم کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ نوجوانوں سے لے کر بوڑھوں تک حیدرآباد میں انہیں کو دیکھئے ان کے متعلق ... بنا لیا ہے۔ مخدوم کی محبت پر ... ہر سال ... جب وہ ایک نئی غزل یا نظم لکھتے ہیں تو ... اشعار زبانی یاد کر لیتا ہے۔"

سنا ہے ایک زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی لڑکیوں میں مخدوم کے نام کی لاٹری پڑا کرتی تھی۔ حیدرآباد کے ایک گرلس کالج نے بھی مخدوم کے لیے ہفتہ کا ایک یوم مقرر کر لیا ہے۔ اس دن مخدوم کی باتیں ہوتی ہیں اور ان کی شاعری کھول کر تعارف ہوتا ہے۔

مخدوم نے ۱۹۳۲ء میں شاعری شروع کی تھی۔ ان کی پہلی نظم "پیلا دوشالہ" ایک مزاحیہ نظم تھی۔ یہ نظم انہوں نے اپنے ایک دوست کا دوشالہ کھو جانے پر لکھی تھی۔ اسی نظم سے مخدوم کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں مخدوم کی نظموں کا پہلا مجموعہ "سرخ سویرا" شائع ہوا جس میں زیادہ تر نظمیں رومانی ہوتے ہوئے بھی انقلابی تھیں۔ مخدوم کا دوسرا مجموعہ "گل تر" ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی نظموں میں سماجی ظلم کے خلاف غصے کا اظہار تھا۔ "گل تر" کی جو نظمیں زیادہ مقبول ہوئیں وہ ہیں "قید" اور

"آج کی رات نہ جا"۔ "چارہ گر" کی مقبولیت نے بمبئی کے کئی مشہور ڈائرکٹروں اور فلم سازوں کو مخدوم کو فلم میں لینے کے لیے
کیا لیکن وہ اپنی سیاسی زندگی سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے فلموں میں گانے لکھنا منظور نہ کیا
مخدوم کی نظم "جانے والے سپاہی سے پوچھو" کو بمل رائے نے اپنی فلم "اس نے کہا تھا" میں استعمال کیا۔ ان کی دو
نظم "چارہ گر" دیوآنند اپنی ایک فلم میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بعد میں اس نظم کو خیدر شنکیو نے چا چا میں استعمال کیا۔"
کی نظم "قید" مخدوم نے جیل میں لکھی تھی اور انہوں نے اپنی یہ نظم سب سے پہلے جیل کے چوکیدار رحم خاں کو سنائی۔ چوکیدار بولا "صا
یہ نظم تو آب زر سے لکھی جانے والی ہے"۔ اور خوش ہو کر اس نے مخدوم کو خوش ہو کر بیڑی پلائی۔

انسانی محبت مخدوم کی ساری زنجیریں کاٹ دیتی تھی۔ دہلی کی ایک چھوٹی سی نشست میں مخدوم نے اپنی نظم "انتظار"
تو ایک لڑکی اس سے بہت متاثر ہوئی اور اس نے بعد میں مخدوم سے کہا وہ یہ نظم اس کے عاشق کو سنائیں جو دہلی سے تین سو
دور انبالہ میں رہتا ہے۔ دوسرے دن مخدوم اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر لڑکی کے عاشق کو ٹیلی فون پہ یہ نظم سنانے پہنچ گئے۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

مخدوم کا تیسرا اور آخری مجموعہ "بساطِ رقص" ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ ان نظموں میں ان کا دکھ اور اندرونی درد اور گہ
کر سامنے آگیا۔ اس کی خاص وجہ ۱۹۶۲ء کے بعد ملکی اور بین الاقوامی پیمانہ پر کمیونسٹ تحریک کا منتشر ہو جانا تھا۔ مخدوم نے اپنی
زندگی ترقی پسند اور بائیں بازو کی طاقتوں کو یکجا کرنے میں صرف کر دی۔ اس تحریک کو اس طرح ٹوٹتی دیکھ کر افسوس لازمی تھا
اپنے اس اندرونی دکھ کے باوجود مخدوم عوامی تحریکوں اور سیاست کی چہل پہل سے دور نہیں ہٹے۔

وہ آدمی تھا مگر . . . .

عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست"

مخدوم ـ ایک نیک نفس انسان ایک مخلص دوست

یہ مضمون انجمن ترقی اردو اور اردو مجلس کی جانب سے منعقدہ
تعزیتی جلسہ میں سنایا گیا تھا

مخدوم محی الدین صاحب کے انتقال پر پچھلے چار پانچ دن سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے ان کی زندگی، کردار، اور صفات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا اور چھپا ہے۔ آج جب مخدوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں یہ خیال ذہن میں ابھر آتا ہے کہ جس شخص نے بہتر سماج اور عوام کی خوشحالی کے لیے زندگی بھر جدوجہد کی اس بے غرض اور مخلص شخص نے اپنے اور اپنے خاندان کے لیے کیوں کچھ نہیں کیا۔ آج یہی بات ان کی ایک بہت بڑی خوبی بن گئی ہے کہ عوام کے اس مخلص خادم نے صرف عوام کی خدمت کو اپنا مقصد حیات قرار دیا اور ان ہی مسائل پر غور و خوض کرنے کی غرض سے دلی میں منعقدہ کانفرنس میں شرکت کے دوران اپنی جان دی۔

مخدوم اور سیاست کے روابط کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ مخدوم نے چند ہی دن پہلے اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ سیاست کا مطالعہ میری زندگی کی لازمی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اسی مکتوب میں لکھا تھا کہ بعض موقعوں اور مسائل پر مجھے سیاست کی رائے سے اختلاف رہا ہے لیکن اس اختلاف کے باوجود سیاست سے دلچسپی اور اشتراک ان کے جمہوری مزاج کا ایک اہم ثبوت ہے۔

مخدوم سے میری ملاقات تقریباً ۳۰ سال پہلے ہوئی۔ میں مدرسۂ عالیہ سے نکل کر یونیورسٹی میں شریک ہوا تھا۔ اس وقت یونیورسٹی کے ماحول پر جناب مخدوم، اشفاق، میکش، نظر، نیازی، وغیرہ جیسے شاعروں کا اثر تھا۔ شعر و ادب کے اس ماحول میں آنے سے مجھ پر بھی مخدوم کی شاعری کا اثر پڑنے لگا۔ اور یہ اتنا گہرا ہو گیا کہ جب یونیورسٹی سے باہر نکلا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی معتمدی کئی سال تک مخدوم نے میرے تفویض کی۔ اس تعلق سے مخدوم سے میرے روابط دوستی سے بڑھ کر

برادرانہ ہو گئے۔ میری ادبی زندگی کی تعمیر ان کی اس صحبت اور رفاقت کی رہین منت ہے۔ مخدوم ایک بے غرض دوست تھے اور ان کی یہ بے غرض دوستی کسی سے استوار ہونے کے بعد محسن کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی لیکن اپنے دوستوں کے ساتھ خاموش انداز میں بڑے بڑے احسانات کر کے کبھی بھی کسی موقع پر انھوں نے احسان نہیں جتایا۔ مخدوم کی شخصیت کا اثر مجھ پر روز بروز گہرا ہوتا ہی گیا۔ دوسری جنگ کے دوران بمبئی میں منعقدہ پہلی کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لیے مخدوم کے ساتھ بمبئی گیا اور اسی کانفرنس میں سجاد ظہیر، کیفی اعظمی، سردار جعفری، ڈاکٹر [illegible]، عصمت چغتائی کرشن چندر سے مخدوم نے مجھے متعارف کرایا۔ اس واقعہ سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ترقی پسند خیالات اور تحریکات سے نوجوانوں کو متعارف کرانے میں مخدوم کا کتنا اہم اثر رہا ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ گزشتہ ۳۰۔۳۵ سال میں جس شاعر نے عوام پر جو گہرا اثر چھوڑا ہے وہ صرف مخدوم محی الدین ہی ہیں۔ یہ بات معمولی نہیں کہ ایک شخص عوام کو اتنا متاثر کرے۔

حیدرآباد کے ترقی پسند ذہنی انقلاب میں مخدوم کا بہت بڑا حصہ ہے۔ [illegible] بہت بڑے [illegible] کی حیثیت ان کی خدمات جو مسلمہ ہیں لیکن ان کی تحریک اور زندگی کا جو اثر نوجوانوں پر پڑا ہے وہ اس سرزمین کی ذہنی ترقی کی تاریخ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اپنے اس وصف اور اعزاز کے باعث مخدوم حیدرآباد کے اس دور کے دانشوروں میں ہمیشہ ممتاز رہیں گے اور ہمارے دلوں میں ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔

مخدوم سے دوستی اور ان سے قربت کا ذکر کرتے ہوئے دو شخصی واقعات آپ کے سامنے پیش کروں گا جن سے ان کے صاحب کردار اور بےلوث ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ دو سال ہوئے... مخدوم ایک دن اچانک [illegible] میرے دفتر آئے اور کہا کہ آج میں آر ٹی سی یونین کے صدر کی حیثیت سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اصلاح کے ایجنٹوں کو کسی دن اخبار نہ ملے تو آپ آر ٹی سی سے شکایت کرتے ہیں اور اس شکایت پر کنڈکٹر کی تنخواہ سے اخبارات کی قیمت جرمانہ کے طور پر وصول کی جاتی ہے۔ غریب کنڈکٹر ان جرمانوں کو برداشت نہیں کرسکتے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک خاص راستے پر جس قدر ایجنٹس تھے انھیں اکثر اخبار نہیں مل رہا تھا۔ شکایت کنندگان کے باوجود اس شکایت کا انسداد نہیں ہو رہا تھا چنانچہ مجھے محکمہ آر ٹی سی کے صدر نشین کو اس خصوص میں متوجہ کرنا پڑا۔ اصلاح اخبارات کی تاخیر کی [illegible] کم نہ ہوسکا چنانچہ مجبوراً [illegible] کے متعلق [illegible] شکایت [illegible] تعلق [illegible] کرایا اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اخبار کی قیمت سے زیادہ خریدار [illegible] مخدوم نہیں تھے بلکہ میرے دوست تھے بلکہ ایک ٹریڈ یونین لیڈر کی حیثیت سے [illegible] مخدوم نے [illegible] کو حکم بنایا اور اس معاملہ کو ان پر چھوڑ دیا۔ اس دور کے بعد [illegible] دونوں [illegible] بھی ختم ہو گئی۔۔۔۔

دوسری مثال بھی سن لیجیے۔ مخدوم [illegible]

ایک بڑی آرٹسٹ نے غالب کی غزل کی بجائے کوئی گیت شروع کیا تو مخدوم نے اس پر پہلے اعتراض کیا اس کے باوجود دوسری مرتبہ گیت شروع ہوا تو مخدوم نے کچھ بھڑکتے ہوئے ہال سے یہ کہتے ہوئے واک آوٹ کیا کہ یہ غالب کو کوئی خراج تحسین نہیں ہے۔ بہت لوگوں کو مخدوم کی اس رائے سے اتفاق نہیں تھا۔ یہ مخدوم کی شخصیت اور کردار کی بلندی ہے جس کے باعث وہ ہم سب کا محبوب رہا۔

مخدوم کی ادبی اور شاعرانہ عظمت کے بارے میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں گا۔ تین سال پہلے ہم نے جشن مخدوم منایا۔ باہر سے کئی ادیب و شاعر اس جشن میں حصہ لینے آئے تھے۔ ہندوستان کے ریڈیو کے شاعروں اور ادیبوں کو سخت شکایت تھی کہ انہیں جشن میں انہیں کیوں مدعو نہیں کیا گیا۔ بیدی [illegible] سے ناراض بھی ہو گئے تھے، جگن ناتھ آزاد اور فراق صاحب نے کہا کہ وہ اپنے خرچ سے اس جشن میں شرکت کرنے کے آرزومند تھے۔ پاکستان سے بھی کئی دوستوں اور ادیبوں نے بے پناہ [illegible] اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مخدوم کی شخصیت اور اس کے فن کے گرویدہ عوام ہی نہیں [illegible] بھی ہیں۔ جب کبھی حیدرآباد میں کوئی ادیب، شاعر، دانشور آتا تو مخدوم سے اس کا ملنا لازمی تھا۔ مخدوم [illegible] ملاقات میں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ کئی عوامی ادبی علمی صحبتوں میں مخدوم ہمارے ساتھ رہے لیکن کبھی بھی اپنے اصولوں سے نہیں ہٹے۔ ادبی ٹرسٹ اور اس کے مشاعروں کے سلسلے میں مخدوم سے اختلاف رہتا لیکن وہ اپنی رائے کے اظہار کرنے کے بعد اجتماعی رائے کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے۔

مخدوم کئی ادبی و تعلیمی امور و مسائل میں رہنما کی حیثیت سے کام کرتے تھے اب وہ نہیں رہے ان کی کمی ہمارا ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اس سے زیادہ مجھے یہ فکر ہے کہ حیدرآباد کی ادبی تحریکوں اور اجتماعات میں اب مخدوم کی جگہ کون مشورے دے گا۔ آج ہم مخدوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ایسا خراج عقیدت تو کئی شہروں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ آج شام بمبئی میں خواجہ احمد عباس کی صدارت میں جلسہ مقرر ہے لیکن حیدرآباد کے اردو دوستوں اور دانشوروں کو یہ سوچنا ہے کہ قرارداد تعزیت ہی مخدوم کو ہمارا خراج عقیدت نہیں ہو سکتی۔ ہمیں مخدوم کو ایسا خراج عقیدت پیش کرنا ہے جس سے اس کے فکر و فن اور اس کی خدمات کی یاد نہ صرف تازہ رہے بلکہ اس کا جو ادھورا کام تھا آگے بڑھے۔ اس پر غور کرتے ہوئے ہمیں مخدوم کے کام اور اس کے نام کو برقرار رکھنا ہوگا۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے مخدوم کے انتقال کی خبر ملتے ہی مجھے فون کیا اور کہا کہ مخدوم نے نیک نفس پایا تھا۔ مخدوم کے مرنے کے بعد اس کی نیک نفسی پر ڈاکٹر لطیف کا فوراً خیال گیا۔ ان کا یہ پیام تعزیت میرے لیے مستقل غور و فکر کا موضوع بنا ہوا ہے کہ مخدوم کتنا نیک نفس، مخلص، راست باز اور سچا انسان تھا۔ اس نے کبھی کسی در[illegible] آزادی نہیں کی۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس کا درد کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہوا۔ لیکن زمانے کے درد کو اس نے اپنے دل میں سمو لیا اس کی یہی خوبیاں ہمیشہ روشن رہیں گی۔ خدا مخدوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

سیّد محمد مہدی

مخدوم

چند یادیں

۴۱ یا ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ کانپور میں طلبا کی صوبائی کانفرنس ہونے والی تھی۔ ان دنوں کانپور کی سیاسی زندگی میں طلبا کی یونین نے بڑا اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ اندرا گاندھی جو ان دنوں اندرا نہرو تھیں اور ابھی ابھی ولایت سے واپس آئی تھیں کانفرنس کا افتتاح کرنے والی تھیں۔ مجھے کانفرنس کے کام سے لکھنؤ جانا پڑا۔ لکھنؤ میں نوجوان اور انقلابی شاعروں کا اجتماع تھا۔ اب تک جن شاعروں کی نظمیں ہم رسائل میں پڑھ پڑھ کر جوش اور زندگی حاصل کرتے تھے وہ سب کے سب لکھنؤ میں جمع تھے۔ میں نے تقریباً سب ہی کو کانپور آنے کی دعوت دے دی۔ کانپور مزدور تحریک کا گہوارہ تھا۔ انقلابی شاعر وہاں نہ آئیں گے تو اور کہاں جائیں گے۔ اور پھر کانپور لکھنؤ سے اتنا قریب بھی تو ہے۔ تقریباً سب ہی نے آنے کا وعدہ کر لیا۔

میں کانپور واپس آ گیا اور دوستوں کو خوشخبری سنا دی کہ اردو کے سارے چوٹی کے شاعر ہماری کانفرنس میں آ رہے ہیں لیکن یونین کے دفتر میں کوئی اطلاع نہ آئی۔ لکھنؤ سے آنے والے نمائندے کوئی خبر نہ لائے۔ کانفرنس شروع ہو گئی۔ پریڈ گراؤنڈ کا میدان طلبا سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں کانفرنس کی کارروائی شروع کرانا چاہتا تھا کہ دفعتاً میری نظر مخدوم پر پڑی۔ لکھنؤ کے مشاعرے میں مخدوم سب شاعروں سے الگ نظر آ رہے تھے۔ پکا سیاہ رنگ، سفید چمکتے ہوئے دانت، مسکراتی ہوئی شریر آنکھیں، بڑے بڑے بال جنھوں نے گردن پر اچھا خاصا جوڑا بنا لیا تھا۔ لکھنؤ سے بالکل مختلف قسم کی شیروانی، دلکش ترنم اور کمال یہ کہ آزاد نظم بھی ترنم سے پڑھ رہے تھے۔ مخدوم کو ایک مرتبہ دیکھ کر بھولنا ممکن نہیں تھا۔

کانفرنس کے پنڈال میں مخدوم پیچھے کی ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچا۔ کوئی اور بھی آیا ہے؟ نہیں میں اکیلا ہی آیا ہوں۔ چلو غنیمت ہے کہ ایک شاعر تو آ گیا۔ تو نظم پڑھیے گا نا؟ ہاں ہاں ضرور۔ کانفرنس کا افتتاح مخدوم کی نظم سے ہوا۔ مجھے یاد ہے مخدوم نے اپنی نظم "حویلی" پڑھی تھی اور میں ڈائس پر بیٹھے ہوئے ان لوگوں کو اس نظم کے سمبل

سمجھا رہا تھا جو ان دونوں سے زیادہ واقف تھے۔ پھر تقریریں شروع ہوئیں، قراردادیں منظور ہوئیں، رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی جب ہم لوگ کانفرنس کا پہلا اجلاس ختم کر کے یونین کے دفتر پہنچے۔ سردی کا زمانہ تھا۔ باہر سے آئے ہوئے کچھ نمائندوں کا یونین کے دفتر ہی میں سونے کا انتظام کرنا تھا۔ لیکن وہاں کوئی صاحب پہلے ہی سے کمبل تانے سو رہے تھے اور اس طرح سو رہے تھے کہ ہم لوگوں کے شور کے باوجود نہ جاگے۔ سونے کی شان یہ تھی کہ کمبل سے سر اوڑھ لیا تھا اور اس کا کچھ حصہ ایک اینٹ پر رکھ کر اسے تکیہ بنا لیا تھا۔ یہ تو صبح پتہ چلا کہ یہ صاحب مخدوم تھے جو نہ جانے کتنی مزدور بستیوں کا چکر لگانے کے بعد تھک کر یونین کے دفتر میں سو رہے تھے۔ صبح ہم نے لکھنؤ سے کانپور تک کا کرایہ دینے کی کوشش کی لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں تو کانپور کی مزدور بستیوں کو دیکھنے آیا تھا۔ وہ کانپور سے کب روانہ ہو گئے ہم لوگوں کو کوئی علم نہ ہو سکا۔

کمیونسٹ پارٹی اپنی تنگ نظر پالیسی کے حلقے سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بی ٹی رندیوے کی لائن کو شکست ہو چکی تھی۔ تلنگانہ کی مسلح تحریک واپس لی جا چکی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اس کی حاصل کی ہوئی کامیابیوں کو محفوظ کس طرح رکھا جائے۔ میں نے حیدرآباد میں مخدوم کے بارے میں عجیب و غریب قصے سنے تھے۔ کئی لوگ قسمیں کھا کر بیان کرتے تھے کہ ہم نے تلنگانہ کے فلاں گاؤں میں مخدوم صاحب کو بندوق اٹھائے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر جیپ گاڑی سے دوسری جگہ پہنچے تو وہاں بھی مخدوم صاحب کو دیکھا۔ ایک ہی وقت میں مخدوم لوگوں کو کئی جگہ نظر آنے لگے تھے۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ مخدوم صاحب کسی بڑی فوج کی رہنمائی کر رہے ہیں جو عنقریب انھیں آزاد کرانے کے لیے آ جائے گی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مخدوم گرفتار ہو گئے ورنہ لوگوں نے انھیں کراماتی پیر بنا ڈالا ہوتا۔ مخدوم ان دنوں حیدرآباد کے مضافات میں روپوش تھے اور اسی روپوشی کے زمانے میں انھوں نے مجھے بلا بھیجا۔

ہر قسم کی احتیاط برتتا ہوا ایک رفیق کے ساتھ میں بادھو بھائی سے کہیں مخدوم کا ان دنوں نام تھا ملنے پہنچا۔ چند برس پہلے بمبئی میں کئی بار ان سے ملاقات ہو چکی تھی لیکن آج مخدوم میں مجھے بڑا فرق نظر آیا۔ یہ فرق اس لیے نہیں تھا کہ انھوں نے مونچھیں بڑھا لی تھیں۔ روپوشی کی زندگی کی صعوبتیں چہرے پر لکیروں کی شکل میں نمایاں تھیں۔ آج وہ بات بات پر لطیفے بھی نہیں تھے۔ بہت دیر تک مجھ سے سوال کرتے رہے کہ بمبئی میں کیا ہو رہا ہے۔ تنگ نظری کی لائن کے خلاف جدوجہد میں کون لیڈر کس طرف ہے۔ خود آندھرا کے لیڈروں میں کتنا شدید اختلاف تھا اس کا انھیں ذاتی تجربہ تھا اور ایک بے چینی سی تھی کہ اس بحران میں پارٹی کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ اس وقت اور اس کے بعد نہ جانے کتنی بار اور میں نے یہ محسوس کیا کہ مخدوم کے ذاتی غموں میں ایک غم اور شاید سب سے بڑا غم یہ تھا کہ دنیا میں اور ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک کے ٹکڑے ہو گئے اور وہ خواب کچھ بکھر سے گئے جو کبھی مستقبل کے بارے میں دیکھے تھے۔ لیکن وہ اس خواب کو سینے سے لگائے رہے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ سیاسی بحث کے وقت مخدوم بڑی شدت کے ساتھ ان لوگوں کی مذمت کیا کرتے تھے جن کی وجہ سے کمیونسٹ تحریک میں انتشار آیا تھا اپنے خاص انداز میں ان کا مذاق اڑاتے اور اپنے نظریہ، اپنے طریقے کی صحت پر اصرار کرتے تھے لیکن شام کو چند دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر ان کے دل میں وہ درد ابھرتا تھا جو ہم سب کا درد تھا۔ اب ذکر کسی کی غلطی کا نہیں صرف اس غم کا ہوتا تھا

جس نے مخدوم سے کہلایا تھا :-

لاکھ دل ہوتے تھے لیکن
جب دھڑکتے تھے تو اک دل کی طرح
جب مچلتے تھے تو اک دل کی طرح
جب سُلگتے تھے تو اک دل کی طرح
جب مہک اٹھتے تو دنیا کا مہک اٹھتا تھا دل
والگا کا، یانگسی کا، نیل کا گنگا کا دل
آپ میں اک گرمیٔ احساس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی
چاندنی سی مرے دل کے پاس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی

۵۴، ۵۵ء کا ذکر ہے جب مخدوم دہلی میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے دفتر میں کام کر رہے تھے۔ بمبئی اور حیدرآباد کی خاک چھان کر میں بھی دہلی آ گیا تھا۔ ہمارے ایک اور عزیز دوست منیش سکسینہ بھی ان دنوں دہلی میں تھے۔ مشکل ہی سے کوئی شام ہوتی ہوگی جب ہم تینوں کناٹ پلیس کے ایک ریستوراں میں بیٹھ کر گپ نہ مارتے ہوں۔ ایک دن مخدوم کا ٹیلی فون آیا۔ نئی غزل دیکھی ہے؟ میں نے کہا نہیں بھی تو نہیں دیکھی۔ مجھے کچھ تعجب سا ہوا کہ مخدوم کی وہ کون سی غزل ہو سکتی ہے جو میں نے اب تک سنی نہ ہو اور جو کسی اخبار میں چھپ گئی ہو۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوال کرتا مخدوم نے کہا اچھا تو منیش کو اطلاع کر دینا شام کو وہ غزل ہو گی۔

شام کو حسب معمول ہم تینوں اسی ریستوراں میں پہنچ گئے۔ مخدوم کو تعجب تھا کہ ہم دونوں نے وہ غزل ہی نہیں پڑھی۔ مگر وہ شائع کہاں ہوئی ہے؟ پارٹی کے اردو اخبار میں۔ مگر اس ہفتے تو فیض کی غزل شائع ہوئی ہے۔ ہاں ہاں اور کس کی غزل۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ فیض کی غزل سنانے کی تیاری تھی۔ اسی دن فیض کی وہ مشہور غزل شائع ہوئی تھی ع

لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

معلوم ہوا کہ صبح سے وہ غزل مخدوم پر طاری تھی، دیر تک اس کی دھن بناتے رہے تھے۔ جب غزل دھن میں ڈھالی تو ڈاکٹر احمد کی لڑکی سلیمہ کو اس کی دھن سکھاتے رہے۔ ریستوراں میں کچھ شور تھا لیکن مخدوم وہ غزل سناتے رہے۔ ایک بار نہیں، دو بار نہیں مسلسل سناتے رہے۔ اس دھن میں شام کا سارا درد کھنچ آیا تھا۔ مخدوم سُریلے تو تھے ہی لیکن مجھے اس رات پہلی بار احساس ہوا کہ یہ شخص اچھا میوزک کمپوزر بھی ہو سکتا ہے۔ معلوم نہیں کہ سلیمہ کو وہ دھن یاد ہے یا نہیں لیکن میرے دماغ میں تو وہ آج

تک گونج رہی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ میں بے سُرا ہوں اور کسی کو نہیں بتا سکتا کہ وہ دھن کیا تھی، مخدوم اس شام صرف وہ غزل گاتے رہے۔ اس شام ہم لوگوں نے اور بات نہیں کی۔ شام رات میں ڈھل گئی۔ ریستوران بند ہونے کا وقت آگیا لیکن مخدوم ابھی وجد کی کیفیت سے نکلے نہیں تھے میں نے کبھی اس شخص کو خود اپنی کوئی نظم، اپنی کوئی غزل اس طرح ساری شام پڑھتے یا گاتے نہیں سنا تھا۔ مخدوم اب چلو ریستوراں بند ہونے والا ہے۔ لیکن مخدوم اٹھنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ غم کی شام ابھی بہت باقی تھی۔ ریستوراں کے منیجر ہم لوگوں کے پاس آئے اور خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ مخدوم کو پہچانتے ہیں اور ان کے پرستار ہیں۔ ہم لوگوں کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ مخدوم صاحب کچھ سنایئے۔ ہاں ہاں ضرور۔ پھر وہی غزل شروع ہو گئی۔

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے — لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

مقطع پر سردار صاحب کچھ چونکنا ہوئے۔ لیکن یہ تو . . . ؟ جی ہاں یہ فیض کی غزل ہے۔ تو کوئی اپنی غزل بھی سنا دیجئے۔ نہیں سردار جی آج تو ہم صرف فیض کی یہ غزل سنائیں گے، اور یہ کہہ کے وہی غزل پھر شروع کر دی۔

رات بھیگ چکی تھی۔ کناٹ پلیس میں سناٹا تھا۔ ہم لوگ پیدل آصف علی روڈ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ہم دونوں بے سُرے مخدوم کی بنائی ہوئی دھن میں فیض کی غزل گانے کی کوشش کر رہے تھے اور مخدوم بڑی سنجیدگی سے ہمیں وہ دھن سکھا رہے تھے۔

نہ جانے لوگ یہ کیوں کہتے ہیں کہ کوئی شاعر اپنے کسی ہم عصر شاعر کی تعریف نہیں کر سکتا۔ اس شام کے بعد کم سے کم میں یہ نہیں کہہ سکتا۔

. . .

مخدوم جب کبھی دلّی آتے تھے تو میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ انہیں اچھا گانا سنوایا جائے کیونکہ یہ میرا عقیدہ اور تجربہ ہے کہ اچھے گانے سے بہتر روحانی غذا اور کوئی نہیں ہے۔ سب سے پہلے میں نے انہیں نینا دیوی اور حفیظ خاں کا گانا سنوایا تھا جہاں مخدوم کو اپنا وہ زمانہ یاد آگیا جب وہ خود ستار بجاتے تھے۔ اس کے بعد تو دلّی آتے ہی پہلا سوال یہ ہوتا تھا اس بار کس کا گانا سنوا رہے ہیں؟ انہیں یہ بات بہت پسند تھی کہ یہاں ہم لوگوں نے ایسے حلقے اور ادارے بنا رکھے ہیں جہاں اچھا گانا سنا جا سکتا ہے۔ ان کی اس خواہش کے تحت یہ پروگرام طے ہوا تھا کہ "راگ رنگ" کی محفل میں ضرور چلیں گے جہاں شرافت گانے والے تھے۔

شیلا دھر کے گھر پران کے استاد پران ناتھ کا گانا تھا۔ خسرو نے ٹیلی فون کیا کہ ضرور آؤ۔ میں نے کہا مخدوم بھی شہر میں ہیں، بلکہ سامنے بیٹھے ہیں۔ چلیے سارا پروگرام ہی بدل گیا۔ طے یہ ہوا کہ پران ناتھ کا گانا تو سنا ہی جائے گا لیکن اس کے بعد مخدوم کے ساتھ محفل بھی جمے گی۔ چنانچہ محفل جمی لیکن آج مخدوم شعر پڑھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ایک ہی دن پہلے ایک مشاعرے سے واپس آئے تھے اور بار بار کہہ رہے تھے کہ اب چھ مہینے تک شعر کے نام سے متلی ہوتی رہے گی۔ لیکن اصرار بڑھتا گیا تو پوچھنے لگے کیا سناؤں۔ میں نے کہا وہی 'چاند تاروں کا بن'۔ نظم کے بعد اور اصرار ہوا لیکن مخدوم ٹال گئے۔ محفل میں سدھیشوری دیوی بھی موجود تھیں۔ مخدوم انہیں دیکھتے ہی گرویدہ ہو گئے۔ سفید بال مسکراتا ہوا چہرہ، ناک میں ہیرے کی کیل۔ مخدوم نے کہا ہم تو آپ کا گانا سنیں گے۔ میں نے کان میں کہا اس وقت اصرار نہ کرو۔ یہاں ساز کہاں ہیں۔ کہنے لگے ہم گھر آکر گانا سنیں گے۔ سدھیشوری دیوی کو مخدوم کا ترنم

بہت پسند آیا۔ ارے تم تو خود بہت سُریلے ہو اور پھر ماشاءاللہ جوان ہو۔ خسرو نے مجھ سے آہستہ سے پوچھا۔ مخدوم کی عمر کیا ہوگی؟ میں نے کہا اندازہ لگاؤ۔ بولے یہی کوئی پچاس کے قریب۔ میری بیوی ہنس پڑیں۔ بولیں کیوں بیچارے کی عمر بڑھاتے ہو۔ ۴۵ کے لگتے ہیں یا نہیں؟ میں نے کہا ۶۲ کے ہیں۔ خسرو کو یقین نہیں آیا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ کس کو یقین آسکتا تھا۔ تب ہی تو سدھیشوری دیوی انھیں جوان بتا رہی تھیں۔ بہرحال فیصلہ ہوا کہ دو دن بعد ہم سب سدھیشوری دیوی کے یہاں جائیں گے۔ کیوں کہ دوسرے دن ہمیں نینا دیوی کے یہاں جانا تھا جہاں شرافت حسین گانے والے تھے۔

اس رات کو کب کی گاڑی میں واپس آتے ہوئے پھر مخدوم سدھیشوری دیوی کی تعریف کرتے رہے "کیا خوبصورت عورت ہے واہ واہ"۔

دوسرے دن میں اپنی بیوی کے ساتھ پہنچا کہ انھیں ساتھ لے کر نینا دیوی کے یہاں جائیں گے۔ پہنچتے ہی خبر ملی کہ مخدوم پر دل کا دورہ پڑا ہے اور اسپتال پہنچا دیے گئے ہیں۔ پھر مخدوم کا پیغام ملا کہ نینا دیوی کو فون کر کے معافی مانگ لینا کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے نہ آسکوں گا۔ پیغام مخدوم نے اسپتال سے بھجوایا تھا اور میرے لیے مخدوم کا یہ آخری پیغام تھا:

درد کی رات ہے
چپ چاپ گزر جانے دو
درد کو مرہم نہ بناؤ
دل کو آواز نہ دو
نورِ سحر کو نہ جگاؤ
زخم سوتے ہیں تو سو رہنے دو
زخم کے ماتھے سے امرت بھری انگلی نہ ہٹاؤ
دل کو آرام پھولوں کو سکوں ملتا ہے

ناتھ لیبارٹریز ورکرز یونین
کا
کامریڈ مخدوم کو خراجِ عقیدت

اعجاز قریشی

مخدوم — کیا نہیں تھے؟

مخدوم صاحب کیا تھے؟ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔
لیکن اگر یہ کہا جائے کہ مخدوم صاحب کیا نہیں تھے تو اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا اور یہ جواب ایک سوال بھی ہوگا — مخدوم صاحب کیا نہیں تھے . . . مخدوم صاحب کی شاعرانہ عظمت اور ان کی ہمہ گیر شخصیت — ان کی تمام پیاری پیاری خصوصیات — سب کی سب پکار پکار کر کہتی ہیں، سوال کرتی ہیں
مخدوم صاحب کیا نہیں تھے؟

ایک بار جب وہ بحیثیت شاعر اور ایک محبوب شخصیت اور ممتاز عوامی رہنما کی حیثیت سے پورے شباب پر تھے چپ چاپ حیدرآباد کی محفلوں سے اٹھ کر چلے گئے روپوش ہو گئے — محفلیں سونی ہو گئیں اور اپنے مخدوم اپنے محبوب کا انتظار کرنے لگیں — روپوشی کے اس درمیانی وقفے کے بعد وہ رونقِ محفل ہی نہیں روحِ رواں بن گئے۔

وہ صرف ایک بڑے شاعر ہی نہیں تھے ایک عجیب اور دلآویز شخصیت تھے شاعری کی طرح متاثر کرنے والی، دلوں کو سہلانے والی بھی اور دلوں کو فتح کرنے والی بھی — دلوں کو فتح کرنے والے فاتح زادہ تھے — چہرے پر ہمیشہ شگفتگی، ہونٹوں پر ہمیشہ تبسم اور مسکراتی ہوئی آنکھیں — باتوں میں پیار کا رس انھیں دیکھنے سے ہمیشہ مسرت ہوتی ان سے باتیں کرنے والا ہمیشہ خوش ہوتا۔ ایک عجیب مسرت اور انبساط کا احساس ان سے ملاقات کا تاثر بن جاتا — وہ شاعر تھے ہی لیکن ان کی شخصیت بھی حقیقی معنیٰ میں شاعرانہ تھی۔ سراپا شعر — شاعری کو انھوں نے اپنی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا لیکن شاید — خود شاعری نے بھی اپنے اظہار کے لیے اس شخصیت کو چن لیا تھا تکمیل کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد وہ ایک روز اچانک ہماری محفلوں سے اٹھ کر چلے گئے اس بار وہ ایسے روپوش ہوئے کہ پھر کبھی نظر نہیں آئیں گے — اس روپوشی تک بھی وہ سدا بہار شخصیت تھے۔ ہمیشہ خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کو انھوں نے اپنی زندگی کا رویہ اپنا مزاج بلکہ اپنا مشن بنا لیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ۶۰ ساٹھ سال کی عمر کے بعد بھی جواں سال نظر آتے تھے وہ حقیقی معنیٰ میں گل تر تھے وہ شاید یہ نہیں چاہتے تھے

گذشتہ مرض کے حملے کے دوران ان کے تحت الشعور نے ان سے کہا ہوگا شاخ سے ٹوٹنے کے بعد پھول کی زندگی ... کے تصور سے ہی شکستہ دل کو لیے اپنی زندگی کی خزاں کو دیکھنا اس سدا بہار شخصیت نے گوارا نہ کیا، اور وہ بساطِ رقص کو چھوڑ کر چلے گئے۔ لڑکھڑاتے گرتے اور سنبھلتے ہوئے زندگی کی گاڑی کو گھسیٹنے کے لیے ان کی قوت ارادی آمادہ نہ تھی شاید یہی وجہ تھی کہ دہلی میں قلب پر شدید حملہ کے بعد سارے زمانہ کو ساتھ لے کر چلنے والا یہ شاعر اپنے پیچھے سارے زمانہ کو سوگوار چھوڑ کر چلا گیا۔

اب وہ ہمارے دیدۂ نمناک میں لہراتا ہے سانس کی طرح اس کی یاد مسلسل آتی رہتی ہے۔ اس کے بغیر محفلیں بے جان ہیں۔ بے شمار سوگوار سوچتے ہیں کہ پرسہ کسے دیں اپنے آپ کو بھی کیا پرسہ دیا جاسکتا ہے۔ مخدوم کی موت پر پرسہ حیدرآباد کو دیا جانا چاہیے کیونکہ حیدرآباد نے اپنا سب سے زیادہ انمول رتن کھو دیا ——— حیدرآباد نے اپنی تہذیب کا نمونہ اپنی شائستگی کی مکمل تصویر اور اپنی عظمتوں کا نشان کھو دیا۔

مخدوم بہت بڑے شاعر تھے ان کی موت ساری اردو دنیا کے لیے صدمہ جانکاہ ہے لیکن جن لوگوں نے مخدوم کو قریب سے دیکھا ہے مخدوم سے باتیں کی ہیں ان کے اخلاق و کردار، ایثار اور راہ صاف کو پرکھا ہے وہ ہندوستان کی ملی جلی مشترکہ تہذیب کے مکمل نمونہ حیدرآباد کو اپنی نگارنگ شخصیت کے ذریعہ بھرپور طریقہ پر ظاہر کرنے والے مخدوم کو کبھی بھلا نہیں سکتے ——— ایک شہر اور ایک تہذیب کو ایسا سفیر مدتوں میں ملا کرتا ہے ——— حیدرآباد کے ذکر کے ساتھ ہی اگر یہاں چیزوں اور یادگاروں میں چار مینار کا تصور سب سے پہلے آجاتا ہے تو صحیح باتوں چیزوں میں سب سے پہلے زبان پر نام مخدوم آجایا کرتا تھا ——— مخدوم نے سب سے پہلے اپنی مادرِ جامعہ کا نام روشن کیا اور ارضِ وطن کے وقار کو بلند کرنے میں بھی وہ ... ان کی موت پر ... دنیا ہی اتم گسار نہیں ہے اردو دنیا کے باہر بھی ان کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھنے والے موجود ہیں۔ وہ ایک سیاسی رہنما، اپوزیشن لیڈر، ٹریڈ یونین قائد، تہذیبی اور سماجی شخصیت اور اس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ تھے۔ ایک بہترین دوست، پیکرِ ایثار و خلوص گفتار کے غازی بھی تھے اور کردار کے غازی بھی۔

لفظوں کے جانے پہ سارا جنگل اداس تھا ———

مخدوم کی موت پر ایک شہر اداس ہے۔ ایک تہذیب اداس ہے ——— مخدوم ایک شہر کی عظیم خصوصیات کا مجسم روپ تھے۔

ایک تہذیب کی تمام تر شائستگی اور اس کی ساری خوبصورتی کا خوب تر نمونہ وہ ایک دور کی آبرو اور ایک عہد کی آرزو تھے، وہ ایک مسیحا تھے جس نے اپنے سارے زمانے میں جان پھونک دی تھی۔ مخدوم نے اپنے دور کے شاعروں ادیبوں دانشوروں، عوام، خدمت گزاروں، انقلابیوں، اپنے دوستوں اپنے تمام چاہنے والوں غرض یہ کہ سب کو متاثر کیا۔ ان کے نغموں نے جادو جگایا ——— نئے خواب پیدا کیے نئی آرزوؤں امنگوں اور تمناؤں کو جنم دیا۔ وہ اپنے شہر اور اپنے صوبہ

یہی قدیم و جدید کے امتزاج کا نمونہ نہیں تھے بلکہ انھوں نے قدیم کو جدید میں تبدیل کرنے والی عہد ساز شخصیت کا رول ادا کیا ـــ ترقی پسند انقلابی خیالات تصورات میلانات ادبی رجحانات انسان دوستی اور مساوات کے اصولوں اور نظریات کے پیرایہ میں غرض یہ کہ نئے حیدرآباد کی تعمیر میں مخدوم نے ایک عظیم معمار کا رول ادا کیا۔ فکر و نظر کے نئے زاویے نئے پیمانے اور نئی کسوٹی غرض یہ کہ حیات اور سارے زمانے کو ساتھ لے کر چلنے والا مخدوم ہم سے بچھڑ گیا ہے لیکن اپنے پیچھے ایک کائنات چھوڑ گیا ہے۔ اس کی شاعری کے اعلیٰ محاسن اور اس کی شخصیت کے تمام گہرے نقوش اس کائنات میں ہمیشہ باقی رہنے والی چیزیں ہیں۔

پیارے مخدوم
کی
یاد میں

ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

مخدوم ـ بچوں کی نظر میں

مری تنہائیوں میں بھی محبت کی دھمک [illegible] مجبور گریہ [illegible]
ہے لیکن بچے مجھے ہر حالت میں عزیز ہوتے ہیں : (مخدوم)

[illegible] علی خان

میرا محبوب شاعر — مخدوم

روسو نے لکھا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مخدوم کی شاعری انسان کی اسی پابجولاں کیفیت کے خلاف ایک طرف ایک موثر صدائے احتجاج ہے تو دوسری طرف مخدوم کی شاعری میں انسانی محبت کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں۔ مخدوم کا پہلا مجموعۂ کلام "سرخ سویرا" ہے۔ یہ نام نہ صرف ان کے سیاسی انداز فکر کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ ان کی ساری زندگی اور ان کی زندگی کے مقصد [illegible] سرخ سویرا میں [illegible]

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کر چلو

[illegible] میں لہراتے رہتے [illegible] جاتے رہے
[illegible] بھی سرخ سویرا میں ملتے ہیں

- جو [illegible]
- خدا بھی [illegible] کیا کرتے تھے

سرخ سویرا کو [illegible] ایک [illegible] ادب [illegible] سرخ سویرا [illegible] اور [illegible]
[illegible] سرخ سویرا پڑھنے والے کے دل میں محبت کا [illegible] انسانی [illegible]
کا احساس [illegible] سے پیدا ہوتا ہے [illegible] سرخ سویرا [illegible] کا اظہار کرتا ہے۔ —
سرخ سویرا میں انتظار اور [illegible]

مخدوم کی شاعری [illegible] شاعری نہیں [illegible] کی شاعری میں [illegible] اور

انسانی زندگی کے نشوونما کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ ایسی شاعری ابدی اور لازوال شاعری ہوتی ہے۔
"یہ جنگ ہے جنگ آزادی" والی نظم عالمی اتحاد اور انسانی برادری کے فروغ اور مخدوم کے ایک عالمگیر تصور کی ترجمانی کرتی ہے
مخدوم کی شاعری میں رومان و انقلاب کا خوبصورت سنگم ہے۔ اسے صرف رومانی شاعر کہنا جہاں ایک زیادتی ہے، وہیں انہیں
صرف انقلابی شاعر بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ جہاں ایسے شعر کہتے ہیں:

ہجوم بادہ و گل میں ہجوم یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر میرے سلام لیے

تحفۂ برگ گل و بادِ بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

"گل تر" کی شاعری میں جو مخدوم کا دوسرا مجموعہ کلام ہے "ہمیں چاند تاروں کا بن" والی نظم بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جا بجا ایسے اشعار اور مصرعے بھی دامنِ نظر کھینچتے ہیں۔

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح نئے تلخیٔ ایام بھی پی ہے

ع نرد و تیشے کو چمکا دو کہ کچھ رات کٹے
ع اٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

مخدوم کی شاعری اردو کی آبرو ہے کیوں کہ مخدوم کی نظموں کا نہ صرف ہندوستان کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہوا بلکہ انگریزی، روسی، جرمن اور چینی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ اس طرح مخدوم حیدرآباد کا وہ پہلا شاعر ہے جسے عالمگیر شہرت ملی ہے۔ ایک دو فلموں میں بھی ان کی دو نظمیں "سپاہی" اور "چارہ گر" ریکارڈ کی گئی ہیں۔ نظم چارہ گر ہندوستان و پاکستان میں زبان زدِ خاص و عام ہے۔ میں نے اچھی خاصی عمر کے بزرگوں کو بھی ایک چھیلے کے منڈوے تلے گنگناتے اور سر دھنتے دیکھا ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ مخدوم کو اپنی شاعری کے ذریعہ جو شہرت و مقبولیت ملی ہے وہ اس سرزمین کے کسی شاعر کو اپنی زندگی میں میسر نہیں آ سکی۔

اودیش رانی

چی چی

۱۹۶۲ء میں ایک ایسے شخص سے ملنا پڑا جسے عرصے سے جانتے تھے لیکن پھر بھی اس وقت ان کا نام اجنبی سا لگا۔ وہ نام تھا چی چی، اس نام سے شاید آج بھی لوگ کم واقف ہوں گے کیونکہ لوگ دبلے پتلے سانولے سلونے ہنس مکھ نوجوان بوڑھے مخدوم محی الدین سے واقف تھے۔ چی چی سے بہت کم لوگ۔ یہ ملاقات اتفاق سے ایرپورٹ پر ہوئی تھی چی چی کسی غیر ملکی دورے سے واپس ہوئے تھے۔ چی چی مسکراتے ہوئے لوگوں سے ہاتھ ملا رہے تھے، بچوں کو پیار کر رہے تھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ حیات اور کائنات دونوں کے ساتھ سارا زمانہ چی چی کے ساتھ چل رہا تھا۔

اچانک چی چی کو پھر ایرپورٹ سے لانے جانا پڑا۔ یہ ۲۶ر اگست کی دوپہر تھی آج بھی ماحول کچھ ایسا تھا جیسا ۶۲ء میں دیکھا تھا کائنات کے ساتھ زمانہ بھی چل رہا تھا صرف حیات قید ہو گئی تھی اور وقت سہم گیا تھا۔ رقص کی بساط الٹ گئی تھی، سہاگ مٹی کا سہاگ اجڑ گیا تھا اور سرخ سویرا دھندلا گیا۔ خاموش فضا میں جو پہلی بار آواز گونجی وہ تھی شانت دوت کی جس نے دلوں میں ہل چل مچا دی تھی۔ بچے ایک بار پھر زور زور سے چیخنے لگے چی چی آگئے۔ چی چی آ ضرور گئے تھے لیکن روح کا تصور تھا اور جسم وہ تو لکڑی کے ڈبے میں بند تھا۔ جیسے لگتا تھا چی چی ڈبہ کھولتے ہی تیزی سے نکل پڑیں گے، ہاتھ بڑھا دیں گے، مسکرانے لگیں گے بے تکلف دوستوں سے سگریٹ مانگیں گے۔ چائے میں سو کیڑے نکالیں گے اور انگور کے پانی پر سو فائدے سنائیں گے۔ یہ سب کچھ نہ ہوا۔

حیات، کائنات اور سارے زمانہ کو ساتھ لے کر چلنے والے چی چی کا جنازہ تنہا کائنات ساتھ چل رہی تھی زمانہ رنگ بدل رہا تھا اور حیات نے ان سے دغا کر دی تھی لیکن ان کا کہنا تھا کہ الاؤ نہ بجھا لاکھ مٹاؤ۔ مگر ایک آواز پیچھا کرتی وہ آواز چی چی کے پرستاروں نے بلند کر دی۔ ان کا دوست کہہ رہا تھا۔ جو شمع پھولوں نے جلائی ہے اس کو مشعل راہ بنانا ہے۔ ساتھی چھوٹا تو بھی منزل کو کارواں پہ جانا ہے۔

چی چی کا گمبھیر چہرہ اب دکھائی پڑ رہا تھا لیکن ایسے جیسے کسی نے چمکتے زیور سے قیمتی نگینے غائب کر دیا ہو۔ ان کے چہرے پر ان کی چمکتی آنکھیں موت نے نہ جانے کیسے چھین لی تھیں۔ بچوں کی چیخ و پکار پر گھبرا کر انہی آنکھیں بند کر لی تھیں یا موت اب شاید اپنے کارنامہ پر پشیمان ہو رہی تھی اور چی چی سے اس کی بے بسی نہ دیکھی گئی اور انھوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

وہ ایک ایسا پھول تھے جس میں چنبیلی کی مہک تھی گلاب کی شادابی تھی، کنول کی ٹھنڈک لیکن تی جی کو جیسے خوشبو سے بیر سا ہو گیا تھا۔ وہی وقت جو کچھ دیر پہلے سہم گیا تھا اب گھبرا کر بھاگ رہا تھا۔ شاید ان کے جسم سے بچھڑنے کا وقت آ رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا تھا ویسے ان کی روح بلندی کی طرف جا رہی تھی اور جسم پستیوں کی طرف ڈھکیلا جا رہا تھا جیسے جی جی کی وہ باتیں یاد آنے لگیں جو جی جی نے کچھ دن پہلے کہی تھیں۔

مئی کا مہینہ تھا جی جی کے گھر اچانک جانے کا اتفاق ہوا۔ اور ہم گرمی کا مزہ لے رہے تھے اچانک نگاہ جی جی کی برہنہ پیٹھ پر پڑی۔ ایک گہرا زخم دکھائی دیا۔ گھبرا کر پوچھا۔ جی یہ کیا ہے۔ جی جی نے گمبھیر لہجے میں کہا یہ مہر نبوت ہے۔ میں نے ہنس کر کہا۔ اچھا اسلام کے چکر میں پھنس گئے تو جی جی نے بہت ہی سنجیدہ لہجہ میں کہا۔ اسلام کا چکر نہیں فارسی مشہور ضرب المثل ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

جو اسلام کو دیکھنے سے خواتین کے دل بڑھ جاتے ہیں یہ اشارہ بھائی کی طرف تھا جنہیں (ENLARGEMENT OF HEART تھا۔ پیاری بھابی مسکرا کر رہ گئیں۔ جی جی نے مخصوص انداز میں ہاتھ بڑھا دیا۔

جی جی حیدرآبادی تھے لیکن انھیں دکنی سے شدید چڑ تھی۔ ہمیشہ برج بھاشا اور کھڑی بولی کی تعریف کیا کرتے کہتے اس زبان میں مٹھاس ہے لیکن پھر بھی بہار کے دورے سے واپسی پر کہنے لگے۔ وہاں کی بہاری بھی بڑی پیاری زبان ہے میں نے چڑ چڑاتے ہوئے کہا۔ ہم ہمیشہ اپنی زبان کی برائی کرتے ہیں۔ کہنے لگے میں نے برائی کب کی۔ دکنی تو زبان کا سالن ہے جن کو جانتے ہیں اس کو دنیا میں سارے ہندوستان میں کوئی اس کا ثانی نہیں ہے۔

پھر بحث کی لوان کی طرف چل پڑی۔ جی جی نے دکنی [illegible] کھٹی دال، دلی امام کے کی بھاجی، بوٹی، مرچ کا سالن املی کا اچار، خوص بلیسول کی لوان کی ترکیبیں اور کوانے دشتہ دونوں سنانے لگے۔

کسی کا مزید نے ہنستے ہوئے کہا کام [illegible] [illegible] دہی [illegible] راج [illegible] وہ کہنے لگے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ زمین دوز تھے ایک ساں آ [illegible] [illegible] بکائیں [illegible] راج سے ترکیب لے لی۔ ہم [illegible] ترکیب میں [illegible] راج نے غلطی سے آدھی [illegible] [illegible] [illegible] نمک شاہ زیرہ [illegible] [illegible] راج بھول [illegible] [illegible] [illegible] کیا اب [illegible] کھانی نہیں تو اس میں میرا کیا قصور۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔

جی جی کو [illegible] بڑا [illegible] تھا لیکن ہوسٹن یونین جانے سے پہلے [illegible] اچھا [illegible] کا ذکر کرتے رہے۔ بمبئی [illegible] بھی اس کے چرچے رہے۔ تو کسی نے کہا کام [illegible] آپ وہ کیوں [illegible] جاتے۔

کامریڈ مخدوم [illegible] سے اور [illegible] مل ہو گئے۔ اچھا [illegible] کا ذکر کرتا ہوں تو اس کا مطلب [illegible] ہولی، دیوالی، راکھی، عید بقر عید سب بھول جاتے۔ وہاں [illegible] کہاں [illegible] [illegible] کمیونزم [illegible] [illegible] [illegible]۔

جی جی بیس برس آر۔ ٹی۔ سی کی یونین کے صدر رہے لیکن ہمیشہ بس کی باقاعدہ آمد و رفت کی شکایت کرتے کہتے بس کا انتظار اور انقلاب کا انتظار دونوں برابر ہیں۔ مخدوم بس کا انتظار کرتے نہ انھوں نے ہندوستان میں انقلاب کا انتظار کیا۔ وہ کبھی بس کا انتظار نہیں کرتے ہوئے لیکن رکشے میں بیٹھنے سے پہلے ضرور تحقیق کر لیتے تھے کہ رکشا والے کے پاس اس کا لائسنس ہے۔

ایک مرتبہ ایک رکشا والے کو پتہ لگ گیا کہ اس کی رکشا میں بیٹھنے والا مخدوم ہے۔ اس نے ان کی شاعری کے نام فلمی گانے شروع کر دیے۔ مخدوم ضبط سے بیٹھے رہے، داد دیتے رہے جب اتر گئے تو کہنے لگے۔ تم ... باغ نہیں تھا بے جبرا ضرور تھا کہ ایک تانگہ والے سے بات نہ کر سکا۔ بس اس سے بڑا ہی مول ... کر پورے ... کا نے ... راستہ لگ گیا۔

دوسرے روز راکھی آگئی اس کا ... والا دنیا سے گزر چکا تھا صرف ایوانوں ... لا کر ... جاتا تھا اس کا صرف تذکرہ تھا بری حالتوں میں ایوانوں میں صرف چرچا رہا ... جی جی کا صرف یاد رہ گئی۔ شاید لوگ مخدوم کو بھول جائیں گے لیکن جی جی دلوں میں ایسے رس گئے جیسے ان کی دھڑکن۔

سائرہ ظہیر

گورے نانا

جی ہاں! آپ سب جن کو کامریڈ مخدوم کہتے تھے وہی تو ہمارے گورے نانا تھے۔ سب کو تعجب تھا اور بعض لوگ تو سنا ہے کہ یہ نام لے کر چھیڑا کرتے تھے کہ ذرا سے بھی کالے آدمی کا نام "گورے نانا" کیسے ہو گیا۔ لیکن لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ میں نے ان کا یہ نام کیسے اور کیوں رکھا تھا۔ آپ سب کو بھی بتادوں تاکہ میری عمر کی ساری لڑکیاں اور لڑکے ان کو اسی نام سے یاد کر سکیں۔ تو سنیے!

ایک بار میری امّی نے ایک صاحب سے متعارف کروایا اور کہا کہ یہ تمھارے نانا ہیں۔ مگر مجھے دیکھنے سے وہ نانا نہیں لگے کیوں کہ میرے ذہن میں نانا تو داڑھی والے ہوتے تھے اور ہمارے یہ نانا تو بابا کے ساتھ بیٹھے ہوتے تو بابا سے کچھ ہی بڑے لگتے تھے۔ بہرحال ان کو نانا حضرت یا نانا ابا کہنا ہم لوگوں کو کچھ جچا نہیں۔ اس لیے ہم لوگ الجھن میں اور ہمارے بھائی سوچنے لگے کہ انھیں کیا پکارا جائے۔ ایک دن اتفاق سے میں صبح سویرے ان کے یہاں پہنچ گئی (یہاں آپ کو بتادوں کہ مجھے [illegible] کرنے کی عادت ہے) اور دیکھا کہ نانا صاحب صرف لنگی میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ اور ان کا جسم تھا صاف ستھرا اور انتہائی گورا لگا۔ اور اسی وقت میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں آپ کو گورے نانا پکاروں گی جس پر انھوں نے احتجاج کیا کہ کالوں کو گورا نہیں کہنا چاہیے مگر میں نے آخر کار انھیں CONVENCE کر لیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ جسم کے ساتھ ان کا دل بھی گورا ہے جس میں سوائے دوسروں کے لیے محبت اور شفقت کے کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ انھیں راضی ہونا پڑا اور مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنے بھائیوں کی اس طرح یہ مشکل حل کر دی تو اب آپ لوگ واقف ہو گئے گورے نانا سے۔ جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بابا اور امّی اور گورے نانا سبھی کسی ایک پارٹی میں کام کرتے ہیں کیونکہ اکثر امّی سے جب وہ ہمارے گھر آتے تو ایک ہی قسم کی یعنی اناج کی مہنگائی، تعلیمی حالات وغیرہ پر بات چیت ہوتی رہتی۔ اور میں خاموش بیٹھا سنا کرتا تھا۔ کبھی کبھی میرے بڑے بھائی جن کی عمر اس وقت بارہ سال ہوگی کچھ دخل اندازی کرتے۔ اور امّی کی ڈانٹ پر خاموش ہو جاتے تھے۔ مجھے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ "گورے نانا" [illegible] سبھی غریبوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور [illegible]۔ چنانچہ "گورے نانا" سے بہت قریب ہو گئے۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ گورے نانا رات میں آ گئے اور [illegible]

لگ رہی ہے اور وہ ہم بچوں میں بیٹھ کر تالیاں بجا رہے ہیں اور ہم کو ناچ سکھا رہے ہیں بعض پر قوالی لگ رہی ہے اور وہ ہم سب کے ساتھ بیٹھے جھوم رہے ہیں۔ لیکن ہماری یہ خوشیاں ایک دم سنجیدگی میں تبدیل ہوگئیں۔ کیوں کہ ہمیں اطلاع ملی گورے نانا چاول کے دام میں کمی کے لیے بھوک ہڑتال کر رہے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بھوک ہڑتال شروع کرنے سے ایک دن پہلے گورے نانا امی اور بابا میں بڑی زوردار بحث ہوئی اور ہم کو ڈر لگا کہ یہ دن رات بھوکے بیٹھے رہنے سے انھیں کچھ ہوگیا تو؟ میرے بڑے بھائی جو اپنی پڑھائی میں یکتا ہونے کی وجہ سے ان کے بڑے چہیتے تھے۔ گورے نانا کے سامنے اعلان کر دیا کہ وہ بھوک ہڑتال کیمپ ہرگز نہیں آئیں گے۔ مگر ہم لوگوں کی دھمکیوں کا بھلا ان پر کیا اثر ہوتا!! انھوں نے صرف یہ کہہ دیا کہ "دیکھو بیٹے یہ پارٹی کا فیصلہ ہے جب تم بڑے ہوکر پارٹی میں آجاؤ گے تو تم کو بھی ایسا ہی عمل کرنا پڑے گا۔" بالآخر ہم سب چپ ہوگئے۔

اور اسی وقت سے مجھے پارٹی والوں پر کچھ کچھ غصہ آنے لگا تھا۔ لیکن مجھے پارٹی کے لوگوں سے پھر محبت اس وقت ہوئی جب گورے نانا کے جشن میں ان لوگوں نے بڑے زور و شور سے کام کیا۔ ہم لوگ بھی بڑے ٹھاٹ سے پروگرام دیکھنے گئے تھے۔

گورے نانا کی باتوں سے ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ انھیں اچھا پڑھنے والے بچے بہت پسند ہیں۔ چنانچہ ہر وقت ہماری یہی کوشش رہتی تھی ہم سب بہترین نمبرات سے پاس ہوں اور ہر سال ہم اپنی کامیابی کی رپورٹ اور مٹھائی دونوں ایک ساتھ گھر آنے پر پیش کرتے۔ اور وہ ہم سب کو پیار کرتے اور گلے لگاتے اور پھر امی کو مبارک باد دیتے ہوئے کہتے کہ "یہ سب ترقی تمھاری ہے" سب سے زیادہ خوشی کا دن وہ تھا جب ہم کو اطلاع ملی کہ میرے بڑے بھائی میٹرک کا امتحان درجہ اول ہی نہیں بلکہ اس میں بھی میرٹ سے پاس ہوئے ہیں۔ گورے نانا کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اور ساتھ ہی انھیں شرط ہارنے کی بھی خوشی تھی کیوں کہ ان کی اور بھائی صاحب کی شرط تھی کہ میرٹ سے پاس ہو جائیں تو وہ اسکوٹر اپنے نام سے لے کر دیں گے۔ بہرحال...
ہرجانہ ریڈی صاحب کے ہاں فوری درخواست بھجوائی گئی (جو آج تک انھوں نے نہیں دی) پھر اس کے بعد ہم لوگوں نے مکان تبدیل کیا اور تگرنگ کوٹھی میں آگئے۔ یہاں آنے کے بعد گورے نانا کے فرصت کے اوقات زیادہ تر ہمارے گھر ہی میں گزرنے لگے۔ ہماری تعلیمی حالت دیکھ کر دن بدن ان کی محبت و شفقت میں اضافہ ہوگیا۔ اگر ایک دن بھی ان کے آنے میں ہوتی یا نہ آتے تو بے چینی ہونے لگتی۔ ایک وقت ایسا ہوا کہ گورے نانا دو چار روز لگاتار غیر حاضر ہو گئے۔ ان کے آنے پر میں نے بہت زیادہ شکایت کی تو انھوں نے کہا کہ ایک رجسٹر بنا کر رکھو تاکہ حاضری اور غیر حاضری کا اندازہ ہو جائے۔ میں نے انھیں ڈرا دیا کہ غیر حاضری کی صورت میں جرمانہ ادا کرنا پڑے گا جس پر سب ہنسنے لگے۔

اسی دوران میرے بھائی صاحب تعلیم کے لیے اسکو جانے والے تھے۔ گورے نانا کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ دن میں دو چار چکر ہمارے گھر کے لگاتے۔ کبھی بھائی صاحب کے کپڑے دیکھتے، کبھی دوسرا سامان دیکھتے اور امی کو بتلاتے کہ کس چیز کی کمی ہے۔ دیکھتے دیکھتے بھائی صاحب کے جانے کا دن آگیا، اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۵ اگست کو گورے نانا نے آکر امی سے یہ

وعدہ لیا کہ بھائی صاحب کے جاتے سمے ان کی آنکھوں میں آنسو نہ آئیں گے۔ یہ وعدہ لے کر انھوں نے بھائی صاحب کو بہت ساری نصیحتیں کی تھیں اور ان سے کہا تھا کہ وہ ان کو خدا حافظ کہنے ہوائی جہاز سے دلّی آ رہے ہیں اس لیے اسٹیشن نہیں آئیں گے۔ ۱۹ر اگست کو انہی کی غیر موجودگی میں گورے نانا گھر آئے تھے اور مجھ سے کہا کہ انھوں نے جو روپیہ میرے ہاں رکھوائے تھے وہ دے دوں۔ میں نے روپیے دیدیئے تو وہ بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ آج میں دلّی جا رہا ہوں جلدی جلدی سے چائے بنا کر پلاؤ۔ میں نے جھٹ سے چائے بنائی۔ اسی دوران مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور کہنے لگے کہ "تم چائے بہت اچھا بنانے لگی ہو ہم تمھارے لیے ایک گیس کا چولہا خرید دیں گے تاکہ تم اور جھٹ پٹ چائے پلا دیا کرو۔"

انھیں بہت خوشی تھی کہ میں نے چھوٹی سی عمر میں کام کاج میں امّی کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا ہے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرے گورے نانا اس دن آخری بار مجھ سے مل رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا کہ دلّی سے گورے نانا واپس نہیں آئیں گے تو میں ہرگز ان کو نہ جانے دیتا۔

۲۵ر اگست کا سحر دن ساری عمر ہم نہیں بھولیں گے۔ اب ہماری رپورٹ دیکھنے کون آئے گا؟ اب ہماری پڑھائی سے کون خوش ہوگا؟ کس کو ہماری فرمائشوں کا خیال رہے گا؟ مجھے اب کون کبوتری کہہ کر پکارے گا؟ ان تمام سوالوں کا جواب صبح سے شام تک سوچنے پر بھی حل نہیں ہو پاتا ہے۔ سارے گھر پر ایک قسم کی اداسی آجاتی ہے جب کبھی ان کا ذکر آجاتا ہے کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب ہم لوگ دن میں کئی بار ان کا نام نہ لیتے ہوں۔ اب سوائے ان کی یادوں کے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے لہٰذا ان کے بنائے ہوئے راستہ پر چلنا ہمارا فرض ہے۔

فلک پہ پھیل گیا عشق کا لہو بن کر

۱۶۔ ونڈسر پلیس۔ نئی دہلی۔ ۲۰ دسمبر ۶۹ء

ڈیر کامریڈ یوسف! "آج کل" کے تازہ (نومبر) شمارے میں عرش ملسیانی کی مخدوم پر نظم چھپی ہے بھیج رہا ہوں "آج کل" کے حوالے سے چھاپو۔

عرش ملسیانی

مخدوم مرحوم

اب وہ آواز نہیں آئے گی
جس کی ہر موج میں انگڑائی تھی
جس کے ہر بول میں شہنائی تھی
درد تھا جس میں محبت تھی فسوں کاری تھی
آگ ہی آگ
ہر رگِ ملک میں جو ساری تھی
زندگی اس کو کہاں پائے گی
اب وہ آواز نہیں آئے گی
کبھی اک مردِ سیاست وہ کبھی اک شاعر
نغمۂ زیست سناتا ہی رہا
پرچمِ عشق اڑاتا ہی رہا
ایک شعلہ تھا کہ ہر بزم کا سیارہ تھا
نور ہی نور
درد کے شہر میں آوارہ تھا
کبھی خود ایک شکاری وہ کبھی اک طائر
کبھی اک مردِ سیاست وہ کبھی اک شاعر
بھری برسات سے کھیلا برسوں
مرمریں جسم کبھی چاندنی رات
حسن کی بات تھی اس کی ہر بات
قصۂ سہاگ مستی سوز سے معمور کیا

سوز ہی سوز
ساز و آہنگ سے مسحور کیا
درد کو جاں پہ جھیلا برسوں
بھری برسات سے کھیلا برسوں
خدمت اہل وطن کر کے بنا تھا مخدوم
اس کی ہر لے پہ ستارے رقصاں
حیدرآباد کے پیارے رقصاں
مرد آہن تھا عقیدے کا جو پابند رہا
جنگ ہی جنگ
جنگ جو ہو کے بھی خود سوز رہا
ہائے افسوس کہ ہے اب وہ مجاہد مرحوم
خدمت اہل وطن کر کے بنا تھا مخدوم

یہ نظم جواب ہے ان لوگوں کا جو مخدوم کو خانوں میں بانٹ کر "نغمۂ زیست" کو "پرچم عشق" سے کاٹ دینا چاہتے ہیں۔ "عقیدے کی پابندی" نے مخدوم کو "مرد آہن" بنا دیا تھا اور ایسا "مرد آہن" جو آزادی زندان وطن" کے لیے موم کی طرح جلتا یا پھر ہجر یار میں موم بن جاتا اور پگھل جاتا کہ "موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے"۔

مخدوم کا عقیدہ اور مخدوم کی شاعری ایک دوسرے سے ستیزہ کار نہیں ایک دوسرے کے شہ پارہ کار ہیں۔ عرش ملسیانی نے اسی بات کو محسوس کیا ہے۔ ہمارے ہی شہر میں بعض احباب نے فراموش ہی نہیں کیا بلکہ ان کے اپنے آج کے عقیدہ کے مطابق مخدوم کی تصویر کو مسخ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ عرش نے مخدوم کی حقیقی تصویر علامتوں میں کھینچی ہے۔

آگ ہی آگ
نور ہی نور
سوز ہی سوز
جنگ ہی جنگ

یہ اصلی مخدوم تھے۔ اور یہ مخدوم امر ہیں۔

تمھارا اپنا
راج بہادر گوڑ

شاذ تمکنت

مخدوم

وہ لوگ اپنا درد تیرے پاس لے کے آئے تھے
وہ لوگ کون تھے بھلا
پریشان حال خاطر اداس لے کے آئے تھے
وہ نوجواں کون تھا
جو کرب سے تڑپ تڑپ کے تک رہا تھا فرش پر
جو دانہ دانہ چن رہا تھا خرمن خیال کا
لہو امید و بیم کا چمک رہا تھا فرش پر
کہ زندگی کے آگینے ترے پاس رہ گئے
وہ کیمیا کے ساتھ [illegible] پاس رہ گئے
ادھورے خواب سونپ کر کہاں چلا گیا ہے تو
بجھی بجھی ہے روشنی

دھواں دھواں ہیں بام و در
پکارتی ہے رہگزر
کہاں چلا گیا ہے تو

وہ طفلِ نو دمیدہ کون تھا
سنا رہا تھا جو کتاب چند نو ورق ورق
بیاضِ فردا لکھتے لکھتے ہاتھ کیوں اٹھا لیا
قلم کسی نے دیکھتے ہی دیکھتے چرا لیا
دوات چھن سے ٹوٹ کے بکھر گئی
حروف کھو کے رہ گئے
معانی رو کے رہ گئے
ادھورے خواب سونپ کر کہاں چلا گیا ہے تو
بجھی بجھی ہے روشنی
دھواں دھواں ہیں بام و در
پکارتی ہے رہگزر
کہاں چلا گیا ہے تو

وہ ایک لڑکی کھیت کی سنہری مانگ سے پرے
جو جانتی نہیں ہے تیرے نام کی مٹھاس بھی

مگر وہ مینھ کی رت کے پیلے پیلے بادلوں کی اوٹ سے
مگر وہ جھومتے جھمکتے ٹہنیوں کی اوٹ سے
کھڑی ہوئی فصیلِ فصل کے حصارِ زرد زرد سے
سنہری شوخ بالیوں کی مہکی مہکی گرد سے
وہ سن رہی ہے تیری چاپ تیری آہٹیں ابھی
امید آس آرزو کی گنگناہٹیں ابھی
ادھورے خواب سونپ کر
کہاں چلا گیا ہے تو
بجھی بجھی ہے روشنی
دھواں دھواں ہیں بام و در
پکارتی ہے رہگزر
کہاں چلا گیا ہے تو
وہ دستِ رعشہ دار کون تھا
کہ جس کی جھریوں کی آیت آیت نفس پکارتی رہی
ترے جواب کے لیے وہ بس پکارتی رہی
ردائے سر کہاں گئی
عصائے پیری کیا ہوا

رتیں بھریں گی ہر برس
بہاریں چل کے تیرے پاس آئیں گی

ہوائیں رخ بدل بدل کے تیرے پاس آئیں گی
گھنیرے ابر موسموں کے طشت بھر کے لائیں گے
وہ کنج گل میں سبز و سرخ روشنی گلاب کی
رتیں بھریں گی ہر برس
وہ خشک خشک کھیتیوں پہ لو کی سرسراہٹیں
اکیلی دوپہر میں فاختہ کی ہوک سے
سکوت کے بدن میں جیسے ہوں گی تھرتھراہٹیں
قطار در قطار لفظ تیرے پاس آئیں گے
کہیں گے رو کے شعر کا عطا ہو پیرہن ہمیں
بھٹک رہے ہیں دربدر کہ ورنہ بے وطن ہمیں

میں تار اشکِ خونِ دل پرو رہا ہوں دیر سے
تجھے سپردِ خاک کر کے رو رہا ہوں دیر سے
تو مثال جیسے آبِ چشمۂ رواں رہی
تو دوستوں کے رخ کی گرد دھو کے مطمئن رہا
ہنسی کا تیری ذکر کیا تو رو کے مطمئن رہا
تو شبنمیں نگاہ سے اجالے دیکھتا رہا
تو روزنِ سیاہ سے اجالے دیکھتا رہا
متاع تیری مشتِ خاک اور تو چمن چمن

نفاستِ دیرِ نو، مگر دریدہ پیرہن
قدم قدم پہ زحمتوں کو تیرا التفات تھا
نہ جانے کتنے نیلگوں دریچے تھے کھلے ہوئے
نہ جانے کتنی شمعیں تیری راہ تک کے سو گئیں
تیری نظر تھی اس چراغ خانہ سیاہ پر
کہ رہی تھی جس کی لو تیرے لہو کا واسطہ
تیرے مزاجِ آتشیں و شرارہ جو کا واسطہ
تو فرد کب تھا، بزم تھا حیات تیرے ساتھ تھی
زمانہ تیرے ساتھ تھا۔ کائنات تیرے ساتھ تھی
زیاں کے سود، سود کے زیاں کی داستاں تری

وہ سیر چشمیاں تری
وہ محفلیں وہ رت جگے وہ جشنِ مے وہ قہقہے
وہ یار باشیاں تری
تکلم شگفتہ و تبسم نگاہ میں
وہ دل نوازیاں تری
نہیں کہ آج دوسرا کوئی نہیں ہے دہر میں
سخن کے ساتھ یہ خلش کہ تو نہیں ہے شہر میں

وہ ذکر کی گھات سکھ کی بات کس سے جا کے پوچھیے
صنم کدہ کھنڈر بنا ہے کس سے کیجیے گلہ
اجڑ گیا ہے سومنات کس سے جا کے پوچھیے

سخنوری بھی ہے بہت پیمبری بھی ہے بہت
طلسمِ صوت و نغمگی کی ساحری بھی ہے بہت
مگر مرے دکن تری بساطِ رقص الٹ گئی
میں رو رہا ہوں شہ رگِ رباب و چنگ کٹ گئی
مری زمیں دہل گئی کہ آسماں ڈھ گیا
کہ سیلِ اشک و آہ میں عجب قصر بہہ گیا
سجے گی یوں تو بارہا سخن کی انجمن یہاں
کہ اقتضائے دہر بھی ہے کتنا دل شکن یہاں
مگر کلیدِ رونقِ ہر انجمن تو کھو گئی
دکن کی قسمتِ سخن تو تیرے ساتھ سو گئی
گلی گلی نگر نگر میں تجھ کو ڈھونڈتا پھروں
شفق شفق سحر سحر میں تجھ کو ڈھونڈتا پھروں
وہ رنگ رنگ راگ کا پیام دے کے کھو گیا
وہ کام دیو کی کمان جام دے کے کھو گیا

نیاز حیدر

سورج کو کبھی دفن کوئی کر نہیں سکتا

کیا تجھ کو خبر دیدۂ نمناک نہیں ہے
وہ شعلۂ جوالا تہہ خاک نہیں ہے
تقدیرِ حیاتِ ابدی کہتے ہیں جس کو
مخدوم میں وہ دل بے باک نہیں ہے

وہ زندۂ جاوید ہے وہ مر نہیں سکتا
سورج کو کبھی دفن کوئی کر نہیں سکتا
مخدوم کو فانی نہ سمجھ اے دلِ مغموم
تھا پرچمِ احمر کا علمدار وہ مخدوم

کیا تجھ کو خبر دیدۂ نمناک نہیں ہے
وہ شعلۂ جوالا تہہ خاک نہیں ہے

باقر مہدی

ایک سرخ افسردہ چراغ

(مخدوم کی یاد میں)

کیا ہوا ـــ؟
کیوں گل ہوئی اک روشنی ـ؟
انقلابی نوجواں نعرہ اٹھے!
"چارہ گر" کی جستجو میں
کھو گیا ـ!
ایک سرخ افسردہ چراغ ـ!!
انقلاب آئے نہ آئے
لیکن اس کی راہ میں
سرفروشوں کے بڑھے جائیں گے یونہی قافلے
اور نئے سرکش ترانے اغنوں کی یاد میں
لے کے نکلیں گے
کالے ، ـ ـ
پرچم

شکیل بدایونی

آہ مخدوم

میرے ساتھی بنا لو لہاں ہو گیا
زندگی کے چمن میں ٹہلتے ہوئے
رنگِ مستقبلِ گل بدلتے ہوئے
اک فیصلی کے مقدر سے نا سو گیا
میرے ساتھی

چھٹنے والی نہیں اب ظلمتیں رات کی
تو نے اے دوست کیسی بڑی بات کی
دامنِ دل سے داغ لہو ہو گیا
میرے ساتھی

زندگی نے سکھایا تھا جینا تجھے
موت نے دور لے جا کے چھینا تجھے
[illegible]
میرے ساتھی [illegible]

حفیظ فضا

دھواں

اداس اداس ہے گلشن
گلوں کی آنکھ ہے نم
شگوفے زرد ہیں مغموم ہے صبا کا چلن
[illegible] کے غم میں
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
دھواں دھواں ہے فضا [illegible]
اداس اداس ہے گلشن گلوں کی آنکھ ہے نم

بیکل اُتساہی

خراج عقیدت

مخدوم محی الدین کی رحلت پر ۳۰ ستمبر کو المالطیفی ہال (بمبئی) میں تعزیتی جلسے
میں پڑھی گئی ایک نظم جو بہت پسند کی گئی

آرزوئے دلِ دکن مخدوم
نازشِ عظمتِ وطن مخدوم

ادبِ عالیہ کا روشن ذہن
نازشِ ہر فکر و فن مخدوم

ہوشمند سرور و کیف جدید
رندِ میخانۂ کہن مخدوم

پیکرِ خلق، مشعلِ اخلاص
اک اکیلا تھا انجمن مخدوم

شوکتِ سادگیٔ حسنِ ادب
تھا سیاست کا بانکپن مخدوم

افقِ سرخ کا سویرا اب
شامِ غم کا ہے پیرہن مخدوم

خارزارِ حیات میں رہ کر
تھا گلِ تر کا اک چمن مخدوم

اب وہ نغمہ کہاں نہ آخرِ شب
اب کہاں مطربِ سخن مخدوم

کون سمجھے گا کون سوچے گا
دستِ مزدور کی تھکن مخدوم

پھر چنبیلی کے ایک منڈوے تلے
مل نہ پائیں گے دو بدن مخدوم

کیوں نہ سمجھی غزل کی ہو بیکل
جب بدیسی بنا سجن مخدوم

جہاں دار افسر

کس کو دیجیے پرسہ

(مخدوم صاحب کے اچانک انتقال کی خبر پانے کے فوری بعد)

کس کو دیجیے پرسہ
کس سے تعزیت کیجیے
میکدے سے اٹھا ہے جانِ میکدہ جیسے

چیختی فضائیں ہیں
رو رہے ہیں پیمانے
رندِ پارسا آیا
جس کے دم سے زندہ تھیں
میکدے کی تہذیبیں
جس کا ایک نعرہ تھا
نظمِ میکدہ بدلے
پیار کی حرارت سے
تیرگی پگھل جائے
روشنی کا عالم ہو
امتیازِ این و آں
میکدے سے مٹ جائے
العطش کی آوازیں
پھر نہ کوئی سُن پائے

ایسا رندِ خوش اوقات
اب کہاں سے آئے گا
میکشوں کی دنیا میں
شورشیں اٹھانے کو
زندگی کی چاہت کا
حوصلہ بڑھانے کو

بام و در فسردہ ہیں
غم زدہ ہے میخانہ
قلب و جاں کے روزن سے
جھانکتے ہیں سناٹے
میکشوں کے ہاتھوں میں
جام تھرتھراتے ہیں
سازیوں لرزتا ہے
جیسے آنکھوں میں آنسو

آج ایسے عالم میں
کس کو ہوش پینے کا
کس کو جوش جینے کا —
— سب یہی سمجھتے ہیں
موت کے اندھیرے نے
بازوؤں کو پھیلا کر
میکشوں کے شانوں کو
یوں جھنجھوڑ ڈالا ہے
سب پہ موت طاری ہے
کس کو دیجیے پرسہ
کس سے تعزیت کیجیے

جہاں دار افسر

روشنیٔ فکر و نظر زندہ ہے

(مخدوم صاحب کے چہلم کے موقع پر)

کون کہتا ہے کہ مخدوم نہیں ہیں ہم میں
میرا ایقان تو یہ کہتا ہے
روحِ پائندہ پہ کیا موت کا جادو چلتا
اب بھی وہ روشنیٔ فکر و نظر زندہ ہے
جسم کی موت نہیں مرگِ بشر
جب ابھی مزدور اٹھیں اپنے ہتھوڑے لے کر
اور کھیتوں میں کسانوں کی درانتی چمکے
نوجوان عزم جواں ساتھ لیے لائیں فردا بننے
شاہراہوں پہ نکل آئیں گے
روحِ مخدوم کو ہمراہ رواں پائیں گے
کون کہتا ہے کہ مخدوم نہیں ہیں ہم میں

میرا ایقان تو یہ کہتا ہے
وہ یہ نام ہو کہ فلسطین
جہاں بھی انسان
اپنے کندھوں پہ صلیبوں کو لیے
جاگ اٹھے ہیں
غلامی کو مٹانے کے لیے
انقلابات کے بڑھتے ہوئے طوفانوں میں
جبرِ حاضر کے خداؤں کو مٹانے کے لیے
جس جگہ جو بھی کوئی
سر ہتھیلی پہ لیے حق کے لیے آئیں گے
روحِ مخدوم کو ہمراہ رواں پائیں گے

برق یوسفی

اُجالے کی لکیر

مخدوم نام مہر و مروّت کا دوستو
مخدوم نام حسن و محبت کا دوستو
مخدوم نام راہِ شجاعت کا دوستو
مخدوم نام شمع سیاست کا دوستو
انسان دوست شاعر و دانش فکر بے نظیر
تاریکیوں میں جیسے اجالے کی اک لکیر

شعلہ بیان شعلہ نوا، شمع انجمن
اک نکتہ دان فکر رسا بحر علم و فن
گلہائے صد بہار کھلے تھے چمن چمن
تیرے لغیر نور سے محروم ہے دکن
روح فلک و سہاگ تھی اشک بار ہے
شاید صفی کی روح بہت بے قرار ہے

ڈھونڈیں گے ہم بھی اسکو اٹھائے ہوئے صلیب
تو ہے کہاں یہ ہم کو بتا صبح کے نقیب
بے چین اہل علم ہیں بے تاب ہیں ادیب
دلّی کی سرزمیں سے آئی خبر عجیب
جانے وہ کس خیال میں کس طرح کھو گیا
غالب نئے دیار میں مخدوم سو گیا

ڈاکٹر نوری

مخدوم کی وفات پر

آہ مخدوم بھی روانہ ہوئے
دیکھیے منزل بقا کی کشش

یوں ہی آئے تھے ہیں یہ آحباب
کھینچ لائی غم آشنا کی کشش

اثر انداز اس پہ ہو نہ سکی
دولت و جاہ و اغنیا کی کشش

مرض دل تو اک بہانہ تھی
دل میں تھی اک کھلی فضا کی کشش

حیدرآباد سے سوئے دہلی
اس کو لے آئی تھی وفا کی کشش

لاش دہلی سے پھر دکن آئی
تھی یہ کس مرد باصفا کی کشش

اب بھی انسان کتنا عاجز ہے
کتنی ہے عالم بقا کی کشش

یہی مصرع ہے اس کا سال وفات
کتنی ہے عالم بقا کی کشش
۱۳۸۹ھ

اب نہ مخدوم آئیں گے نوری
بمبئی میں ہے کربلا کی کشش

صلاح الدین نیرؔ

الٰہی ختم نہ ہو یارِ غم گسار کی بات

(نذرِ مخدومؔ)

یہ کیسا دور ہے کیوں روشنی کا ماتم ہے؟
تری حیات تو خود موت پر بھی بار نہ تھی
"اجل پسند" ہوئی کونسی ادا تیری
یہ کون شہرِ نگاراں سے اٹھ گیا یارو!

جو ہونٹ کل تلک "گلِ تر" کی طرح کھلے ہوئے
وہ آج زرد سی پھولوں کی پتیوں کی طرح
ہوا کے زور سے مرجھا گئے ہیں کیوں یارو!
جو آنکھیں کل تھیں فروزاں ہماری محفل میں
دھواں دھواں سی ہیں بجھتے ہوئے دیوں کی طرح
جو موت پر سرِ پیکار تھی جس کے لیے
وہ آج سر بہ گریباں ہے زندگی کے لیے

اگرچہ شہر کی معروف شاہراہوں پر
سکوتِ مرگ ہے اجڑے ہوئے کھنڈروں کی طرح
اگرچہ شہرِ نگاراں کے کوچے کوچے میں
اداسی شامِ غریباں کی طرح چھائی ہے
مگر اصول، صداقت کی موت کیا معنی!
کبھی بھی دوستو سچائی مر نہیں سکتی
وہ شخص مر نہیں سکتا جو زندگی کے لیے
تمام عمر اجل سے نظر ملاتا رہا
وہ شخص مر نہیں سکتا جو روشنی کے لیے
تمام عمر الجھتا رہا اندھیروں سے
صداقت اس کے قدم چومتی رہی برسوں
کسی بھی دور میں جو مصلحت شناس نہ تھا
زمیں بدلتی رہی وقت بھی بدلتا رہا
نہ آیا فرق تری "شانِ کج کلاہی" میں

ابھی تو پاس ہے تنہائی کا نہیں احساس
بساطِ قلب میں آہٹ ہے تیرے قدموں کی

نظر نظر میں اجالا ہے تیری آنکھوں کا
دلوں کے ساز کے پردوں میں ہے تری آواز
کرن کرن میں تبسم بکھر گیا ہے ترا
ہر انجمن میں تری روشنی کی یادیں ہیں

کسان مفلس و مزدور کے عزائم میں
شریک حال ترے بازوں کی قوت ہے
شعور جینے کا جس کو عطا کیا تو نے
جگر جگر ہے سورج کی روشنی کی طرح
وہ آج وقت کے ماتھے پہ جگمگاتا ہے
بہت سی زخمی نگاہوں کا تو مداوا تھا
دکھی دلوں کے لیے تو ترا سہارا تھا

شعور فکر و نظر کی جہاں بھی بات چلے
سنائی دے گا وہاں پر ترا لب و لہجہ
جہاں بھی شعر و ادب کی ہو بزم آرائی
وہاں پہ گونجے گی تیری سدا بہار آواز
"تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یارِ غمگسار کی بات" (مخدوم)

شاکر جدہ وی

نذرِ مخدوم

"بانکی ملنگن" تیرا یہ ہمدم زیر زمیں مٹی میں سوتا ہے[1]
اس کے شہر کا اک کوچہ تیری طرح اس کو روتا ہے
وہ اس شہر میں یوں تھا جیسے دل ہو کسی نازک پیکر میں
کوئی کرن چاندی کی جیسے آن بسے اک روپ نگر میں
اس کا شہر اب اس بن کتنا سونا سونا سا لگتا ہے
حافظ بن شیراز ہو جیسے غالب بن دلی ہو جیسے
ساگر[2] کے تٹ پر اس کی یادوں کے جگنو جاگ رہے ہیں
ٹھہر گئی ہیں نیلی موجیں وقت کے لمحے بھاگ رہے ہیں
وہ "کیپس" اور "ریٹیٹ"[3] میں اس کی جھلک اس کو ڈھونڈ رہی ہے
سب فنکار تو آ گئے لیکن اس کی اک کرسی خالی ہے
یار و ایسی جلدی کیا ہے مخدوم اب آتے ہی ہوں گے
"ہنگامہ" نظم بھی کوئی دلی سے لاتے ہی ہوں گے
لیکن یہ مخدوم کی کرسی خالی ہے اب بھر نہیں سکتی
ارض دکن اب شاید ایسا شاعر پیدا کر نہیں سکتی
چڑھتے سورج کی تابش سے جلتی ہوئی باہوں کا شاعر
بوجھل چٹانوں کا شاعر پتھریلی راہوں کا شاعر
سوئی ہوئی دھرتی کا شاعر جاگتے ایوانوں کا شاعر
جن کو کہے مزدور یہ دنیا ایسے انسانوں کا شاعر
جس نے دیا مخدوم سا شاعر وہ تحریک تو مر نہیں سکتی
رات کی ناگن کتنا چاہے اور اندھیرا کر نہیں سکتی

[1] مخدوم کی ایک مشہور نظم [2] حسین ساگر
[3] عابد روڈ کا ایک ہوٹل

سیّدہ مجیدہ

آہ! مخدوم

حیات خاک بسر، کائنات ششدر ہے
زمیں آہ بلب، آسمان مضطر ہے
قبائے لالہ و گل خاک و خوں میں تر ہے
چلے بھی آؤ کہ ہر سمت شورِ محشر ہے
تڑپ رہے ہیں دل و جاں تری صدا کے لیے
ترس رہا ہے جہاں عکسِ نقشِ پا کے لیے

فغاں کہ ہادیِ دوراں نظر نہیں آتا
امینِ صبحِ درخشاں نظر نہیں آتا
وہ جانِ بزمِ سخن داں نظر نہیں آتا
سوائے چاکِ گریباں نظر نہیں آتا
جفائے ہستیِ ناپائدار کیا کہیے
حدیثِ پیرہنِ تار تار کیا کہیے

چمن سے دور کسی نغمہ خواں پہ کیا گزری
بتا کہ سازِ دل و روح و جاں پہ کیا گزری
ترے نفس تری نبضِ رواں پہ کیا گزری
تری جبینِ تبسم فشاں پہ کیا گزری
سکوت توڑ! گلستاں کا ترجماں ہو جا
خدائے نغمہ! اسیرِ بزم نغمہ خواں ہو جا

زبانِ حق کے پیامی صداقتوں کے امام
نئی حیات کے رہبر نئی سحر کے پیام
خلوص و درد مجسم، شعور و فکر تمام
سخن کے مہرِ درخشاں ادب کے ماہِ تمام
ستمگروں کی کلائی مروڑنے والے
طلسمِ ظلمت و اوہام توڑنے والے

چمن کی روح رہا، حاصلِ بہار رہا
کہیں پہ صورتِ سیماب بے قرار رہا
کہیں پہ طوق و سلاسل سے ہمکنار رہا
معاف دہر میں مصروفِ کارزار رہا
ہر اک قدم تھا ترا عظمتِ بشر کے لیے
تمام رات پگھلتا رہا سحر کے لیے

ستم کہ نورِ سحر لوٹ کے نہ آئے گا
عروجِ شمس و قمر لوٹ کر نہ آئے گا
کمالِ فکر و نظر لوٹ کر نہ آئے گا
وہ شاعرِ "گلِ تر" لوٹ کر نہ آئے گا
ستم کہ درد و غم و یاس کی خدائی ہے
ستم کہ تا بہ ابد نور سے جدائی ہے

وقار خلیل

تیرے بعد

(مخدوم کی دائمی جدائی پر)

اور کجلا گئی دانش کی ضیاء تیرے بعد — کوئی تجھ سا تو نہیں ہے بخدا تیرے بعد

کتنی لرزاں نظر آتی ہے سر بام سخن — آرزوؤں کی دھنک رس کی نوا تیرے بعد

عارض و لب کی حسیں چھاؤں سے تا دشت جنوں — خاک اڑاتی ہوئی پھرتی ہے صبا تیرے بعد

اب وہ آواز کی خوشبو نہ گل تر کی مہک — لٹ گیا جیسے ترا شہر وفا تیرے بعد

رات کے دل میں دھڑکتا تھا سحر کی صورت — تیرے ابلاغ کا عرفان ہوا تیرے بعد

مٹ گئی جہد کی تنویر جنوں کی تحریر — فن کے ناخن ہوئے محتاج حنا تیرے بعد

تیرے اٹھ جانے سے یوں لگتا ہے اخلاص اٹھا — غم نے ہر موڑ پہ دی ہے یہ صدا تیرے بعد

دھوم تھی روشنئ فکر و نظر کی ہر سو — آج دھندلی نظر آتی ہے فضا تیرے بعد

کتنی سانسوں میں مچلتی ہے تری یاد ابھی — کتنے ہونٹوں پہ لرزتی ہے دعا تیرے بعد

ذکر چلتا ہی رہے ارض دکن پر تیرا — گونجتی ہی رہے تیری صدا تیرے بعد

جو گرانقدر اثاثہ ہے نئی نسلوں کا — دل کے نزدیک رہے گی وہ نوا تیرے بعد

"یادِ مخدوم" مہکتی رہے پھولوں کی طرح
سر جھکا کر یہی کہتی ہے صبا تیرے بعد

یوسف ناظم

احساس

(نذرِ مخدوم)

یہ بات ہے اس وقت کی جب تم نہ ملے تھے
پر جب بھی میں پڑھتا تھا کوئی نظم تمہاری
محسوس یہ ہوتا تھا کہیں تم سے ملا ہوں
ہر شعر یہ کہتا تھا پڑھو مجھ کو ٹھہر کر
میں درد بھرے دل کے دھڑکنے کی صدا ہوں
ہر لفظ سے ہر مصرع سے ہر شعر سے ہر دم
آواز یہ آتی تھی کہ تم غیر نہیں ہو
یہ بات ہے اس وقت کی جب تم نہ ملے تھے

اب جب کہ ملاقات کی ہر حد سے ہو باہر
احساس کی شدت وہی نرمی بھی وہی ہے
محسوس یہ کرتا ہوں کہ تم پاس کھڑے ہو
معلوم یہ ہوتا ہے کہ اب بول پڑو گے

جس یاد کی زنجیر میں تم بندھ چکے ہو
اس یاد کی زنجیر سے چھوٹو تو میں جانوں

غیاث متین

زندہ سورج

وہ صدیوں کا جاگا سورج
پلکوں کی دہلیز پہ کب سے نیند چھپائے
دل میں سب کا درد سجائے
بھٹک رہا تھا
دشت جہاں گلزار بنانے
آج اسی کی آنکھ لگی ہے
اسے جگانا ہار تمہاری
اسے بھلانا بھول!
سرخ سویرے کی کرنوں کو بانٹتے جس کی عمر کٹی
منعم کے کالے ہاتھوں کی
تحریریں جو پڑھ لیتا تھا
مزدوروں کی خاطر جس نے زیست کا سارا زہر پیا
جس کے نغمے خوشبو بن کر آج فضا میں پھیل گئے
ایسے بچھڑا
شاید ہی بچھڑا ہو کوئی
قبر میں تنہا چھوڑ کے اس کو لوٹنے والو
وہ نفرت بن کر زندہ ہے

اختر غوری

نذرِ مخدومؔ

ایک ٹرین

قلبِ نظم کے شہر سے
رواں ہوئی تھی اک ٹرین
ہزاروں لوگ ساتھ تھے
عجیب لوٹ مار تھی
کسی نے آستین لیے
کسی نے دل کی دھڑکنوں کا
آئینہ اٹھا لیا
کسان کھیت اور ملوں کی
صورتیں بدل گئیں
مگر جو خالی ہاتھ تھے
وہ اس کو دیکھتے رہے
ٹرین تیز ٹرین تھی
دھواں اڑا کے چل پڑی

نصرت یوسف زئی

مخدوم

ادیبو، شاعرو، دانشورو، فنکارو، نقادو
جہاں بھر کے زباں دانو
خدارا اپنے الفاظ مجھ کو دو
کہ جن پر ناز ہے تم کو
مجھے اک خاص غم کا
آج کچھ اظہار کرنا ہے

نہیں ہے؟
کچھ نہیں؟
کچھ بھی نہیں؟

تو سن لو اے مرے دوستو
کسی فنکار کے
اس جسمِ خاکی کو
گلوں سے ڈھانک کر رسماً
سپردِ خاک کر دینا
یہ رسمِ موت ہو تو ہو
مگر یہ موت ہو سکتی نہیں
مخدوم مر سکتا نہیں!!

انجم عارفی

افق کا راہی

یہ شور کیسا یہ کیسا ماتم سا ہو رہا ہے شاعر کے مر رہا ہے
وہ اپنی آنکھوں کو بند کر کے "نئی غزل" گنگنا رہا ہے

غموں کی شبنم میں بھیگ کر بھی بہار تازہ کی لاج رکھ لی
سکھا کے آداب زندگانی وہ آج گلشن سے جا رہا ہے

وہ "سرخ پرچم" کی سلوٹوں میں گلوں کی خوشبو سے مہکا مہکا
دعائیں اہل جہاں کی لے کر حضور یزداں میں جا رہا ہے

یہ سونی سونی سی بزم انجمن اداس ہے کائنات ساری
دکھا کے دل کو رلا کے ہم کو افق کے اس پار جا رہا ہے

نصیر حیدر آبادی

سُرخ ستارہ

(کامریڈ مخدوم کی نذر)

کشتی کا محافظ تھا بڑھتا ہوا دھارا تھا
اٹھے تو بنے طوفاں ٹھہرے تو کنارا تھا

منزل کا نشاں تھا وہ راہوں کا سہارا تھا
اک صبح درخشاں کا ابھرا ہوا تارا تھا

مزدور کا بازو تھا دہقاں کا پسینہ تھا
عظمت کی درانتی تھا ہمت کا ہتھوڑا تھا

ابوالخیر صبا

یادِ مخدوم

آج دل نالہ کناں ہے آنکھ بھی نمناک ہے
آج اپنوں اور بیگانوں کا دامن چاک ہے
ہاں وہی مخدوم بھی دل میں جگہ جس کے لیے
ہائے اس کو دیکھیے صبا سپردِ خاک ہے

کنجِ تنہائی میں ہم روتے رہیں گے صبا
سب کو تڑپائے گی محفل میں تو یادِ مخدوم
مسکرائیں گے جو دنیا کو بنانے کے لیے
ٹمٹمائیں گی مگر دل میں تو یادِ مخدوم

یٰسین غسلی خاں

یادِ مخدوم

(مخدوم کے بعد پہلی عید کے موقع پر)

جہاں بھی جب بھی مل بیٹھے ہماری عید ہوتی تھی
جو دن تھا عید کا تھا۔ شب گزاری عید ہوتی تھی

خلوص و پیار کی دنیا ترے نغموں میں ڈھلتی تھی
ہماری عید اے مخدوم پیاری عید ہوتی تھی

امرت امروہوی

مخدوم محی الدین کی اچانک موت سے متاثر ہوکر

مرگِ مخدوم کی آئی جو خبر کانوں میں
دفعتاً دل یہ پکار اٹھا کہ ہائے مخدوم

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتی رہی
صورتِ امن و وفا بن کے صدائے مخدوم

اس کا پیغامِ محبت تھا زمانے کے لیے
مر نہیں سکتی ہے اے دوست نوائے مخدوم

راز عرشوی

کیا ہو گیا قرباں کوئی پروانۂ جاں سوز
اس بزمِ خرابات کے مدھم جو دیے ہیں

ہر سمت سے کانوں میں یہی آتی ہے آواز
مخدوم ترے غم نے نئے زخم دیے ہیں

نامی انصاری

بت کدے میں صنم سے رونق تھی
بزم میں جامِ جم سے رونق تھی

حیدرآباد کیوں نہ سوگ میں ہو
شہر میں اس کے دم سے رونق تھی

علی الدین نوید

نذرِ مخدوم

وہ ایک انساں —
دکن کے ماتھے پہ علم و فن کا دمکتا سورج
کہیں مسیحا!
کہیں مجاہد!
وہ نسلِ نو کا عظیم قائد!!
عظیم شاعر —
کہ جس نے شعروں کے بانکپن سے حیاتِ نو کا نظام بدلا
گلوں کے رخ پر دھنک کا غازہ
کلی کلی فسردہ ہونٹوں کو مسکراہٹ کا نور بخشا
چمن چمن کو بہارِ نو کا پتہ بتایا
وہ اک مسیحا
کہ جس کی آنکھوں میں لعل کی تھی علیل ڈھانچوں کے دل کی دھڑکن
سسکتی آنکھوں کے روزنوں سے
لہو کے تازہ گلاب چنتا

دلوں کے زخموں کے چاک سیتا
گزر رہا تھا
وفا کی پُر پیچ رہگزر سے
صلیبِ دوراں کا بوجھ اٹھاتا
قدم قدم پر لہو کے تازہ دیئے جلاتا
وہ اک اُجالا —
اندھیری راتوں کی گھاٹیوں میں
مثالِ نورِ سحر تھا رقصاں
وہ ساتھ اک کائنات لے کر
چلا تھا چلتا ہی جا رہا تھا
مگر اچانک نظر سے اوجھل وہ ہو گیا ہے
"نئے سویرے" کی جستجو میں
افق کے اس پار کھو گیا ہے!!!

ایم ۔ کے ۔ معین الدین

مخدوم کے آخری دو دن

جناب خواجہ معین الدین کسان سبھا آندھرا پردیش کی عاملہ کے رکن اور کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ روپوشی کے دنوں میں جب کہ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی تھی کامریڈ معین نے مخدوم محی الدین کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ مخدوم کے انتقال کے وقت وہ دہلی میں تھے۔ ہسپتال میں مخدوم کی شرکت اور ان کے انتقال کے وقت کو کامریڈ معین الدین نے قلمبند کیا ہے۔ (ادارہ)

میں اپنے لڑکے سجاد ظہیر کو جو لومبا یونیورسٹی میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے ماسکو جا رہا تھا وداع کرنے کی غرض سے دہلی گیا ہوا تھا۔ ۲۴ اگست اتوار کی صبح کوئی ۱۰ بجے کا وقت تھا، میں اخبار بینی میں مصروف تھا کہ اچانک جارج نے جو کمیونسٹ پارٹی کے صدر دفتر کے بس کے انچارج ہیں مجھے اطلاع دی کہ پارلیمنٹری آفس کے سکریٹری مسٹر راجن نے مجھے فوری بلایا ہے۔ میں جب مسٹر راجن کے پاس پہنچا تو اس نے کہا ابھی ابھی کامریڈ سی۔ راجیشور راؤ کا فون آیا ہے کہ مخدوم محی الدین کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے اور انہیں ہسپتال میں شریک کر رہے ہیں۔

راجن کی اطلاع نے مجھے گم صم کر دیا۔ ایک دن قبل یعنی سنیچر کو سہ پہر کے وقت مخدوم سے ملا تھا اور کافی دیر تک بات چیت کے دوران انھوں نے میرے لڑکے سجاد ظہیر کی روانگی کے انتظامات کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ میں ابھی راجن سے کامریڈ راجیشور راؤ کی ٹیلیفون پر پہنچائی ہوئی خبر کے بارے میں تفصیلات دریافت کر رہا تھا کہ ایک ٹیکسی ہمارے سامنے آکر رکی۔ اس میں راجیشور راؤ اور راج بہادر گوڑ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ موٹر میں پچھلی نشست پر مخدوم ہیں اور وہ پسینہ میں شرابور ہیں۔ ان کے چہرے کی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ سخت بے چینی کے عالم میں ہیں۔ میں فوراً ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ہم فوراً ارون ہسپتال پہنچے۔ ایک اسٹریچر پر لٹا کر مخدوم کو ایمرجنسی وارڈ میں پہنچایا گیا۔ وہاں بستر نمبر ۸ پر انھیں لٹا کر راج اور چندا نے ڈاکٹروں کو بلایا۔ مخدوم کو فوری طور پر آکسیجن دی گئی۔ درد کا احساس زائل کرنے کے لیے مارفیا کا انجکشن دیا گیا [illegible] ہسپتال میں مخدوم کی شرکت کے سلسلہ میں ایک فارم کی خانہ پری کرنی تھی۔ میں نے بھی فارم میں [illegible] اندراجات کیے [illegible] راجن ڈاکٹر [illegible]

سرینگر کے لیے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد جب وہ لوٹے تو تشویش [illegible] ڈاکٹر گپتا ان کے ہمراہ تھے۔ ڈاکٹر گپتا نے ان کا تفصیلی معائنہ
کیا اور ان کی ہسٹری پوچھی۔ میں نے اندازے سے کہا ۶۲ سال۔ اس پر فوراً مخدوم نے کروٹ بدلی اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا نہیں ۱۶ برس۔
ڈاکٹر گپتا اور پاس کھڑے ہوئے سب ہی لوگ ہنس پڑے۔ ڈاکٹر گپتا نے جب مخدوم سے کیفیت پوچھی تو مخدوم نے بتایا کہ گزشتہ ۲۰ دنوں سے
وہ حلق میں جلن محسوس کر رہے تھے جو اب بڑھ گئی۔ تو عجیب بات یہ ہے کہ مخدوم کو ۲۰ دن سے حلق میں تکلیف تھی مگر انھوں نے حیدرآباد
میں کسی سے اس کا ذکر [illegible] ڈاکٹر نے انھیں انجکشن دیے، آرام کرنے کی نصیحت کی اور چلا گیا۔ غالباً انجکشن موثر ثابت
ہوا۔ مخدوم کا سینہ [illegible] مسلسل [illegible] اور بے چینی بھی [illegible] تھی [illegible] میں نے فوراً اسپتال سے باہر آ کر حیدرآباد کو
ٹرنک کال کیا [illegible] مخدوم کی علالت کی خبر دی۔ دوپہر میں ڈاکٹر [illegible] نے ان کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد مخدوم
سے مختصر بات کی [illegible] کارڈیوگرام لگایا [illegible] ڈاکٹر اور دوسرے [illegible] گراف دیکھنے کے لیے
بے چین تھے۔ ڈاکٹر گپتا نے [illegible] لیکن جب واپس ہوئے تو ان کے
چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا [illegible] چہرہ کی حالت آنے والے خطرناک [illegible] تھا کھٹکا لیکن ہمارے کریدنے
کے باوجود [illegible] نے ہم سب کو [illegible] گلوگیر تھی۔ اس اثنا میں گوہر
کی [illegible] کا عجیب حال تھا [illegible] اسپتال میں ہوتا تو دوسرا پیر پارٹی آفس میں [illegible] مخدوم [illegible] انھوں نے مجھ سے
دوبارہ سجاد ظہیر کی روانگی کے بارے میں [illegible] یونیورسٹی میں داخلہ دلوا [illegible] مخدوم
کی [illegible] کو کافی دخل حاصل تھا) شام تک دہلی کے ادبی اور سیاسی حلقوں میں مخدوم کی علالت کی خبر پھیل گئی اور مخدوم کے دوست
احباب اور پرستار عیادت کے لیے اسپتال آنے لگے۔ رات کو مخدوم نے مجھ سے پوچھا "ڈاکٹر [illegible] کے بارے میں کیا
تشخیص کی ہے" میں نے [illegible] کو چھپاتے ہوئے کہا کوئی خاص بات نہیں معمولی قسم کی شکایت ہو گئی ہے۔ مخدوم کے ہونٹوں پر
مسکراہٹ پھیل گئی [illegible] مسکراہٹ انتہائی پھیکی تھی۔ کہنے لگے "دیکھو [illegible] دل میں درد [illegible]
[illegible] حلق میں [illegible] سوزش برقرار ہے۔ رات ہم لوگوں نے بے چینی سے وقت گزارا۔ [illegible] عابد [illegible]
وقفہ وقفہ سے جاگنے کا پروگرام بنایا تھا مگر [illegible] ہم سب جاگتے رہے۔ مخدوم نے دو ایک بار آنکھیں کھول کر
ہمیں دیکھا اور پھر سو گئے۔ دوسرے دن یعنی ۲۵ اگست کو سویرے [illegible] مخدوم [illegible]
[illegible] اور [illegible] کو چائے پلانے کے لیے بھیج دیا۔ [illegible]
[illegible] تکلیف ہو رہی ہے [illegible]
[illegible]
[illegible] مسجد اقصیٰ [illegible]
لگے "عجیب مسلمان ہو یار تم بھی [illegible] بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ بھی نہیں [illegible]
[illegible] کچھ دیر بعد گوہر [illegible] ڈاکٹر [illegible]

کہیے کیسے مزاج ہیں؟ مخدوم بولے۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ حلق میں جلن یا سینے میں بے چینی کچھ بھی نہیں ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر چٹانی انھیں آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلے گئے۔ راج نے جن کا چہرہ سُتا ہوا تھا مجھے ایک طرف کونے میں لے جا کر کہا حالت خطرے سے باہر نہیں ہے جسم اب بھی ٹھنڈا ہے۔ انجکشن سے خون کے دباؤ پر کنٹرول کیا جا رہا ہے۔ احتیاط لازمی ہے۔ آئندہ چند گھنٹوں کے بارے میں پیش قیاسی کرنے سے ڈاکٹر بھی احتراز کر رہے ہیں۔ راج کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ مجھ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ مخدوم کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ یادوں کا پیکر بنتا ہوا میری نظروں میں گھومنے لگا۔ مخدوم کی رفاقت پر مجھے ہمیشہ ناز اور فخر رہا ہے۔ میرا ذہن بھی تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ راج نے میرے شانوں کو ہلاتے ہوئے کہا میں نے حیدرآباد کو ڈاکٹر بہ مانی کو فون کر دیا ہے نصرت اور اس کی والدہ کو بذریعہ طیارہ روانہ کرنے کے لیے کہا ہے۔ وہ لوگ آج شام آجائیں گے۔ تم ایرپورٹ جا کر انھیں لے آنا۔ سہ پہر کو ڈاکٹر بھٹاچاریہ آئے۔ انھوں نے تفصیل سے معائنہ کیا اور بعض ہدایتیں دیں۔ سہ پہر کے بعد مخدوم کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ ان کے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ دوبارہ کارڈیوگرام لیا گیا۔ انھیں فوراً اسپیشل وارڈ ۳۸ سے ۳۵ میں منتقل کر دیا گیا اور آکسیجن و گلوکوس دی جانے لگی۔ اس وقت راج، راجیشور راؤ، حیدری، اسد اور دیگر کچھ لوگ اطراف کھڑے تھے۔ مخدوم کی سانس کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ سخت بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ ڈاکٹر چٹانی مجھ کو ایک طرف لے گئے اور بتایا کہ خون کا دباؤ مسلسل گرتا جا رہا ہے۔ دل کے دونوں بازوؤں میں رکاوٹ ہو گئی ہے اور مرض لاعلاج ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر چٹانی کی ہدایت پر مخدوم کے ڈوبتے دل کا الکٹرک مساج بھی کیا گیا۔ اس اثنا میں بدم یلا ریڈی اور موہیت سین بھی پہنچ گئے۔ میں نصرت اور ان کی والدہ کو لینے کے لیے طیران گاہ بالم کو چلا گیا۔ شام کو پونے سات بجے وہ آئے۔ میں نے مصلحتاً انھیں پارٹی آفس میں اتارا لیکن تھوڑی دیر بعد ہسپتال سے راج نے کہلا بھیجا کہ نصرت اور مسز مخدوم کو ہسپتال میں لایا جائے۔ ہم لوگ جب وہاں پہنچے تو مخدوم کی حالت بڑی حد تک بگڑ چکی تھی۔ سانس کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ مخدوم اب ہم میں نہیں رہیں گے۔ مسز مخدوم نے اپنے شوہر کے پاس پہنچ کر پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ آنکھیں کھولیں پھر فوراً ہی انھوں نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ نصرت باپ کے قریب دانتوں میں دستی دبائے اپنی چیخوں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب کی آنکھیں نم تھیں۔ سب کے چہرے آنے والے خوفناک لمحات کے تصور سے زرد تھے۔ ہونٹ بند تھے سارے کمرے کی فضا بوجھل تھی۔ ایک طرف سے آکسیجن اور دوسری طرف سے گلوکوس متواتر پہنچایا جا رہا تھا۔ امید و بیم کی حالت میں شام کے ساڑھے سات بج گئے۔ نصرت سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے قریب پہنچ کر کان میں کہا "چچا ابا! چچا ابا!" شاید ان ہی الفاظ کے سننے کے لیے ان ہی لمحات کو حاصل کرنے کے لیے مخدوم کے جسم و روح کے درمیان سانس کی ڈوری بندھی ہوئی تھی۔ بعض دفعہ ایک لمحہ بھی جاودان بن جاتا ہے۔

اس کے کچھ دیر بعد ٹھیک آٹھ بج کر ۲۰ منٹ پر طائر نفس قفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔ سیاست اور ادب کا ملا جلا باب بند ہو گیا۔ بساط رقص اٹھ گئی۔ مخدوم کے پرسکون چہرے کو دیکھ کر مسٹر بل نے کہا:

"جانے والے سپاہی سے پوچھو وہ کہاں جا رہا ہے"

مخدوم کی نعش کو رات بھر ہسپتال میں رکھا گیا۔ دوسرے دن یعنی ۲۶ اگست کی صبح ہم نے نعش حاصل کی اور ریاست

کو کمیونسٹ پارٹی کے پارلیمنٹری آفس ونڈسر پلیس پہنچایا۔ جہاں عوام کو ان کے آخری دیدار کا موقع فراہم کیا گیا۔ بڑی تعداد میں اراکین پارلیمنٹ، سیاستدانوں، ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، طلبا، اساتذہ، ٹریڈ یونین قائدین، مزدوروں، کسان اور ہزاروں پرستاروں نے ونڈسر پلیس پہنچ کر ہر دلعزیز شخصیت کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مخدوم کا آخری دیدار کرنے کے لیے وہاں پہنچنے والوں میں کامریڈ ایس۔ اے۔ ڈانگے، مسٹر کے۔ برہمانند ریڈی، مسٹر غلام محمد صادق، ڈاکٹر ادھیکاری، ڈاکٹر ایم چنا ریڈی، مسٹر ٹی انجیا، بیرسٹر اکبر علی خاں، مسٹر بھوپیش گپتا، مسٹر ہیرن مکرجی، ڈاکٹر زیڈ اے احمد، وی کرشنا راؤ، مسٹر تھما ریڈی، مسٹر کونڈہ لکشمن باپوجی، ڈاکٹر ملکوٹے، مسٹر بدم یلا ریڈی، مسٹر دیسائی، شریمتی لکشمی کانتا، شریمتی وِملا دیوی، مسٹر خواجہ احمد فاروقی، شریمتی سرلا شرما، مسٹر راجو، مسٹر جوشی، شریمتی ارونا آصف علی، مسٹر کانتیا، مسٹر کمریا اور کئی دیگر ممتاز اصحاب شامل تھے۔ سب سے آخر میں مسز اندرا گاندھی نے دیدار کیا۔ ممتاز شاعر حضرت ساغر نظامی کو اطلاع ملی تو بستر علالت سے اٹھ کر آگئے مخدوم کے چہرے کو دیکھا اور بلک بلک کر رونے لگے۔ دن کے ۱۱ بجے نعش کو ایک ڈبے میں بند کر دیا گیا اور ٹھیک ۱۲ بجکر ۵ منٹ پر طیارہ مخدوم کی نعش کو لے کر حیدرآباد کی سمت روانہ ہوگیا۔ میرے "میرے حضرت" مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گئے۔ میں نے سنا تھا کہ دلی کئی بار اجڑی ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اجاڑتی بھی ہے۔ اس نے مخدوم کے گھر کو ہی نہیں اجاڑا — ہزاروں لوگوں، مخدوم کے مداحوں کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو اجاڑ دیا ہے — میں فوراً دلی سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہوگیا۔

آخری سفر

... کہ وہ کلیدِ رونقِ ہر انجمن تو کھو گیا

کیلنڈر کا ۲۵ ۔ اگست ۱۹۶۹ء کا صفحہ الٹ گیا ۔ اور ۲۶ ۔ اگست کا آفتاب طلوع ہوگا ۔ ۲۵ ۔ اگست ، جانے کتنی "حسرت سامانیوں" کی یادیں دے گئی لیکن ، اس کی سب سے کاری ضرب "اہل حیدرآباد" پر پڑی ۔ اس منحوس تاریخ نے ، حیدرآباد کے عوام سے ان کے محبوب رہنما ، ان کے ہمدرد و دوست اور ان کے ہمدم ... مخدوم کو چھین لیا تھا ۔ اگست کی رات کے ۸ بجے ، ٹرنک کال پر راج نے بھرّائی ہوئی آواز میں پارٹی کے مغموم و مضطرب کارکنوں کو یہ دہشت ناک خبر سنائی کہ "بساطِ رقص" کے خالق نے ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کر لی ہیں ـــــ !!

مخدوم کی رفیقۂ حیات محترمہ رابعہ مخدوم ... ان کے ... لڑکے نصرت محی الدین ، ۲۵ ۔ اگست کی سہ پہر ہی میں ، طیارہ کے ذریعہ دہلی روانہ ہو گئے تھے ۔ اور ان دونوں کو بھی مخدوم کا دیدار اس وقت نصیب ہوا ، جبکہ موت کے بڑھتے ہوئے سرد ہاتھ نے مخدوم کے ہونٹ سی دیئے تھے ۔ راج کا ٹیلیفون ملتے ہی ، اخبارات کو "کلیدِ رونقِ انجمن مخدوم" کے سانحۂ ارتحال کی خبر پہنچادی گئی ۔ اور اسی اثنا میں ، ٹیلی پرنٹر نے بھی یہ آگ اُگل دی ۔

کامریڈ جھنڈرے نے میت کے استقبال ... شروع کر دی تھیں ، پارٹی آفس میں بیٹھے ہوئے ضابطہ ... کارکنوں کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی لڑی بندھ گئی ۔ راج کی لڑکی ... کی حیثیت ... چھوٹی کلارا ، ... زبان میں "مخدوم چاچا" کو آواز دے رہی تھی ... ٹھہر ٹھہر کر ... روتے ... کے عالم میں ... کامریڈ یوسف آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ... سینہ کے اندر پھٹ جانے والے جوالا مکھی کی عکاسی کیا کر رہا تھا ۔ کامریڈ جھنڈرا ... دوسروں کو دلاسہ دیتے دیتے خود ہی اشکبار ہو جاتے ۔ جنرل سکریٹری راج ... رنجیدہ ... جھکے جھکے ... جا رہے تھے ۔ کامریڈ امجد باغی اپنی روایتی پھرتی کا مظاہرہ تو کر رہے تھے ، لیکن ... ہیں ۔ کون جانے کس پر کیا گذری ۔ اور یہ رات کس نے کس طرح کاٹی !!

صبح ہوئی تو ، تمام اخبارات میں مخدوم کے انتقال کی خبر ، ماتمی حاشیہ اور جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہو چکی تھی ، اور ان لوگوں کو بھی جو رات کے طوفان سے ناواقف تھے اندازہ ہو چلا تھا کہ ... نے کیا چیز چھین لی ۔ اخبارات میں مخدوم کے جسدِ خاکی کو ذریعۂ طیارہ لائے جانے ... پروگرام بھی چھپا تھا ۔ اور اب سوگواروں کی نظریں ... طیران گاہ کی طرف اٹھ رہی تھیں ۔

دہلی میں بھی رات بھر ہزاروں افراد نے مخدوم کا آخری دیدار کیا۔ صبح تک بھی قطاریں ٹوٹی نہیں۔ ان عقیدت مندوں کے اس عظیم المرتبت رہنما کو نظر بھر دیکھ لینے کے آرزومندوں کی ایک لمبی قطار لگ گئی۔ آندھرا پردیش کے چیف منسٹر ڈاکٹر چنا ریڈی بھی ان دنوں دہلی ہی میں تھے، مخدوم کے انتم درشن کیلئے آئے اور انہوں نے اس بیباک، بے لوث اور مخلص سیاسی حریف کو ساکت و سامت ابدی نیند میں سویا دیکھ کر، ان کے آنسو بھی نہ رک سکے۔ مرکزی نائب وزیر قانون جناب یونس سلیم، نے بھی عقیدت کے پھول چڑھائے۔ ان کے علاوہ، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کی ایک بڑی تعداد بھی، ملک کے اس عظیم دانشور کو آخری مرتبہ رخصت کرنے کیلئے پارٹی پارلیمنٹری آفس پر موجود تھی۔ پارٹی کے جنرل سکریٹری [illegible] راجیشور راؤ رنج و غم سے چپ چاپ کھڑے تھے!

دہلی کے پالم کے طیران گاہ بیگم پیٹ پر پہنچنے تک ایک محتاط اندازہ کے مطابق، پانچ سات ہزار سوگوار، جن میں مزدوروں کے علاوہ، دانشور، شاعر، سرکاری حکام، سیاسی پارٹیوں کے نمائندے سبھی شامل تھے۔ طیران گاہ پر موجود تھے۔ مخدوم اب کی دفعہ آئے نہیں لائے گئے ——— [illegible] رکھ کر [illegible] رفیق بزم کے تابوت کے ساتھ۔ اسی طیارہ میں دہلی سے حیدرآباد تک کا سفر طے کیا تھا۔ حیران، پریشان! [illegible] بالقصد [illegible] بنا ہوا مخدوم نے اسے جلیل القدر شوہر کو ہنستا بشاش [illegible] ہوئے دیکھا تھا، اور اب وہی مخدوم کے تابوت کے ساتھ واپس ہو رہی تھیں۔ جب وہ طیارہ سے اتریں تو طیران گاہ [illegible] ماتم کدہ بن گئی۔ کون کس کو پرسہ دیتا!! [illegible] کا زور ٹوٹا تو کہا، مخدوم زندہ ہے، اور کہا مخدوم امر ہے "کے نعرے گونجنے لگے۔ [illegible] مرد، عورتیں اور بچے ملک [illegible] [illegible] دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ طیران گاہ [illegible] نے، احتراماً اپنی [illegible] راج کا [illegible] اور [illegible] کر فریاد کناں کہ [illegible] مخدوم کی میت کے [illegible] کئی خواتین نے [illegible] روئیں، لیکن ان کے جذبات کو کون پکڑ سکتا تھا۔ وہ تو آہ و نالہ کی منزل سے گذر کر مجسموں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ کام کاج چھوڑ کر، اپنے قائد کو آخری منزل تک پہونچانے والے مزدوروں کی قوت [illegible] آگے، لوہا اور فولاد بھی سر جھکا دیتا ہے، دہاڑیں مار کر رو رہے تھے، نصرت اور بیگم مخدوم کی حالت تو دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ مخدوم صاحب کے دوست احباب، رشتہ دار سر جھکائے آنسو پونچھتے ہوئے ——— پیشانی پر ایک سوالیہ نشان "کیا واقعی مخدوم مر گئے ہیں ——— مخدوم جیسا کوئی آدمی کہیں مر بھی سکتا ہے؟"

مخدوم صاحب کی میت کو، ایک بڑے ٹرک پر رکھا [illegible] اس پر سرخ پرچم ڈال دیا گیا۔ وہ پرچم جسے مخدوم نے ہمیشہ سربلند و سرفراز رکھا۔ آج بھی وہ اسی میں لپٹا ہوا، آخری سفر کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی نے، اپنے لیڈر پر چادر گل چڑھائی اور ان گنت تنظیموں نے، پھولوں کا ڈھیر لگا دیا۔ مخدوم کے جسد خاکی کو لی ہوئی ٹرک، موٹروں کے ایک بڑے کارواں کے ساتھ ان کی قیام گاہ، ایم ایل اے کوارٹر کو لائی گئی۔

اس اثناء میں ایم ایل اے کوارٹر پر، سوگواروں کی ایک بھیڑ لگ گئی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کے کارکن، دوسری [illegible] انجمنوں کے نمائندے، مدیران جرائد، صحیفہ نگار، مزدور، عورتیں، نوجوان، بوڑھے، بچے سبھی سوگ میں [illegible] ایم ایل اے کوارٹر کے

باب الداخلہ پر پہنچا تو، پھر ایک بار شور ماتم بپا ہو گیا ..... عقیدت مندوں سے اپیل کی جا رہی ہے کہ غسل میت کے لئے وہ شامیانہ خالی کر دیں، لیکن، کوئی ہٹتا ہی نہیں۔ بمشکل تمام پارٹی کے کامریڈز نے، ایک ایک کی منت سماجت کر کے شامیانہ خالی کرایا۔ اور غسل میت و دیگر مراسم کی ادائی کے بعد شام کے ۴ ½ بجے جلوس جنازہ ایم ایل اے کوارٹرز سے، پارٹی آفس حمایت نگر کو روانہ ہوا۔ ٹرک میں مخدوم کے دونوں صاحبزادوں نصرت اور ظفر کے علاوہ کامریڈ راج، کامریڈ مہندرا اور مشہور انقلابی شاعر نیاز حیدر کھڑے تھے، راستہ میں دو رویہ کھڑے ہوئے ہزاروں افراد نے، اپنے محبوب قائد کا بادیدۂ نم، آخری دیدار کیا۔ پارٹی آفس پر ٹرک ٹھہرا تو، مزدور تنظیموں کے نمائندوں نے "مخدوم امر ہے" کے نعروں میں پھولوں کی اَن گنت چادریں چڑھائیں۔ اور شام کے ۵ ½ بجے جلوس جنازہ نمائش میدان روانہ ہوا۔ جہاں دیدار عام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ جلوس کے آگے، دو موٹر سائیکلیں، اور پیچھے دو ٹرک اور بے شمار موٹر گاڑیاں تھیں اور ہزاروں ہندو مسلم سکھ عیسائی، شاعر، ادیب، دانشور، پروفیسر، اساتذہ، کمیونسٹ قائدین، ٹریڈ یونین کارکن اور خواتین سر جھکائے چل رہے تھے۔ جلوس جنازہ حمایت نگر، کنگ کوٹھی، عابد روڈ اور معظم جاہی مارکٹ سے ہوتا ہوا۔ تقریباً دو گھنٹے میں نمائش میدان پہنچا۔ سڑکوں اور عمارتوں پر کھڑے ہوئے ان گنت لوگوں نے مخدوم کو خاموش خراج عقیدت پیش کیا۔ نمائش میدان میں آخری دیدار کے خواہشمندوں کا اتنا بڑا ہجوم تھا کہ، پولیس اور پارٹی کے کارکنوں کو اسے قابو میں رکھنے کے لیے خصوصی انتظامات کرنے پڑے۔ نمائش میدان میں بھی، پھولوں کی بے شمار چادریں چڑھائی گئیں۔

رات کے ۸ بجکر ۱۰ منٹ پر، ٹرک ہی میں میت مسجد مالاکنٹہ کو لائی گئی اور مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنے کے خواہشمند اصحاب کا ایک بے پناہ ہجوم تھا۔ مسجد کے باہر بھی سوگواروں کی ایک بڑی تعداد کھڑی تھی۔ ۸ ½ بجے شب جلوس جنازہ آخری منزل احاطہ درگاہ حضرت شاہ خاموشؒ کو روانہ ہوا۔ راستہ میں، ہر مذہب، ہر عقیدہ، اور ہر مکتب خیال کے ماننے والوں نے کندھا دیا اور رات کے ساڑھے دس بجے مخدوم کو، اس کے ان گنت چاہنے والوں نے، آنسوؤں کے دھندلکے میں سپرد لحد کر دیا ——— اور رات گئے ان الفاظ کی صدائے بازگشت میں اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوئے کہ ؎

• مخدوم دانشوروں کے لیے لائبریری، تہذیب و تمدن کے پرستاروں کے لیے
ایک میوزیم ——— انقلابیوں کے ایک اسلحہ خانہ تھا اور زمانہ ایک عرصہ دراز
تک ایسی متنوع اور ہمہ گیر شخصیت پیدا نہ کر سکے گا۔

مخدوم ۔ ایک عظیم دانشور، ایک بے مثال شاعر اور ایک جلیل القدر لیڈر

ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور ٹریڈ یونین تنظیموں کی جانب سے مخدوم کو خراجِ عقیدت

مخدوم محی الدین کے انتقال پر ملال نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے وابستہ اداروں اور افراد کے علاوہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان کے لاتعداد قدردانوں کو بے حد متاثر کیا ہے ان کے سوگواروں میں ریاستی گورنر، صنعتی اداروں کے حکام، اعلیٰ سرکاری عہدیدار، ادیب، شاعر، دانشور، مزدور غرض ہر قسم اور ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد پورے دو مہینوں تک بیگم مخدوم، جناب مخدوم کے صاحبزادہ نصرت محی الدین اور ریاستی کمیونسٹ پارٹی کو جو پیامات تعزیت وصول ہوتے رہے ہیں ان کی فہرست بڑی طویل ہو جائے گی۔ نیا آدم کوتاہی داماں کے اعتراف کے ساتھ ان میں سے چند ایک پیامات شائع کر رہا ہے۔

- کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی بہار اسٹیٹ کونسل نے مخدوم کے سانحۂ ارتحال کو ایک صدمۂ جانکاہ قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ پٹنہ کے متعدد سیاسی، تہذیبی اور ادبی اداروں نے مخدوم کے سوگ میں تعزیتی جلسے منعقد کیے۔ پارٹی کی اسٹیٹ کونسل کے دفتر پر بھی ایک تعزیتی جلسہ کامریڈ یوگیندر پرشاد ایم پی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ پٹنہ کے شہریوں اور ادیبوں کے زیر اہتمام بھی ۲۶ اگست کو مخدوم کا تعزیتی جلسہ بلایا گیا جس کی صدارت ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری کنہیا جی نے کی۔ متعدد صحافیوں، ادیبوں، شاعروں نے مخدوم کی ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔
- ضلع کمیونسٹ پارٹی امراوتی کے زیر اہتمام منعقدہ تعزیتی جلسہ میں ایک قرارداد تعزیت کی منظوری عمل میں لائی گئی۔ متعدد مقررین نے کہا کہ مخدوم کی رحلت سے صرف ان کے بال بچے ہی نہیں ہندوستان کے لاکھوں محنت کش ملول ہیں۔
- کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مغربی بنگال کونسل نے ایک تعزیتی ٹیلیگرام روانہ کیا جس میں کہا ہے کہ اسٹیٹ کونسل آندھرا پردیش کے عوام اور مخدوم کے افراد خاندان کے غم میں برابر کی شریک ہے۔
- کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی کرناٹک اسٹیٹ کونسل کے تعزیتی پیام میں کہا گیا ہے کہ کامریڈ وشل راؤ اور کامریڈ سیتا راما ریڈی کے سانحۂ ارتحال کے زخم مندمل بھی نہ ہونے پائے تھے کہ کامریڈ مخدوم کی وفات کا کوہِ غم ٹوٹ پڑا۔ یہ ہندوستان کے کمیونسٹوں کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ ملک ایک عظیم دانشور، ایک بے مثال شاعر اور محنت کشوں کے حقوق کے ایک بے باک محافظ سے محروم ہو گیا ہے۔

ادارے

سکریٹری انڈو کلچرل سوسائٹی حیدرآباد

سکریٹری انڈو کلچرل سوسائٹی حیدرآباد نے مسز نصرت محی الدین کے موسومہ مکتوب میں لکھا ہے کہ

"آپ کے والد ماجد کے انتقال نے ہمارے ملک اور بالخصوص ہماری ریاست کے ثقافتی شعبہ میں سناٹا پیدا کر دیا ہے۔ وہ انڈو کلچرل سوسائٹی سے وابستہ اور اس کی تمام سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ مخالف فسطائی جدوجہد کے ضمن آغاز دور ہی سے وہ ہندوستان اور سوویت یونین کے عوام کے مابین دوستانہ رابطہ پیدا کرنے کے مقصد کے تحت سرگرم عمل ہو گئے تھے۔ بعد میں تو اس تحریک آزادی کی جدوجہد اور سوشلزم کے قیام کی لڑائی میں حصہ لیے۔ انہوں نے سوویت یونین سے دوستی کی اہمیت کو محسوس کر لیا۔ مخدوم ان تمام تحریکوں میں زندگی بھر ... آج جب کہ یہ تحریکیں اپنے شباب پر پہنچ گئی ہیں اور ان کی پہلے سے زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی ... اب خلا پیدا کر دیا جو پر نہیں ہو سکے گا۔ انڈو سوویٹ کلچرل سوسائٹی نے مخدوم کو کھو کر ایک عظیم ... ایک سرپرست مفکر اور رہنما سے محروم ہو گئی ہے۔ انڈو کلچرل سوسائٹی حیدرآباد اور آندھرا پردیش ان ہزاروں سوگواروں میں شریک ہے جو مخدوم کا سوگ منا رہے ہیں۔"

دھرم ونت ہندی ہائر سکنڈری اسکول کا اسٹاف اور طلبا

تعزیتی جلسہ میں منظور قرارداد میں ... دھرم ونت اسکول کے اسٹاف اور طلبا نے مخدوم صاحب کے سانحہ ارتحال پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ اسٹاف اور طلبا کے لیے یہ سانحہ اس لیے زیادہ تکلیف دہ ہے کہ مخدوم صاحب دھرم ونت کے اولڈ اسٹوڈنٹ تھے۔ ان کی موت نے ملک کو ایک ٹریڈ یونین لیڈر، ایک زبردست پارلیمنٹرین ایک مشہور اردو شاعر سے محروم کر دیا ہے۔

اردو سوسائٹی حیدرآباد

اردو سوسائٹی کے ... مسیح الدین عظم نے بیگم مخدوم کے نام اپنے مکتوب میں لکھا ہے "اردو سوسائٹی آپ کے شوہر مخدوم کے اچانک انتقال پر ... کہ ... رنج و غم کا اظہار کرتی ہے اور آپ کے غم میں برابر کی شریک ہے"

آئی جی منٹ اسٹاف ایسوسی ایشن

مخدوم محی الدین کو خراج عقیدت پیش کرتی ہے

نذرانۂ عقیدت

سارتھی اسٹوڈیو ورکرز یونین

انڈو سوئنگ ورکرز یونین

نذرانۂ عقیدت

حیدرآباد کیمیکل اینڈ فارما سیوٹیکل ورکرس یونین

انڈین ہیوم پائپ امپلائز یونین

سٹی سینما امپلائز یونین

نئے سال کا تحفہ سنہ ۱۹۷۰ء کا کیلنڈر

پرکشش تین صفحات پر مشتمل

۲۵ روپے کی ہر خریدی پر دیا جائے گا

رائل وائن اسٹور

قریب آرام ہوٹل پتھر گٹی حیدرآباد ۲ فون ۴۲۶۷۶


J.B. MANGHARAM & CO.
50
years of delicious service to the nation!
J.B.MANGHARAM & CO. look forward with pride on completion of 50 eventful years
from humble beginnings way back in 1918 in pre Independence Sind...
to sharing in the ups and downs of independent India's struggle for progress
and its valiant bid for self sufficiency on all fronts.
J B.MANGHARAM & CO. have today achieved the status of a giant national
enterprise. pledged to produce only the best quality products for the nourishment
of the millions. and proudly exporting 20% of the finest products
exported from this country to earn valuable foreign exchange
J.B.MANGHARAM & CO.
Gwalior & Hyderabad, India


پوناکی
منشی فرمائش بیڑی
اعلیٰ تمباکو اور لذت میں ممتاز
اسموکرس پوسٹ سروس
مبلغ چار روپیہ منی آرڈر سے بھیج کر چار سو بیڑی کا ایک بنڈا طلب کیجیے
اور ایک دفعہ اس کی لذت سے لطف اندوز ہوئیے
ترسیل منی آرڈر کا پتہ
منشی بھائی بیڑی ورکس
۱۰-۳-۶۸/۱ ہمایون نگر۔ حیدرآباد

مخدوم صاحب کی زندگی کے مختلف







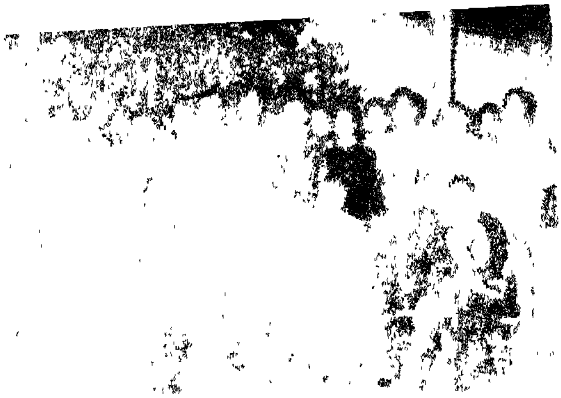










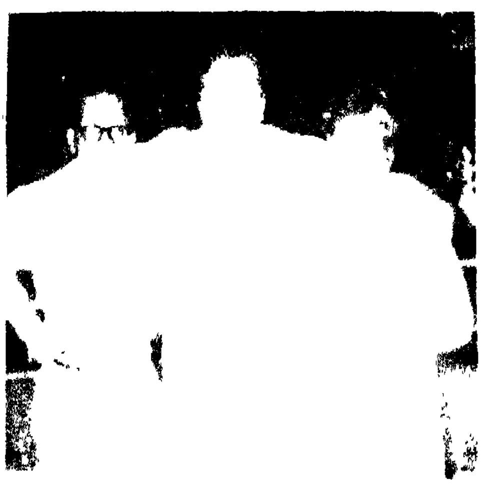








مخدوم صاحب افراد خاندان اور دوستوں کے ساتھ













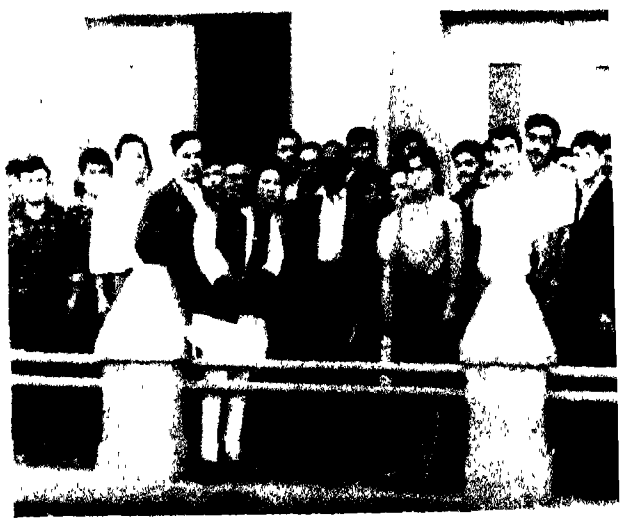










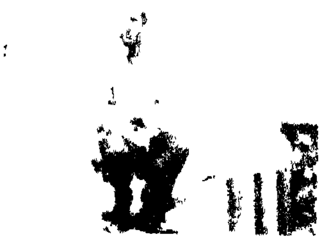






وم صاحب بیرونی ممالک میں











مخدوم صاحب کا آخری سفر





